بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
جولائی 2013
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

MEMBER
APNS
CPNE

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

مستقل سلسلے

جولائی 2013
جلد 27 شمارہ 11
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی ۱۰۲ ایف بی ایریا، سی پی برار سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا جولائی کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

کس نے سوچا تھا، وطن عزیز میں کبھی یہ مناظر بھی دیکھیں گے۔ ہر طرف خون بہہ رہا ہے اور بے حساب بہہ رہا ہے۔ اور اہل اختیار۔ خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا۔

کوئٹہ میں علم آگہی اور شعور حاصل کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلنے والی طالبات کو کس جرم کی سزا دی گئی؟ صنف نازک پر ہاتھ اٹھانا ——— ہمارے مذہب میں اس کی اجازت ہے نہ ہماری روایات کا حصہ۔ پھر یہ کون لوگ ہیں؟ ریاست اور ریاستی ادارے ان پر قابو پانے میں کیوں ناکام ہیں؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ قارئین کو رمضان المبارک کی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ماہ مقدس کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سالگرہ نمبر۔ عید نمبر:

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس شمارے کے ساتھ شعاع نے اپنی عمر کا ایک اور سال مکمل کر لیا ہے۔ اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔

سالگرہ نمبر عید سے پہلے آئے گا۔ اس میں عید کے حوالے سے تحریریں اور سلسلے بھی شامل ہوں گے۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل ہو سکیں۔

سروے:

قارئین کی سہولت کے لیے سالگرہ نمبر میں حسب روایت سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ رمضان میں روزمرہ کے معمولات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عبادت، گھر کے کام اور دیگر ذمہ داریاں۔ رمضان میں یہ سب آپ کیسے نبھاتی ہیں؟ رمضان المبارک کی خصوصی عبادات میں کبھی اپنے قلب میں کوئی تبدیلی محسوس کی؟

2۔ آپ عید کیسے مناتی ہیں؟

3۔ سالگرہ نمبر کے حوالے سے سوال۔ اس سال آپ نے شعاع میں بہت سی تحریریں پڑھی ہیں۔ اگر ان تحریروں کی مصنفین سے آپ کی ملاقات ہو تو آپ ان تحریروں کے بارے میں کیا کہیں گی۔ کوئی شکوہ، شکایت کوئی فرمائش یا تعریف و ستائش؟

نیا ناول:

عالیہ بخاری کا ناول اختتام کو پہنچا۔ طوالت کے باوجود آخری قسط تک قارئین کی دلچسپی برقرار رہی۔ یہ عالیہ بخاری کا کمال ہے۔

اس شمارے سے نبیلہ عزیز کا ناول رقص بسمل شروع کیا جا رہا ہے۔ نبیلہ عزیز نے اب تک جو کچھ لکھا قارئین نے اسے پسند کیا ہے۔ ان کے ہاں شدت بھی ہے اور توازن بھی۔ جو انہیں ایک منفرد مقام دیتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دیگر تحریروں کی طرح ان کی یہ تحریر بھی قارئین پسند کریں گے۔

اس شمارے میں:

- صائمہ بشیر کا مکمل ناول نہ جانوں کا سفر،
- صائمہ اکرم، مہوش افتخار اور آسیہ مقصود کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، مصدف آصف، سلمیٰ علی بٹ اور نظیر فاطمہ کے افسانے،
- عالیہ بخاری، رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- وجیہہ ثانی اور ثنا وجیہہ کا بندھن، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری، رنگ برنگی، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

خلاق دو عالم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
سب کچھ ہے وہی اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

اس کے کرم نے پھول کھلائے ہیں دشت میں
ورنہ تو حسن موج صبا کچھ بھی نہیں ہے

روشن ہیں اس کے نور سے مہر و مہ و نجوم
ورنہ تو ان میں نور و ضیا کچھ بھی نہیں ہے

ہر اک نبی کا معجزہ اس کی ہی دین ہے
چاہے اگر نہ وہ تو عصا کچھ بھی نہیں ہے

جلوہ ہو کہ بینائی نظارہ کہ نظر ہو
تنویر الٰہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

وجدان پہ یہ حمد عطائے الٰہ ہے
ورنہ یہ میری فکر رسا کچھ بھی نہیں ہے

ریحانہ تبسم فاضلی

رسول مقبولؐ
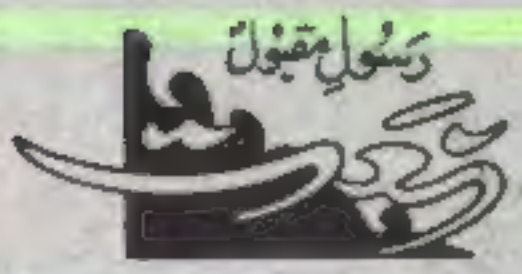
حمد رب کے لیے مصطفیٰ چاہیے
نعت خیر البشرؐ کو خدا چاہیے

لب نہیں آنکھ سے التجا چاہیے
احترام در مصطفیٰ چاہیے

ناز کر اپنی قسمت پہ نوع بشر
مل گئے مصطفیٰ اور کیا چاہیے

سوئے کعبہ چلو، سوئے طیبہ چلو
گر تمہیں خلد کا راستہ چاہیے

اور کوئی نہیں راستہ دوستو!
مصطفیٰ سے ملو گر خدا چاہیے

جسم کیا روح کے زخم بھر جائیں گے
مجھ کو طیبہ کی آب و ہوا چاہیے

سخت اعجاز مدحت کا ہے مرحلہ
کچھ سلیقہ تو کچھ حوصلہ چاہیے

اعجاز رحمانی

ادارہ

سحری کی اذان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم میں سے کسی کو بلال (رضی اللہ عنہ) کی اذان سحری کھانے سے مانع نہ ہو' وہ تو اس لیے اذان دیتا ہے کہ تم میں سے جو سو رہا ہے وہ جاگ جائے' اور جو قیام کر رہا ہے وہ (نماز فجر کی تیاری کی طرف) لوٹ جائے اور فجر یہ نہیں کہ (روشنی) اس طرح (اوپر کو بلند) ہو جائے' بلکہ اس طرح ہے' یعنی آسمان کے افق پر چوڑائی کے رخ پھیل جائے۔

فوائد و مسائل :

1۔ فجر کے وقت دو اذانیں مسنون ہیں۔ ایک اذان صبح صادق سے پہلے دی جائے جسے عرف عام میں سحری کی اذان کہا جاتا ہے اور دوسری اذان صبح صادق ہونے پر نماز فجر کے لیے دی جائے۔
2۔ بہتر ہے کہ دونوں اذانوں کے لیے دو الگ الگ موذن مقرر کیے جائیں تاکہ لوگوں کو آواز سن کر معلوم ہو جائے کہ اب کون سی اذان ہو رہی ہے۔ مسجد نبوی میں دوسری اذان' یعنی نماز فجر کی اذان کے لیے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ مقرر تھے۔
3۔ پہلی اذان کے یہ فوائد ذکر کیے گئے ہیں کہ جو شخص سو رہا ہے' وہ جاگ اٹھے' اگر سحری کھانی ہو تو سحری کھالے ورنہ نماز فجر کی تیاری کرے اور جو شخص تہجد پڑھ رہا ہے' وہ اس سے فارغ ہو کر مذکورہ کاموں کے لیے تیاری کرے اور دیگر لوگ قضائے حاجت وغیرہ سے فارغ ہو کر وضو کر کے بروقت مسجد میں پہنچ جائیں تاکہ نماز باجماعت میں شریک ہو سکیں۔
4۔ عہد رسالت میں دو اذانوں کا یہ سلسلہ مستقل معمول تھا۔ صرف رمضان ہی کے مہینے میں ایسا نہیں ہوتا تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے' اس لیے صرف رمضان میں اس کا اہتمام کرنا صحیح نہیں ہے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کاذب اور صبح صادق کا فرق اشارے سے واضح فرمایا۔ پہلے "اس طرح" کا مطلب یہ ہے کہ روشنی کا رخ اوپر کی طرف زیادہ ہو۔ اسے صبح کاذب کہتے ہیں۔ دوسرے "اس طرح" کا مطلب یہ ہے کہ روشنی اطراف میں پھیلے۔ یہ صبح صادق ہوتی ہے۔
5۔ بات سمجھانے کے لیے اشارہ کرنا درست ہے' تاہم خطبے میں دونوں ہاتھ ہلانا اور نعرے وغیرہ لگوانا مناسب نہیں۔

روزہ کھولنے میں جلدی کرنا

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ عبادت میں شریعت کی مقرر کردہ حد سے آگے بڑھنا دنیا اور آخرت کے نقصان کا باعث ہے۔
2۔ روزہ جلدی کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی ٹکیہ افق کے نیچے پہنچ جانے کے بعد مزید تاخیر نہ کی جائے بلکہ فوراً" روزہ کھول لیا جائے۔

بھلائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔ روزہ جلدی کھولا کرو کیونکہ یہودی دیر کرتے ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ یہودی اپنے شرعی مسائل میں افراط تفریط کا شکار ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے سنت نبوی پر عمل پیرا رہیں۔

روزہ کس چیز سے کھولنا مستحب ہے؟

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب کوئی روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ خشک کھجور سے روزہ کھولے' اگر (کھجور) نہ ملے تو پانی سے روزہ کھول لے' کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ تمر خشک کھجور کو کہتے ہیں۔ جامع الترمذی کی دوسری حدیث میں تمر (خشک کھجور) کے علاوہ رطب (تر کھجور) سے روزہ کھولنا بھی مذکور ہے۔
2۔ کھجور سے روزہ کھولنا اس لیے افضل ہے کہ یہ بابرکت پھل ہے اور پانی کا تعلق طہارت اور پاکیزگی سے ہے۔ روزہ روحانی پاکیزگی کا باعث ہے اور پانی ظاہری پاکیزگی کا۔ اس مناسبت سے پانی سے روزہ کھولنا بھی مستحب ہے۔

روزے کی نیت رات کو کرنا اور روزہ پورا کرنے یا نہ کرنے کا اختیار

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص رات سے روزے کا پختہ ارادہ نہ کرے' اس کا کوئی روزہ نہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ اس مسئلہ کی بابت سنن النسائی میں بھی حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ روایت موقوفاً" صحیح ہے۔
رات سے نیت کرنے کا مطلب شام سے نیت کرنا نہیں' بلکہ مطلب یہ ہے کہ صبح صادق سے پہلے پہلے نیت کر لینی چاہیے' خواہ رات کے کسی حصے میں نیت کی جائے۔ جب بھی ارادہ بن جائے کہ صبح روزہ رکھنا ہے' وہ درست ہے۔
3۔ یہ حکم فرض اور واجب روزے کے لیے ہے۔ نفلی روزے کی نیت دن میں بھی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر نفلی روزہ رکھا ہوا ہو تو دن میں کسی وقت چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی گناہ نہیں۔
3۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قضا نذر اور کفارہ وغیرہ کا روزہ ہے۔

☆ ☆ ☆

لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں کی طاق تاریخوں (یعنی اکیس' تیئس' ستائیس' اور انتیس تاریخوں) میں تلاش کرو۔" (بخاری)
لیلۃ القدر اس خاص رات کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی صفت ہے چونکہ قرآن مجید اس خاص رات میں نازل کیا گیا تھا' اس لیے اس کو قدر کی رات کہا گیا۔

قدر سے کیا مراد ہے؟

قدر کے معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ وہ رات بہت ہی احترام کے قابل اور بڑی عظمت والی ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔ اس کے علاوہ قدر کا لفظ قضا و قدر کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ترجمہ "ملائکہ اور جبرئیل علیہ السلام اس رات میں اپنے رب کے حکم سے ہر طرح کے احکام و فرامین لے کر

نازل ہوتے ہیں۔" چنانچہ اس کے معنی تقدیر بنانے کی رات کے بھی ہوسکتے ہیں۔ بعض مفسرین نے قدر کو ضیق اور تنگی کے معنوں میں لیا ہے اور وہ لیلتہ القدر کا مفہوم قرار دیتے ہیں کہ اس معاملے میں اللہ نے تنگی کی ہے کہ اس کی صحیح تاریخ لوگوں کو بتائی جائے لیکن یہ ایک دور کا مفہوم ہے۔

لیلتہ القدر کے متعلق یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ رمضان کی کون سی رات ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا ہے وہ بس یہ ہے کہ وہ رات رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ اس لیے اسے انہی راتوں میں تلاش کرو۔

لیلتہ القدر کا قطعی طور پر تعین نہ کرنے میں یہ حکمت کار فرما نظر آتی ہے کہ آدمی ہر طاق رات میں اس امید پر اللہ کے حضور میں کھڑا ہو کر عبادت کرے کہ شاید یہی لیلتہ القدر ہو۔ لیلتہ القدر اگر اس نے پالی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز کا وہ طالب تھا وہ اسے مل گئی۔ اب اس کے بعد اس نے جو چند مزید راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں تو وہ اس کی نیکی میں اور اضافے کا باعث بنیں گی۔

لیلتہ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کی ہدایت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "لیلتہ القدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں، یعنی اکیس یا انتیس کو، تیئس کو یا ستائیس کو یا پچیس کو۔" (بخاری)

عشرۂ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام عبادت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ رمضان کے آخری دس دنوں میں (اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے میں) جس قدر سخت محنت کرتے تھے اتنی اور کسی زمانے میں نہیں کرتے تھے۔" (مسلم)

رمضان کے عشرۂ آخر میں حضور کا اہتمام عبادات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ "جب رمضان کی آخری دس تاریخیں آتی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمربستہ ہو جاتے تھے۔ رات رات بھر جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔ (متفق علیہ)

ویسے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالانے میں ہمیشہ انتہائی محنت کرتے تھے لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق رمضان کے آخری دس دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی۔

لیلتہ القدر کی دعا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کا کیا خیال ہے اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون سی رات لیلتہ القدر ہے تو مجھے اس میں کیا کہنا چاہیے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یوں کہو کہ اے میرے اللہ! تو بڑا معاف کرنے والا ہے، تو معاف کرنے کو پسند کرتا ہے، لہٰذا مجھے معاف فرما دے۔" (احمد ابن ماجہ ترمذی)

لیلتہ القدر ہر رمضان میں ہوتی ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیلتہ القدر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ "وہ ہر رمضان میں ہوتی ہے۔" (ابوداؤد)

جس رات میں قرآن نازل کیا گیا تھا اور جس کو قرآن مجید میں لیلتہ القدر کہا گیا ہے چونکہ وہ رمضان کی ایک رات تھی اس لیے لازماً ہر رمضان میں ایک رات لیلتہ القدر ہے۔ لیکن کون سی رات ہے اس کا تعین نہیں ہو سکا۔ بجز اس کے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔

سفر میں روزہ رکھنا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں (کبھی) روزہ رکھا اور (کبھی) چھوڑ دیا۔" (نسائی)

فوائد و مسائل :

1۔ جس سفر میں نماز قصر کرنا جائز ہے اس میں مسافر کے لیے روزہ چھوڑنا بھی جائز ہے، خواہ سفر پیدل ہو یا سواری پر اور سواری خواہ گاڑی ہو یا ہوائی جہاز وغیرہ اور خواہ تھکاوٹ لاحق ہوتی ہو جس میں روزہ مشکل ہو یا تھکاوٹ لاحق نہ ہوتی ہو، خواہ سفر میں بھوک پیاس لگتی ہو یا نہ لگتی ہو کیونکہ شریعت نے سفر میں نماز قصر کرنے اور روزہ چھوڑنے کی مطلق اجازت دی ہے اور اس میں سواری کی نوعیت یا تھکاوٹ اور بھوک پیاس وغیرہ کی کوئی قید نہیں لگائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ (رمضان کے علاوہ) دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر لے۔"

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں کو قبول کیا جائے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب کیا جائے۔

2۔ البتہ اگر روزہ رکھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی روزہ رکھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر تکلیف ہو تو پھر روزہ رکھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

حاملہ اور دودھ پلانے والی کا روزہ چھوڑنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے۔ یہ صحابی قبیلہ بنو عبدالاشہل کی شاخ بنو عبداللہ بن کعب سے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھڑ سوار دستے نے ہمارے قبیلے پر حملہ کیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آجاؤ۔ کھانا کھالو۔"

میں نے کہا۔ "میرا روزہ ہے۔"

فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ! میں تمہیں روزے کی بات بتاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف کر دی ہے اور مسافر، حاملہ اور دودھ پلانے والی کو روزہ یا روزے معاف کر دیے ہیں۔"

اللہ کی قسم! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں لفظ فرمائے یا ان میں سے ایک لفظ فرمایا۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں شریک نہ ہوا۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت حضرت انس بن مالک کعبی رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے جب کہ ان کا قبیلہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔

2۔ مسافر کو آدھی نماز معاف ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جن نمازوں میں چار رکعت فرض ہیں ان میں دو رکعت فرض نماز ادا کی جائے۔ فجر اور مغرب کی نماز سفر میں بھی پوری پڑھی جاتی ہے۔

3۔ روزے دار کو کھانے کی دعوت دی جائے تو اپنے روزے کا اظہار کر سکتا ہے، یہ ریا میں شامل نہیں۔

4۔ مسافر، بچے کو دودھ پلانے والی اور حاملہ کے لیے رعایت ایک ہی سیاق میں بیان ہوئی ہے، مگر تفصیل میں فرق ہے کہ مسافر کو روزہ معاف ہے مگر قضا ادا کرنا واجب ہے اور مرضعہ اور حاملہ کی بابت علما کی چار آرا ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ایک رائے تو یہ ہے کہ ان کے لیے فدیہ ہی کافی ہے بعد میں قضا نہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ان پر قضا ہے نہ فدیہ۔ یہ رائے حافظ ابن حزم کی ہے جو انہوں نے "المحلی" میں بیان کی ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ فدیہ طعام کے علاوہ بعد میں وہ قضا بھی دیں۔

چوتھی رائے یہ ہے کہ وہ مریض کے حکم میں ہیں، وہ روزہ چھوڑ دیں، انہیں فدیہ دینے کی ضرورت نہیں اور بعد میں قضا دیں۔ مولانا محمد علی جانباز نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

رخصت

5۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حاملہ کو جسے اپنی جان کا خطرہ ہو روزہ چھوڑنے کی رخصت دی ہے اور دودھ پلانے والی اس عورت کو بھی (رخصت دی ہے) جسے اپنے بچے کے بارے میں (نقصان پہنچنے کا) خوف ہو۔"

رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"میرے ذمے رمضان کے روزے ہوتے تھے تو میں ان کی قضا نہیں دیتی تھی حتی کہ شعبان آجاتا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ رمضان میں عذر شرعی کی بنا پر جو روزے چھوٹ جائیں، ان کی قضا سال بھر میں کسی وقت بھی دی جاسکتی ہے، ضروری نہیں کہ وہ روزے شوال ہی میں رکھے جائیں۔

2۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا میں اس لیے تاخیر فرماتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقاربت کی خواہش ہو اور وہ روزے کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے محروم رہ جائیں۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا شعبان میں اس لیے روزہ رکھ لیتی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں نفلی روزے کثرت سے رکھتے تھے، چنانچہ تاخیر کی وہ وجہ باقی نہیں رہتی تھی جو دوسرے مہینوں میں ہوتی تھی۔

3۔ عورت کو چاہیے کہ خاوند کو خوش رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے بشرطیکہ شرعی طور پر ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرنا پڑے۔

4۔ حیض روزے کے منافی ہے، اس لیے ان ایام میں روزہ رکھنا منع ہے۔

5۔ اگر روزہ رکھا ہوا ہو اور دن کے وقت حیض شروع ہو جائے تو روزہ ختم ہو جائے گا، وہ روزہ شمار نہیں ہوگا۔

6۔ حیض و نفاس کے عذر کی وجہ سے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح بیماری یا سفر کی وجہ سے چھوٹے ہوئے روزے بعد میں رکھے جاتے ہیں۔

رمضان کا روزہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے بغیر عذر کے رمضان کا ایک بھی روزہ چھوڑ دیا، اس کے بدلے زمانے بھر کے روزے بھی کافی نہیں ہوں گے۔" (ابو داؤد)

جس نے بھول کر روزہ کھول دیا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھالیا اُسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے، اُسے اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔" (بخاری)

بندھن

وجیہہ ثانی ہمراہ ثنا وجیہہ

شاہین رشید

اس مرتبہ "بندھن" میں آپ کی ملاقات وجیہہ ثانی اور مسز ثنا وجیہہ سے کروا رہے ہیں۔ 2010ء میں ان کی شادی ہوئی اور ماشاء اللہ ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کا نام سید عربان عبداللہ اور چھوٹے کا سید عیان عبداللہ ہے۔

س ۔ وجیہہ ثانی! کیا حال ہیں... اور خیر سے کتنے سال ہوگئے آپ کی شادی کو؟

ج ۔ جی! اللہ کا شکر ہے۔ 15 جولائی 2010ء کو میری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ سے میرے دو بیٹے ہیں۔

س ۔ ثنا سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی، کیا ریلیشن تھا آپ دونوں کا؟

ج ۔ کوئی رشتے داری نہیں ہے ہماری۔ دبئی میں ہمارا جو دفتر تھا، اسی بلڈنگ میں یہ بھی کام کرتی تھیں تو اوپر نیچے آتے جاتے ہماری ملاقات ہوتی تھی اور ہیلو ہائے ہو جاتی تھی۔ چونکہ پاکستان سے دور تھا تو بات چیت کرنا اچھا لگتا تھا۔ یہ گرافک ڈیزائننگ میں تھیں۔ ایک دن ان کی فیملی ان کو لینے آئی ہوئی تھی تو ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے گھر آنے کی دعوت دی اور بس پھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔

س ۔ آپ نے کچھ رسپانس دیا ہوگا تو بات آگے بڑھی ہوگی۔ مطلب ثنا کی کیا بات اچھی لگی؟

ج ۔ بس ابتداء ہی اچھی لگیں۔ کیا بات اچھی لگی یہ نوٹ نہیں کیا، پھر ان کی فیملی کا اخلاق اچھا لگا اور ان کو بھی میں تھوڑا سا اچھا لگا ہوں گا۔ تب ہی تو انہوں نے مجھے اپنی فیملی سے ملوایا۔ میں نے سوچا کہ کہیں نہ کہیں تو شادی ہونی ہے تو پھر یہاں ہی کیوں نہیں....

س ۔ تو پھر کتنا عرصہ لگا اس سارے پروسیجر میں؟

ج ۔ ملاقات کے چھ ماہ بعد ہمارا نکاح ہو گیا تھا اور کچھ عرصے کے بعد رخصتی ہو گئی۔ کوئی لمبی چوڑی ملاقاتیں نہیں ہوئیں۔ کیونکہ جب رشتے کے تمام معاملات طے پا گئے تو میں پاکستان آگیا تھا اور ان کی فیملی تو رہتی ہی دبئی میں تھی۔ تو پھر ان کا پاکستان آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اگست میں ہمارا نکاح ہوا اور پندرہ جولائی 2010ء کو رخصتی عمل میں آئی۔

س ۔ تقریباً سال بھر نکاح رہا۔ اس دوران آپ نے ثنا کو کیسا پایا؟ کیونکہ اصل عادت و اطوار تو شادی کے بعد ہی سامنے آتی ہیں۔

ج ۔ مجھے تو شادی سے پہلے ہی ۔۔ اچھی لگی تھیں، اس لیے تو بات آگے بڑھائی تھی اور شادی کے بعد تو بہت ہی اچھی لگیں... اور مزاج کا بہت سی ملاقاتوں کے بعد پتا نہیں چلتا۔ بلکہ آپ کسی کے ساتھ آدھا ایک گھنٹہ بیٹھیں۔ کھانا وغیرہ کھائیں اور ادھر ادھر کی باتیں کریں تو آپ کو خود ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سامنے والا کیسا ہے، اس کا موڈ کیسا ہے، طبیعت کا اتار چڑھاؤ پتا چل جاتا ہے... لیکن یہ بات بھی ہے کہ شادی کے بعد انسان ایک دوسرے سے مکمل آگاہی حاصل کر لیتا ہے تو کچھ ان کی اچھائیاں، برائیاں کھل کر سامنے آئیں تو کچھ میری اچھائیاں، برائیاں کھل کر ان کے سامنے آئی ہوں گی۔

س ۔ پھر بھی کیا کیا کھل کر سامنے آیا؟

ج ۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے جلدی شادی کرلی ہے۔ مجھے انہیں تھوڑا ٹائم دینا چاہیے تھا۔ تاکہ یہ تھوڑی اور میچور ہو جاتیں۔ یہ مجھ سے تھوڑی چھوٹی بھی ہیں اور تھوڑی اور چھوٹی بن بھی جاتی ہیں۔ چونکہ اپنے گھر میں سب سے چھوٹی ہیں۔ اس لیے لاڈ پیار بھی زیادہ ملا۔ شادی کے بعد مجھے ان کی دو باتیں پتا چلیں۔ ایک تو یہ کہ کھانا بہت لذیذ بناتی ہیں۔ جبکہ میں یہ سمجھتا تھا۔ یہ پڑھائی میں مصروف رہتی ہوں گی تو کھانا وغیرہ پکانا تو ان کی اماں نے سکھایا ہی نہیں ہوگا۔ اور دوسری بات یہ کہ یہ سلائی کڑھائی' سینا پرونا بہت ہی اچھی طرح جانتی ہیں۔ اس کی تو مجھے بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ آج کل کی لڑکیاں ان چیزوں میں دلچسپی نہیں لیتیں۔ حتیٰ کہ انہیں تو اپنے کپڑے سینے سے بھی دلچسپی نہیں ہوتی۔ تو ان دو باتوں نے مجھے حیران کردیا۔

س ۔ صحیح کہہ رہے ہیں' آج کل کے دور میں "آل ان ون" بیوی ملنا بہت مشکل ہے اور آپ کو مل گئی"۔

ج ۔ اور بھی سنیے۔ یہ تو اچھائیاں ہیں۔ مگر برائی یہ ہے کہ غصے کی بہت تیز ہیں۔ بات ماننے میں بہت تاخیر کرتی ہیں۔ کچھ برائیاں وغیرہ اور بھی ہیں' آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ (قہقہہ)

س ۔ سسرال کو کیسا پایا؟

ج ۔ اصل میں میرا سسرال دبئی میں ہے اور اس لحاظ سے میں بہت لکی ہوں کہ سسرال دور ہے۔ کیونکہ بیگم کی ہر ہفتے یا مہینے میں میکے جانے اور رہنے کی فرمائشوں سے بچا رہتا ہوں اور لکی اس لیے ہوں کہ سسرال والوں سے خاطریں نہیں کروا سکتا اور کبھی بیگم سے لڑائی ہو تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ جاؤ! کچھ دن میکے میں آرام کر آؤ۔

س ۔ شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہیں' محبتیں بھی ہوتی ہیں' بچے بھی ہوتے ہیں اور پھر گھر ٹوٹ بھی جاتے ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟ قصور لڑکے لڑکی کا ہوتا ہے یا خاندان والوں کا؟

ج ۔ قصور خاندان کا بھی ہوتا ہے اور لڑکے لڑکی کا بھی ہوتا ہے' لیکن بنیادی طور پر دونوں کو لچک کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ تب ہی کوئی ریلیشن شپ چلتی ہے۔ اگر میں یہ توقع رکھوں کہ بیوی لچک رکھے اپنے رویے میں اور میں خود ٹس سے مس نہیں ہوں گا تو بات بگڑے گی۔ سنورے گی نہیں اور یہی حال بیوی کی طرف سے ہے۔ کوئی تعلق' کوئی رشتہ اسی وقت جڑا رہتا ہے اور مضبوط ہوتا ہے' جب دونوں طرف سے لچک ہو' ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت ہو اور کمپرومائز ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب کمپرومائز ہی کرنا ہوتا ہے تو پھر محبت کی شادی کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ محبت کی شادی کی ہے تو ایک دوسرے کی غلطیوں کو نظر انداز کردیں۔ اچھی اور بری باتوں کی اصلاح کرنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔

س ۔ آپ کے خیال میں بہتر کیا ہوتا ہے۔ لو یا ارینج؟ اور گھر آکر کیا دل چاہتا ہے کہ بیگم بہت ساری باتیں کرے یا جی! میں تھکا ہوں۔ بات نہیں کرنا؟

ج ۔ دونوں کے اپنے اپنے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی ہیں۔ ارینج میں اجنبیت بہت ہوتی ہے اور لو میں بے تکلفی۔ اب تو خیر سے دو بیٹے ہوگئے ہیں تو گھر آکر ان سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیگم نے اب سارا دن کی اسٹوری سنانی ہے۔ تو اس کے لیے بھی تیار ہوتا ہوں۔ پھر دل چاہتا ہے کہ تھوڑا آرام کروں۔

س ۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی کیا۔۔۔؟ اور شادی کتنی ضروری ہے؟

ج ۔ جی! شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ تمام رسمیں بھی ہوئیں اور بہت لوگ آئے۔ وہ بھی آئے جن کو بلایا نہیں تھا۔ لیکن یہ ان کی محبت تھی کہ وہ تشریف لائے۔ جولائی کا مہینہ تھا اور گرمی بہت زیادہ تھی' پھر ہجوم۔۔۔ اور شادی بہت ضروری ہے۔ بے شک ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے' تھوڑی سی مشکلات بھی درپیش آجاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی میں کہوں گا کہ یہ ضروری ہے۔

س ۔ آپ کی بیگم بھی پڑھی لکھی ہیں۔ آپ چاہیں گے کہ یہ آپ کی فیلڈ میں آئیں یا کوئی جاب کریں؟

ج ۔ شادی سے پہلے یہ جاب کرتی تھیں اور شادی کے بعد ذمہ داریاں پڑنے پر جاب چھوڑی ہے۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر ماں بھی کام کرے گی تو بچوں کی تربیت کون کرے گا۔ ہاں! بچے جب اسکول جانے لگیں گے تو پھر شاید یہ جاب بھی کریں اور مزید تعلیم بھی حاصل کریں۔

س ۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ روایتی بیوی کی طرح آپ کے سارے کام کریں؟

ج ۔ یہ سارے کام اپنے شوق سے کرتی ہیں۔ میں انہیں کسی کام کے لیے فورس نہیں کرتا۔ کھانا جیسا کہ میں نے بتایا بہت اچھا پکاتی ہیں' مگر پھر بھی ہم ہفتے میں دو دن باہر کھانا کھاتے ہیں اور ویسے بھی میڈ ہے کھانا پکانے کے لیے جس کو ہماری بیگم گائیڈ کرتی رہتی ہیں۔

س ۔ آپ ایک دوسرے کے موبائل چیک کرتے ہیں؟ اور ملکی مسائل ایک دوسرے سے ڈسکس کرتے ہیں؟

ج ۔ میں تو نہیں کرتا۔ بیگم میرا موبائل چیک کرتی ہیں۔ شاید میاں کو اپنے رعب میں اور محتاط رکھنے کے لیے بھی بیگمات موبائل چیک کرتی ہیں۔ جہاں تک ملکی مسائل کی بات ہے تو چونکہ یہ زیادہ تر دبئی میں رہی ہیں۔ لہٰذا انہیں یہاں کے حالات کا اتنا پتا نہیں ہے۔ تو میں انہیں بتاتا رہتا ہوں اور یہ بھی پوچھتی رہتی ہیں کہ ایسا کیوں ہے یا اب کیا ہوگا۔

س ۔ اور آپ سے یہ آخری سوال کہ کیا "ثنا" آپ کی پہلی اور آخری محبت ہے؟

ج ۔ بے ساختہ ہنستے ہوئے۔۔۔ یہ میری پہلی اور

آخری شادی تو ہو سکتی ہے' مگر محبت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور مجھے محبت تو نہیں ہوئی تھی ہاں! اچھی لگی تھیں تو میں نے شادی کرلی۔ محبت تو شادی کے بعد ہوئی۔ ثنا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ "آپ کو محبت ہوگئی ہے مجھ سے؟" تو میں نے کہا۔ "نہیں" تو انہوں نے کہا کہ "پھر مجھ سے شادی کیوں کر رہے ہیں؟" تو میں نے کہا "تم مجھے اچھی لگی ہو' ڈیسنٹ سی ہو اور پڑھی لکھی بھی' اس لیے شادی کر رہا ہوں۔"

ثنا وجیہہ ثانی

ثنا سے بات کرنے سے پہلے آپ کو وجیہہ ثانی کے بارے میں بتائیں کہ وجیہہ 19 ستمبر 1979ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اسٹار ورگو ہے۔ قد پانچ فٹ ساڑھے آٹھ انچ ہے۔ چار بہن بھائیوں میں ان کا نمبر دوسرا ہے اور یہ انجینئر ہیں۔

جبکہ مسز ثناء ثانی 7 اکتوبر 1987ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں' مادری زبان اردو ہے' تین بہنیں ہیں' بھائی کوئی نہیں' ثنا کا نمبر آخری ہے۔ اے لیول کے بعد گرافک ڈیزائننگ میں ڈگری حاصل کی۔

س ۔ ہاں جی! کیا حال ہیں۔۔۔ اور یہ بتاؤ کہ جب تم نے پہلی مرتبہ ان کو دیکھا تو اچھا لگا کہ ارے! یہ تو وہی ہیں جو نیوز پڑھتے ہیں؟

ج ۔ نہیں! اتنا کچھ خاص احساس نہیں ہوا۔ کیونکہ وجیہہ اسکرین سے بہت مختلف نظر آتے ہیں' ٹی وی میں کافی بڑے بڑے لگتے ہیں۔ جبکہ عام لائف میں یہ بہت چھوٹے لگتے ہیں۔۔۔ ان کا آفس سیکنڈ فلور پر تھا اور میرا فرسٹ فلور پہ تھا۔ چونکہ مجھے نیوز وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو مجھے نہیں پتا تھا کہ وجیہہ ثانی ہیں۔۔۔ پھر جب انہوں نے بتایا تو میں نے اپنے گھر والوں کو بتایا۔ تب پھر ہم نے نیوز میں ان کو دیکھنا شروع کیا تو بہت اچھا محسوس ہونے لگا کہ یہ نیوز کاسٹر ہیں جن سے روزانہ میری "ہیلو ہائے" ہوتی ہے۔

س ۔ اور جب منگنی ہوئی تو اپنی دوستوں کو بتایا کہ فلاں مشہور نیوز کاسٹر سے میری منگنی ہوئی ہے؟

ج ۔ ہوا یہ کہ جب ان کی طرف سے پروپوزل آیا تو ہم نے منگنی نہیں کی۔ بلکہ نکاح ہی کرلیا تھا۔ جب میں نے اپنی دوستوں کو بتایا کہ میرا نکاح ہوگیا تو میری دوستیں بہت حیران ہوئیں کہ اتنا اچانک۔۔۔ میں نے تو خود بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک مشہور بندے سے میری شادی ہو جائے گی۔ مگر اب میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔

س ۔ شاپنگ کے دوران سب کی توجہ تو وجیہہ پہ ہوتی ہوگی۔ کیسا محسوس کرتی ہیں آپ؟

ج ۔ کبھی کبھی تو بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن اکثر برا لگتا ہے۔ کیونکہ پرائیویسی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے پھر ہم ایسی جگہ ڈھونڈتے ہیں' جہاں کوئی ہمیں جانتا نہ ہو۔

س ۔ خبریں پڑھنے کا اسٹائل کیسا لگتا ہے؟

ج ۔ بہت ہی اچھا لگتا ہے ان کا اسٹائل۔۔۔ اکثر میں ان کو بتاتی ہوں کہ "میاں! آپ بہت اچھے لگ رہے تھے۔" اب تو مجھے ان کے ڈیوٹی ٹائمز بھی یاد ہو گئے ہیں۔ میں بہت باقاعدگی سے ان کی خبریں دیکھتی ہوں اور بتاتی رہتی ہوں کہ آپ نے فلاں خبر بہت اچھے اسٹائل میں پڑھی۔ فلاں ہیڈ لائن بہت اچھی پڑھی۔ ایس ایم ایس کر کے بھی بتاتی رہتی ہوں کہ ٹائی ٹیڑھی ہو رہی ہے ٹھیک کرلیں۔ میک اپ تھوڑا "اوور" ہو رہا ہے اس کو کم کرلیں۔

س ۔ وجیہہ تمہیں کس خاتون نیوز کاسٹر کے ساتھ اچھے لگتے ہیں خبریں پڑھتے ہوئے؟

ج ۔ عائشہ بخش کے ساتھ یہ مجھے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ دونوں میں ایج کا اتنا فرق نہیں ہے تو دونوں اچھے لگتے ہیں۔

س ۔ تم ان کی اتنی تعریفیں کرتی ہو ۔ یہ بھی تمہاری تعریف کرتے ہیں؟

ج ۔ ہاں جی! بہت مرتبہ' بلکہ اکثر کرتے رہتے ہیں اور

میری عادت بھی ہے کہ میں بار بار اپنے میاں سے پوچھتی رہتی ہوں کہ میاں! یہ چوڑیاں کیسی لگ رہی ہیں؟ یہ کپڑے کیسے لگ رہے ہیں؟ بس خود ان سے پوچھتی رہتی ہوں، کبھی رات میں اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہوں اور ہیر اسٹائل بنانے شروع کر دیتی ہوں، میاں مووی دیکھ رہے ہوتے ہیں تو پھر پوچھتی ہوں کہ یہ ہیر اسٹائل کیسا لگ رہا ہے تو یہ بہت تعریف کرتے ہیں۔

س ۔ تم تو "میاں" کہہ کر بلاتی ہو اور وجیہہ کیا کہہ کر بلاتے ہیں؟ اور یہ بتاؤ کہ جوائنٹ فیملی میں رہتی ہو؟

ج ۔ جی! یہ مجھے بیگم کہہ کر بلاتے ہیں اور جناب! میں جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں۔ ر جب میرا دیور مجھے بھابھی کہہ کر بلاتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ چونکہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے تو مجھے دیور بھابھی کا رشتہ بہت ہی پسند ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ وہ جو کام مجھے کہے میں فوراً کر دوں کیونکہ وہ مجھے بہت ہی پیارا لگتا ہے اور وہ ہے بھی مجھ سے چھوٹا۔ میری دو نندیں ہیں اور ایک دیور ہے۔ میری ایک نند امریکا میں اور ایک یہاں پاکستان میں ہیں اور دونوں بہت اچھی ہیں۔

س ۔ گھر اور سسرال کی آزادی میں فرق ہوتا ہے۔ تو آپ نے بھی یہ فرق محسوس کیا؟

ج ۔ نہیں! مجھے یہ فرق محسوس نہیں ہوا۔ کیونکہ ہمارے ساس سسر بہت اچھے ہیں۔ کوئی پابندی نہیں ہے ہم پر۔ ہم کبھی بھی سوئیں، جب بھی اٹھیں، ہمیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ دبئی میں تو ایسا ماحول ہے کہ کہیں بھی چلے جائیں کوئی خطرے کی بات نہیں ہوتی، لیکن یہاں پاکستان اور خصوصاً" کراچی کا ماحول تو ایسا ہے ہی نہیں کہ کہیں بے خوف خطر اکیلے نکل جائیں۔

س ۔ کتنا عرصہ رہیں دبئی میں؟ اور اب کراچی کیسا لگتا ہے؟

ج ۔ میں جب چھ سال کی تھی تو دبئی گئی۔ عموماً" ہم دو تین سال کے بعد کراچی آتے تھے اور صرف ایک مہینے کے لیے آتے تھے تو اچھا لگتا تھا آنا۔ پھر جب سال بہ سال آنے لگے تو پانچ یا دس دن کے لیے آتے تھے تو بھی اچھا لگتا تھا۔ مگر اب تو مستقل آنا ہو گیا ہے اور میری فیملی تو ابھی بھی دبئی میں ہے۔ جب کوئی تقریب ہو شادی کی یا شادی کی سالگرہ ہو یا برتھ ڈے ہو یا اور کہیں جانے کا موڈ ہو تو عموماً" حالات خراب ہوتے ہیں تو ہم لوگ کہیں جا نہیں سکتے۔ پھر موڈ تھوڑا خراب ہو جاتا ہے کہ کب حالات ٹھیک ہوں گے اور کب ہم لوگ آزادی سے ادھر ادھر جا سکیں گے۔

س ۔ نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے؟

ج ۔ میری امی کہا کرتی تھیں کہ تم چھوٹی ہو تو تمہاری شادی ظاہر ہے سب سے آخر میں ہوگی، لیکن اتفاق دیکھیں کہ میری شادی پہلے ہوئی۔ جبکہ میں بھی یہی کہتی تھی کہ بڑی بہنوں کی شادی کے بھی کافی عرصے کے بعد میں شادی کروں گی تو گھر میں بچوں کی طرح رہنا، ادھر جانا ادھر جانا... بہت آزادی سے سب کچھ کرتی تھی۔ امی ابو کا خاص طور پر ابو کا بہت خیال رکھتی تھی۔ تو مجھے نکاح کے وقت بہت فیل ہو رہا تھا اور رخصتی کے وقت تو اور بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ میری شادی کے بعد مجھ سے بڑی بہن کی شادی ہوئی اور اب سب سے بڑی بہن کی شادی ہوگی۔ تو الٹا سسٹم چلا ہمارے یہاں...

س ۔ تو الٹا سسٹم کیوں چلایا گیا؟ کیونکہ عموماً" جب چھوٹی کی شادی ہو جائے تو پھر بڑی بہنوں کے رشتوں میں پرابلمز ہوتی ہیں۔

ج ۔ ابو امی کا ارادہ یہ تھا کہ منگنی کر دیں گے اور شادی اس وقت کریں گے۔ جب بڑی بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔ مگر جب پاکستان آئے منگنی کے لیے تو وجیہہ کے گھر والوں نے کہا کہ نکاح ہی کر دیتے ہیں اور ایک دو سال میں رخصتی کر لیں گے۔ امی ابو مان گئے۔ خیر! اب تو اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ سیٹ ہو گیا ہے۔ کیونکہ دونوں بہنیں بھی شادی کے بعد یہیں آ گئی ہیں۔

س ۔ عروسی جوڑا کیسا تھا۔ رسمیں انجوائے کی تھیں اور عروسی جوڑا مہنگا ہونا چاہیے؟

ج ۔ عروسی جوڑا بہت ہی مہنگا اور خوب صورت تھا۔ "رضوان معظم" سے لیا تھا۔ رسمیں بھی سب ہوئیں اور بہت انجوائے کیا۔ ولیمہ کا جوڑا بھی بہت حسین تھا ۔ عروسی جوڑا مہنگا ہونا تو نہیں چاہیے۔ لیکن چونکہ ان کے گھر میں بھی پہلی شادی تھی اور ہمارے گھر میں بھی پہلی شادی تھی تو دونوں سائیڈ سے خواہش تھی کہ شادی بڑے اچھے انداز میں ہونی چاہیے۔

س ۔ مزاج کے کیسے ہیں وجیہہ؟ پہلی لڑائی کس بات پر ہوئی اور لڑائیاں ہوتی ہیں؟

ج ۔ بہت اچھے ہیں، بہت فرینڈلی ہیں۔ جب شادی ہوئی تو کبھی کبھی فیل ہوتا تھا کہ عمروں کا بہت فرق ہے۔ (حالانکہ صرف آٹھ سال کا فرق ہے اور اتنا تو ہوتا ہی ہے۔) لیکن شادی کے بعد یہ احساس ختم ہو گیا کہ یہ نیچر کے بہت اچھے ہیں۔ اگر یہ اور بھی بڑے ہوتے تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ ہماری شادی کے بعد صرف ایک بار لڑائی ہوئی اور اس کو ہم نے سیلبریٹ کیا کہ چلو! لڑائی ہوئی تو سہی۔ نئی نئی شادی ہو تو لڑائی میں اور روٹھنے منانے میں مزہ آتا ہے۔ مگر ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہوا۔

س ۔ منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا اور خرچ کا بند ھا دیتے ہیں؟

ج ۔ منہ دکھائی میں انہوں نے گولڈ کا سیٹ دیا تھا اور ملائیشیا میں ہنی مون منایا تھا۔ خاصا لمبا ہنی مون تھا۔ انہوں نے میری پاکٹ منی بھی باندھی ہوئی ہے اور ویسے بھی دیتے رہتے ہیں۔ میں زیادہ تر پیسے جمع کر لیتی ہوں اور جب ان کی سالگرہ ہو یا ویلنٹائن ڈے وغیرہ ہو تو گفٹ خرید کر دیتی ہوں۔ جب ہم دونوں شاپنگ پہ جاتے ہیں تو یہ کبھی مجھے خرچ نہیں کرنے دیتے۔ سارا خرچ خود کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میں ہوں نا۔"

س ۔ اگر دوسری شادی کی اجازت مانگیں تو دے دو گی؟ اور کھانے پینے کے معاملے میں عجلت پسند ہیں کیا؟

ج ۔ دے دوں گی۔ مگر یہ کہہ کر مجھے چھوڑ دیں۔ اگر مجھ سے تنگ آ جائیں تو ضرور کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ دوسری کیا، تیسری بھی کر لیں۔ ہاں! کھانے کے معاملے میں تھوڑے سے عجلت پسند ہیں۔ جب یہ آفس سے نکل رہے ہوتے ہیں تو مجھے فون کر دیتے ہیں کہ میں آ رہا ہوں تم کھانا لگا دو۔ تو پھر میں سب کچھ ریڈی کر دیتی ہوں تاکہ ان کو انتظار نہ کرنا پڑے۔

س ۔ اور کوئی بات جو تم اپنے میاں سے کہنا چاہتی ہو، اس انٹرویو کے ذریعے سے؟

ج ۔ میرے میاں بہت ہی اچھے ہیں۔ یہ میں کہنا چاہتی ہوں۔ تین سالوں میں ان کے پیار میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ ہاں! ایک تبدیلی ان میں ضرور آئی ہے اور وہ یہ کہ یہ پہلے روٹی نہیں کھاتے تھے، بلکہ چاول زیادہ کھاتے تھے۔ لیکن میرے ساتھ رہ رہ کر اب ان کو بھی روٹی کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔ پہلے یہ چائنیز نہیں کھاتے تھے۔ اب چائنیز بھی کھانے لگے ہیں۔ جبکہ میں پہلے پاکستانی کھانے نہیں کھاتی تھی۔ مگر اب کھانے لگی ہوں... تو ہم دونوں نے کھانے پینے کی عادتیں ایک جیسی بنالی ہیں۔ تاکہ کھانے کی ٹیبل پہ یہ نہ ہو کہ یہ کچھ کھا رہے ہیں اور میں کچھ اور کھا رہی ہوں۔

س ۔ رومانٹک مزاج ہیں؟

ج ۔ بہت زیادہ ہیں۔ گانے وغیرہ بھی گاتے رہتے ہیں۔ بلکہ میں نے ان کی مووی بنائی ہوئی ہے۔ جس میں انہوں نے گانے گائے ہیں۔ ان کی آواز بہت اچھی ہے اور میرے اصرار پر ہی گاتے ہیں۔

اور اب ایک آخری سوال کہ پہلی مرتبہ کمرے میں آکر وجیہہ نے کیا جملہ بولا تھا؟

ج ۔ ایسا کچھ یاد تو نہیں، مگر یہ جملہ یاد ہے کہ "آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔" ویسے میں انہیں سادگی میں اچھی لگتی ہوں۔ گو کہ انہوں نے میری تعریف کی تھی۔ مگر یہ بھی کہا تھا کہ بغیر میک اپ کے آپ زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ تو میں اب صرف لپ اسٹک لگا لیتی ہوں۔

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس خوب صورت جوڑے سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ثروت گیلانی

آج کل تھیٹر کا ڈراما "دھانی" سب پر اپنی دھاک بٹھائے ہوئے ہے۔ بڑے عرصے کے بعد لوگوں کو ایک اچھا تھیٹر پلے دیکھنے کو مل رہا ہے۔ اس لیے آج کل ہر طرف اس کا چرچا ہے۔ اس کے دو کردار رقیہ اور رشیدہ بے حد پسند کیے جا رہے ہیں۔ رشیدہ کا رول ثروت گیلانی نے کیا ہے۔ اس حوالے سے ان سے دستک کے لیے بات کی۔

"کیا حال ہیں ثروت؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔۔۔ آپ سنائیں۔"

"دھانی تو ماشاء اللہ بہت کامیاب جا رہا ہے۔ تمہارا پہلا تجربہ ہے؟"

"جی! مجھے تو امید بھی نہیں تھی کہ لوگ میرے کام کو اتنا پسند کریں گے اور پہلا پہلا تجربہ تھا جو کہ بہت اچھا رہا۔"

"روز ایک جیسی پرفارمنس' ایک جیسے ڈائیلاگز' بوریت نہیں ہوتی کیا؟"

"نہیں جی۔۔۔ بوریت کیسی۔۔۔ مجھے تو اتنا مزا آ رہا ہے کہ کیا بتاؤں۔ پرفارمنس اور ڈائیلاگز تو بے شک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مگر آڈینس تو ایک جیسی نہیں ہوتی۔ روز نئے لوگ دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔"

"تھیٹر میں تو فوری رسپانس ملتا ہے۔ تنقید ہوتی ہے یا تعریف؟"

"بہت تعریف ہوتی ہے۔ اتنا حوصلہ بڑھتا ہے اور اتنا اچھا لگتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ میں تو سوچتی ہوں کہ میں نے تھیٹر پہلے کیوں نہیں کیا؟"

"خیال کیسے آیا تھیٹر میں کام کرنے کا؟"

"مجھے کہاں خیال آیا۔۔۔ بس سوچتی رہتی تھی کہ کبھی نہ کبھی تھیٹر میں کام ضرور کروں گی۔ مگر کوئی آفر ہوتی تو کرتی۔ "دھانی" کی طرف بھی میرا بالکل بھی خیال نہیں تھا۔ مگر جب عمرانہ مقصود اور ڈائریکٹر عمر سلطان نے آفر کی تو میں نے انکار نہیں کیا۔"

"خوشی ہوئی تھی؟"

"ایسی ویسی۔۔۔ اتنے بڑے نام۔ بھلا انکار کیسے کر سکتی تھی۔ بلکہ مجھے تو بے انتہا خوشی ہوئی کہ تھیٹر میں کام کرنے کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔"

"اب مزید آفرز آئیں تو؟"

"ویسے ہی اچھے تھیٹرز کی آفر آئی تو انکار نہیں کروں گی۔ سچ! مجھے تو چسکا لگ گیا ہے۔"

"دھانی میں تو تمہارا کردار ایک شوخ و چنچل لڑکی کا ہے۔ مشکل ہوئی؟ کیونکہ تمہیں ہمیشہ سنجیدہ رول میں دیکھا ہے۔"

"آپ نے مجھے سنجیدہ رول میں دیکھا ہے۔ مگر اصل زندگی میں میں سنجیدہ نہیں ہوں۔ بالکل ایسی ہی ہوں جیسی "دھانی" میں نظر آ رہی ہوں۔ چھیڑ چھاڑ کرنے والی ہنسنے ہنسانے والی۔ میں تو بچپن سے ہی ایسی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ تو پھر سنجیدہ رول کیوں کرتی ہو؟ کبھی مزاحیہ رول میں دیکھا نہیں تمہیں۔"

"کسی نے مزاحیہ رول دیا ہی نہیں۔ سب نے سنجیدہ رول ہی دیے۔ کہتے ہیں تم روتی بہت اچھا ہو اور تمہارے رونے سے دوسرے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ چلو! ٹھیک ہے۔ ایسی بات ہے تو ایسے ہی۔"

"دل مضطر" میں تو تمہارا نگیٹو رول ہے۔۔۔ لوگ برا بھلا تو کہہ ہی رہے ہوں گے۔"

"جی بالکل۔۔۔ لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم "صلہ" کا گھر کیوں برباد کر رہی ہو۔۔۔ نگیٹو رول کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔"

"مزا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمدردیاں تو بہت لے لیں۔ محبتیں بھی بہت لے لیں۔ سوچا کہ نگیٹو رول کر کے بھی دیکھوں کہ کیا رسپانس ملتا ہے۔ تو رسپانس ایسا ملا کہ سب نے تنقید بھی تعریفی انداز میں کی کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ کی وجہ سے اس کا بچہ بھی مر گیا وغیرہ وغیرہ اور یہی تعریف ہمارا سرمایہ حیات ہے۔"

"سال میں صرف ایک یا دو سیریل کرتی ہو۔۔۔ کیوں؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ہر وقت اسکرین پہ رہنا پسند نہیں ہے۔ کبھی کبھار آتی ہوں تو لوگ شوق سے دیکھتے ہیں میرا ڈراما کہ یقیناً" اچھا ہو گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بہت سوچ سمجھ کر کردار لیتی ہوں اور پھر اس کردار کو بہت اچھی طرح پڑھ کر اپنے اوپر طاری کر کے پرفارم کرتی ہوں۔"

"مگر اتنا کم نظر آنے سے لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ شاید آفرز نہیں آتی ہوں گی؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو لوگ کم نظر آتے ہیں۔ ان کے ڈرامے لوگ زیادہ شوق سے اور توجہ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ روز نظر آنے والوں کے لیے تو لوگوں کو جج کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا رول کیا ہے اور میرا تو ایک نظریہ اور بھی ہے کہ سیریل میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے بھی فنکار کو ایک یا دو ڈراموں میں ہی نظر آنا چاہیے ورنہ کردار کا تاثر ختم ہو جاتا ہے۔"

"ہوں۔۔۔ یہ تو ہے اس فیلڈ میں شوقیہ آئیں' مجبوراً" یا اتفاقیہ؟"

"نہ شوقیہ نہ ہی مجبوراً"۔ بس اتفاقیہ آ گئی۔ "انڈس ویلی" میں پڑھتی تھی۔ کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے بندے نے دیکھا ہو گا۔ اسی کمپنی یعنی ایجنسی سے صابن کے کمرشل کی آفر آ گئی۔ بس میں نے ہامی بھر لی اور اس کے بعد ڈراموں سے آفرز آنے لگیں اور سلسلہ بنتا چلا گیا۔"

"سب تو بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ بیٹی ٹی وی اسکرین پہ آ رہی ہے؟"

"جی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ بالکل بھی خوش نہیں ہوئے گھر والے۔ خاص طور پر میری نانی۔ انہوں نے کئی دن تک مجھ سے بات ہی نہیں کی اور گھر والے بھی خوب ناراض کہ یہ کیا حرکت ہے۔ اجازت بھی نہیں لی اور اتنا اہم فیصلہ خود کر لیا۔ بات تو ٹھیک تھی ان کی۔۔۔ لیکن خیر! آہستہ آہستہ سب کچھ سیٹ ہو گیا۔ وہ ہی نانی جو کل تک مجھے ڈانٹتی تھیں اب سب سے زیادہ شوق سے میرے ڈرامے دیکھتی ہیں۔"

"اور تمہاری پینٹنگز کہاں تک پہنچیں؟"

"ڈھیروں ڈھیر ہو گئی ہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد نمائش کروں گی۔ آپ کو بھی آنا ہو گا۔ میں پینٹنگز

میں "نیچر" پر زیادہ کام کرتی ہوں۔ اللہ نے یہ دنیا بہت خوب صورت بنائی ہے۔"

"اور کچھ کہنا چاہو گی؟"

"میں سب ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز سے یہ کہنا چاہوں گی کہ جناب! میں ہر طرح کے کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں مجھ پر کسی ایک کردار یا موڈ کی چھاپ نہ لگائیں۔"

عالمگیر

"کیسے ہیں عالمگیر صاحب؟"

"بس! آپ سب کی دعائیں ہیں۔"

"ڈائیلاسز چل رہا ہے آپ کا۔ طبیعت کیسی رہتی ہے آپ کی؟"

"جی الحمد للہ! ڈائیلاسز چل رہا ہے اور طبیعت بھی بس! اللہ کا شکر ہے کہ ٹھیک چل رہی ہے ڈائیلاسز کے بعد کافی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ مگر پھر جلدی ایکٹو بھی ہو جاتا ہوں۔"

"یہ دنیا کا دستور ہے کہ وہ دوسروں کی خوشی میں اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا ان کی پریشانی میں۔ اس بیماری نے آپ کو کیا سبق دیا؟"

"میں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہوں کہ جب میں صحت مند تھا۔ تب بھی لوگ مجھ سے پیار کرتے تھے اور اب جبکہ میں بیمار ہوں۔ تب بھی لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ ٹی وی کے مختلف چینلز میں میری آمد اور میرے انٹرویوز اس بات کے گواہ ہیں کہ لوگ مجھ سے آج بھی اسی طرح پیار کرتے ہیں جس طرح پہلے کیا کرتے تھے۔"

"امریکا کتنے سال رہے۔۔۔ اور پاکستان آکر کیسا پایا سب کو؟"

"بیس سال امریکا رہا اور اب پاکستان آیا ہوں۔ سچ پوچھیں تو جو محبتیں چھوڑ کر گیا تھا اس کو پہلے سے ڈبل پایا۔ عموماً" دور جانے والوں کو لوگ بھول جاتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے بالکل بھی نہیں بھولے اور یہاں آنے پر مجھے بہت زیادہ محبتیں دیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اب واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ اپنوں کے درمیان رہ کر بہت سکون ملتا ہے۔"

"دکھ اور بیماری انسان کو چڑچڑا بنا دیتی ہے۔ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ دکھ اور پریشانی انسان میں صبر و شکر اور برداشت کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ مجھ میں بھی غصہ کم اور برداشت زیادہ ہو گئی ہے۔ کسی بات پر غصہ آتا ہے تو تحمل سے کام لیتا ہوں۔"

"1972ء سے آپ گلوکاری کر رہے ہیں۔۔۔ بڑا سستا زمانہ تھا۔ کچھ یاد ہے کہ اس فیلڈ میں پہلا چیک کتنے کا ملا تھا اور کہاں خرچ کیے تھے؟"

"جی ہاں! بہت سستا زمانہ تھا۔ پیسے کی قدر اور اہمیت تھی۔ خرچ کرنے کے باوجود کچھ نہ کچھ بچ جاتا تھا۔ میں نے ایک پروگرام کیا تھا "سات سُروں کی دنیا" جس کا پہلا چیک ایک سو چالیس روپے کا ملا تھا۔ چونکہ ویکلی پروگرام تھا پھر ہر ویک ایک سو چالیس روپے ملنے لگے تھے۔ شاید آپ کو یہ سن کر بہت حیرانی ہو گی کہ یہ آمدنی ماشاء اللہ میرے لیے بہت تھی اور میں نے طارق روڈ جیسے علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔ جس کا کرایہ سو روپے ماہانہ تھا۔ اس سے پہلے میرے پاس گھر نہیں تھا اور میں ادھر اُدھر یا پھر دوستوں کے پاس رات گزارا کرتا تھا۔"

"پروگرام "سات سُروں کی دنیا" میں کس نے متعارف کرایا؟"

"اس زمانے میں خوش بخت عالیہ ایک اسٹیج شو کیا کرتی تھیں۔ جس میں کسی نہ کسی ٹیلنٹ کو ضرور مدعو کرتی تھیں۔ اس پروگرام میں میں نے بھی شرکت کی اس شو کے میوزک ڈائریکٹر سہیل رعنا ہوا کرتے تھے پھر انہوں نے مجھے اپنے پروگرام "سات سُروں کی دنیا" میں بُک کر لیا اور بس پھر یوں ترقی کا سفر شروع ہو گیا۔"

"تو پھر کس پر یقین رکھتے ہیں قسمت پر یا انسان کی محنت پر؟"

"قسمت پر۔۔۔ کیونکہ قسمت ہی انسان کو سب کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ انسان کی اپنی تو کوئی اوقات نہیں ہے۔ انسان تو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور کبھی بھی اپنی ناکامی سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ کیونکہ ناکامی بھی انسان کو بہت کچھ سکھاتی ہے۔"

"کچھ یاد ہے کہ آپ کے آڈیو ویڈیو البمز کی تعداد کتنی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تقریباً" چالیس یا بیالیس اور سب نے ہی مقبولیت کے ریکارڈ توڑے ہیں۔"

شہروز سبزواری

"کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"شادی مبارک ہو۔۔۔ بلایا بھی نہیں؟"

"خیر مبارک۔۔۔ اور آپ نے کون سا آجانا تھا۔ بس اسی لیے نہیں بلایا۔"

"ہوں۔۔۔ کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ اچھا! یہ بتاؤ
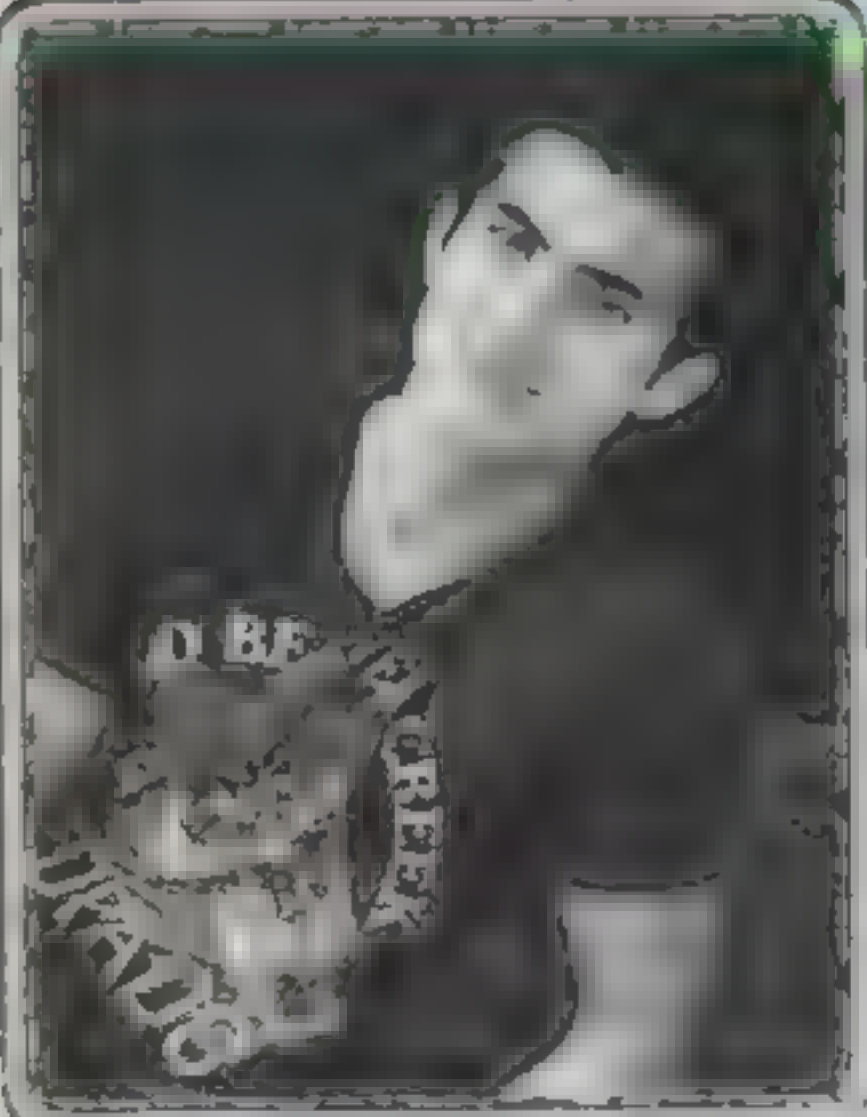
انٹرویو کب دے رہے ہو؟"

"دے تو رہا ہوں۔"

"مجھے تمہارا اور سائرہ کا انٹرویو چاہیے۔ شعاع کے سلسلے "بندھن" کے لیے۔"

"ضرور ضرور۔۔۔ بس تھوڑا مصروف ہوں آج کل۔ ایک دو پروجیکٹس سے فارغ ہو جاؤں تو پھر ان شاء اللہ۔"

"سیریل "منچلی" میں اچھا پرفارم کر رہے ہو۔۔۔ رسپانس کیسا مل رہا ہے؟"

"شکریہ۔۔۔ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا۔ سب ہی پسند کر رہے ہیں۔"

"گڈ! آج کل صبح کب ہوتی ہے تمہاری؟"

"میری صبح میرے کام کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اگر کام ہو شوٹ پہ جانا ہو تو پھر بہت صبح اٹھ جاتا ہوں اور اگر ایسا کوئی ضروری کام نہ ہو تو پھر ذرا آرام سے ہی اٹھتا ہوں۔"

"صبح کا وقت کیسا لگتا ہے؟"

"بہت اچھا۔۔۔ خاص طور پر فجر کا وقت اور اس کے

بعد پھوٹنے والی ہلکی ہلکی روشنی بہت دلکش منظر پیش کرتی ہے۔"

"ایک دفعہ تم نے بتایا تھا کہ تمہارا غصہ کچھ بڑھ گیا ہے۔اب کیا صورت حال ہے؟"

"پتا نہیں کیوں غصہ جلدی آجاتا ہے۔ بس میں اپنی اس عادت سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا اور کس کس عادت سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو؟"

(ہنستے ہوئے) "بس ایک تو غصے سے اور ایک دوسرے یہ کہ مجھے ناخن چبانے کی عادت ہے۔ جو بہت ہی بری ہے۔ بس اللہ اس سے نجات دلا دے۔"

"چلو اب بیگم آگئی ہے۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا سنا ہے کہ ...... گرمیاں تم باہر گزارتے ہو؟"

"جی! کوشش تو ہوتی ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے ایک تو یہاں کی گرمی اس پر لوڈشیڈنگ تو طبیعت بہت بے زار ہوتی ہے۔ جون جولائی اگر لندن میں گزریں تو واہ! کیا کہنے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"ویسے مری میں بھی جون جولائی گزارا جا سکتا ہے۔"

"بالکل جی... نتھیا گلی بہت پسند ہے مجھے اور وہاں بھی میں اکثر جاتا رہتا ہوں۔"

"موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

"اگر کوئی مجھ سے جھوٹ بولے یا بلاوجہ کا عقل مند بننے کی کوشش کرے تو نہ صرف موڈ خراب ہوتا ہے۔ بلکہ پھر وہی غصہ بھی آتا ہے۔ جس کا ذکر میں کئی بار آپ سے کر چکا ہوں۔"

"اولاد اپنے ماں باپ کو کیا لوٹا سکتی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ..... ماں باپ جتنا اولاد کے لیے کرتے ہیں۔ ہم ایک لمحے کا احسان بھی نہیں اتار سکتے۔ ہاں! یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے لیے جو سوچا ہے اس پر ہم پورے اتریں۔ میرے پاپا نے میرے فیوچر کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ اللہ کرے کہ میں ان کی امیدوں پر پورا اتروں اور دوسری بات یہ کہ والدین نے ہمیشہ یہ نصیحت کی کہ بیٹا! کبھی چوری نہیں کرنا۔ نہ ہی ناجائز طریقے سے کمانے کی کوشش کرنا اور نہ ہی کسی کا حق مارنا۔ ان کی یہ نصیحتیں تو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

☆

شادی مبارک ہو

شمس منیر ہمراہ ہانیہ شمس

بشریٰ گوندل

شادی، ویاہ، میرج، ویڈنگ، بس لفظوں کا ہی ہیر پھیر ہے۔ مگر اس ہیر پھیر میں کیسا خوب صورت، خوشگوار، دل کو گدگداتا ہوا سا احساس ہوتا ہے۔ دو افراد نکاح کے بندھن میں بندھ کر راحت و خوشی محسوس کر رہے ہوتے ہیں تو وہیں شادی میں مدعو دیگر عزیز و اقارب بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر دلی مسرت محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ ہیں نا واقعی... اور کتنے سیانے تھے گئے زمانوں کے لوگ، جو شادی کو "میل" کہتے تھے۔

ہم نے بھی شمس منیر کی شادی میں شرکت کر کے کچھ ایسی ہی خوشیاں اپنے دل سے پھوٹتی محسوس کیں۔ قیوم نے فون پر مجھے بتایا کہ شمس بھائی کا نکاح ہو گیا ہے اور دو فروری کو رخصتی ہے اور میں مبارک باد دینا بھی بھول گئی، مجھے بچی کچی کا شاک لگا تھا اس خبر سے کہ کہاں تو آپ لوگ کنوؤں میں بانس ڈال ڈال کر لڑکی ڈھونڈنے میں مصروف تھے اور اب اتنی جلدی کہ بات

نکاح تک پہنچ گئی اور کانوں کان خبر نہیں ہوئی ہ گویا مطلوبہ لڑکی مل گئی ہے۔ چلو شکر ہے۔

مہندی اور بارات کی تقریبات میں نہ جانے کون سی مصلحت کے تحت مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ ان کے اور ہمارے بیچ تو بڑے قریبی تعلقات تھے اور پھر زمینی راستے ملتے تھے۔ بہر حال ہوگی کوئی وجہ۔ بہ زبان خلق مہندی اور بارات کے فنکشن بڑے شان دار تھے۔ مگر ہم ان رونقوں کو اپنے بیان میں کیسے لائیں؟

مجھے ولیمہ کا کارڈ موصول ہوا اور کارڈ دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی ادبی شخصیت کی شادی کا کارڈ ہے۔ "آیئے گا ضرور" سادہ اور پروقار سے کارڈ کے ماتھے پر لکھا یہ اصرار تمام اقارب کو لازمی شمولیت کی تاکید کر تا تھا۔"

بھائی نے گاڑی جب ہال کے گیٹ پر روکی تو پتا چلا کہ اہل خانہ ابھی تک گھر پر ہی تشریف فرما ہیں۔ حالانکہ آدھے سے زیادہ دن گزر چکا تھا اور پھر سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن۔ چنانچہ ہم لوگ بھی واپس اپنے گھر جانے کے بجائے ان کے گھر ہی چلے گئے۔ ویسے بھی ان کے اور ہمارے گھر تک فاصلہ صرف دس منٹ کی پیدل ڈرائیو ہے۔

ہم برآمدے میں آنٹی سے ملے ان کو بیٹے کی شادی کی مبارک باد دی۔ پھر فاطمہ سے اور اس کی کیوٹ سی بچی سے ملے اور لگے ہاتھوں فاطمہ سے ہمیں اپنی شادی پر نہ بلانے کا شکوہ بھی کر ڈالا۔ وہ روایتی سی لولی لنگڑی معذرت کرنے لگی۔

ہم لوگ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ تیار ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ یوں ہی بے فکری سے ٹہل رہے تھے۔ اس بات سے بے نیاز کہ شادی ہال پہنچنا ہے اور اہل خانہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہیں کہ ہال میں مہمان آنا شروع ہو چکے ہیں۔ مگر ان کی پروا ہی نہیں۔ کتنے بے حس ہیں ہم پاکستانی لوگ۔

مجھے سخت برا لگ رہا تھا۔ اوپر سے سعد حسن مجھے تنگ کر رہا تھا۔ "ماما! اپنے گھر چلیں۔"

"اف یار! ابھی تو آئے ہیں نہ کچھ کھایا' نہ پیا اور بھوکے پیاسے گھر سے چلے جائیں۔"

مجھے تھوڑی تھوڑی بھوک لگ رہی تھی۔ (ویسے بھی پاکستان میں اب تو یہ رسم چل نکلی ہے کہ شادی میں جو شرکت کرنی ہے تو ایک آدھ دن پہلے کھانا چھوڑ دینا' تاکہ معدے میں اچھی خاصی گنجائش نکل آئے۔)

کچھ دیر کے بعد شمس بھائی مجھ سے ملنے چلے آئے' بڑے خوش باش لگ رہے تھے۔

"آپ نے میرا بیڈ روم دیکھا ہے۔ چلیے میں آپ کو دکھاؤں۔" میں اگرچہ پھرتے پھراتے دیکھ چکی تھی۔ مگر پھر ان کے ہمراہ چل دی۔

"سنو... قیوم! تم نے باجی بشریٰ کو فلاں چیز دکھائی' فلاں دکھائی۔" شمس بھائی کی ایکسائٹمنٹ ہر ہر انداز سے عیاں تھی۔ ظاہر ہے ایک دن کے دولہا کو اتنا ایکسائٹڈ تو ہونا چاہیے۔

"یہ دیکھیں... یہاں کھڑے ہو کر بیڈ روم کی کھڑکی سے لان کا منظر دیکھیں۔"

سلائیڈنگ ونڈو کھولتے ہوئے وہ بولے۔ میں نے باہر جھانکا۔ پھاگن کی نرم سنہری دھوپ کوٹھی کی دیواروں کے اطراف میں پھیلے کینو کے باغات پر اپنا عکس چھوڑ رہی تھی۔ دیواروں کے پار سبز زمینوں میں پھولی سرسوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے زمین نے پیلے پھولوں کی کوئی خوشنما چادر اوڑھ رکھی ہو۔ واہ... میں کچھ دیر وہاں کھڑی تکتی رہی۔ پچھلے صحن کے سامنے پھیلا باغیچہ اور باغیچہ کے عین وسط میں بہتی شفاف پانی کی ندی۔

"واقعی آپ کے بیڈ روم کی عقبی کھڑکی سے جھانکو تو نظریں بڑا دلکش سا منظر چھو آتی ہیں' ہیں نا ہنہہ...؟"

"آپ رضوانہ باجی سے ملی ہیں؟" شمس بھائی اس بار کسی کو مجھ سے ملوانے کے لیے لائے تھے اور رسمی تعارف کے بعد میں نے بہ غور جب ان کو دیکھا تو میرا دل نہ چاہا کہ میں بھی اس نستعلیق بیگ اور خوب صورت سی رضوانہ کو شمس کی طرح باجی کہوں۔۔۔ وہ پنجابی کی معروف شاعرہ ہیں۔ ان سے مل کر واقعی بہت اچھا لگا۔

ہال میں پہنچے تو مسرت اور سیما باجی کو ریسپشن پہ کھڑے پایا جو ہال میں داخل ہوتے جوش و خروش سے ویلکم کہہ رہی تھیں۔ میں ان کے پاس کھڑی ہو گئی۔ مسرت بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ بلند و بانگ قہقہے لگاتی ہوئی کچھ لوگوں کو یہ کتنا پیارا ہنر آتا ہے۔ اپنے دکھوں اور محرومیوں کو ہنسی کی چادر میں چھپا لینا۔ سیما باجی شمس کی شادی کے حوالے سے بار بار خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ اگر نہ بھی بتاتیں تو بھی ان کی خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ انتہائی مخلص جو ہر کسی کی خوشی میں پورے دل سے خوش ہوتے ہیں۔

اور مجھے پتا ہے کیا مشورہ دے رہی تھیں۔

"جب شادی کا احوال لکھو نا تو سارے دوست احباب ایک جگہ پہ اکٹھے ہو کر تصویریں اور مووی دیکھ کر باہمی مشورے سے لکھیں گے۔" میں ہنس دی۔

"جی۔۔۔ اور وہ اجتماعی تحریر شائع کون کرے گا؟"

"یہ کوثر۔۔۔ سیما باجی کی بہن ہیں نا؟" ریڈ سوٹ میں ملبوس کوثر کی ہنسی بڑی پیاری ہے۔ میں نے ان کو اور انہوں نے مجھے کچھ دیر کے بعد پہچانا۔ بہرحال یہ جان پہچان بھی خوشگوار رہی۔

"آ گئے ہو؟" مسرت ہنستے مسکراتے گلے ملتے ہوئے ہر آنے والے کو کہتی' بلکہ پوچھتی تھی۔ میں نے احساس دلایا۔

"تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ آ چکے ہیں' پھر یہ کیا سوال ہوا بھلا؟"

"چلو کوئی گل نہیں۔" اس نے اپنا پسندیدہ جملہ بولا۔ شاید یہ اس کا تکیہ کلام تھا۔

"تمہیں نہیں پتا بشریٰ کہ ہم بڑے دل والے لوگ ہیں اور حسن سلوک ہمارے اندر سے ایسے ابلتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے۔"

"جیسے پیارے پاکستان کی گلیوں میں گٹر ابلتے ہیں۔" میں نے فوراً" اس کو مثال پیش کی۔

"شرم کرو' کوئی اچھی' صاف ستھری مثال نہیں دے سکتی تھیں تم۔" اس نے مجھے شرمندہ کیا۔

"چلو اس طرح کہہ لو کہ جیسے ہماری حکومت کے دل میں عوام کے لیے جذبات ابلتے ہیں۔" میں نے صاف ستھری بلکہ نئی نکور مثال پیش کی' جسے اس نے مخصوص ہنسی میں اڑا دیا۔

"چلو کوئی گل نہیں۔"

قیوم اور شازیہ دونوں پارلر سے تیار ہو کر آئیں۔ دونوں اچھی لگ رہی تھیں۔ قیوم کے بارے میں پتا ہے' میری امی نے کیا کہا کہ قیوم تو بالکل پٹھان لگ رہی تھی۔

اف۔۔۔ ایک تو ہماری ماؤں کا انگریزوں اور افغانیوں کو دیا جانے والا خوب صورتی کا سارا کریڈٹ۔۔۔ بہرحال قیوم واقعی پیاری لگ رہی تھی۔ طاہرہ باجی بھی خوب صورت لگ رہی تھیں۔

یہ ہاؤس فل گیدرنگ تھی۔ ہال خواتین اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں نے ایک دفعہ یوں ہی ہنسی ہنسی میں کہا تھا کہ۔

"جس طرح پاکستان میں شادیوں پر فائرنگ' آتش بازی کی پابندی لگائی گئی ہے۔ اسی طرح شادیوں میں بچوں کی شمولیت پر بھی پابندی لگ جائے تو کتنا سکون ہو۔"

میری اس مزاحیہ پیش کردہ تجویز پر نونہالوں کی ماؤں نے خاصا برا منایا تھا۔ بہرحال۔

بقول سیما باجی یہ اس شہر کی واحد شادی ہے جس میں ہر کیٹیگری کے لوگ شامل ہیں۔ مطلب ہر طبقہ مدعو تھا' واقعی۔ امیزنگ۔

شکر ہے ہمارے کوٹ مومن میں بھی اتنے اعلا

معیار کا یہ ہال بن گیا ہے بہت سی خواتین کو شکر ادا کرتے پایا۔ حالانکہ گاؤں کے صحن تو اس ہال سے بھی زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ مگر وہی بات کہ سہولت، سکون، صاف ستھرا ماحول اور سب سے بڑی بلکہ اندر کی بات کہ کام کاج اور بھاگ دوڑ کی چھٹی، ہے نا اندر کی بات؟

مس کوثر مجھے پہچان کر مجھ سے ملیں اور مجھے وقت کچھ سال پیچھے لے گیا۔ وہ ہماری اردو کی ٹیچر تھیں۔ وہ بالکل ویسی ہی تھیں وہی مزاج کی نرمیاں، دھیرے سے ہنس کے بات کرنے کا دلکش انداز، وہی چاندی کے تھال میں گرتے ایک ایک موتی جیسی آواز۔ واقعی وقت کچھ لوگوں کے قریب سے بہت نرمی اور آہستگی سے گزرتا ہے۔ کچھ سدا بہار لوگوں پر اپنا اثر ذرا بھی نہیں چھوڑتا۔ مجھے پتا ہی نہ تھا کہ وہ شاعرہ ہیں۔ وہ بھی نعت گو شاعرہ، واہ کیا سعادت اور صلاحیت کا خزانہ ہے اور پھر ناموری کی آرزو نہ چاہ۔

سمیرا اور سائرہ میرے لیے اجنبی تھیں۔ لیکن وہ مجھے پہچان کر ملیں۔

والہانہ محبت کے ساتھ۔ ہم کبھی کبھار لکھنے والوں کو جب لوگ پہچان کر اور باقاعدہ تحریروں کا حوالہ دے کر ملتے ہیں تو حیرت آمیز خوشی ہوتی ہے۔

پھر میں نے دیکھا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خراماں خراماں، اسٹیج کی طرف بڑھتے ہنیہ اور شمس بھائی جن کی آنکھیں سچی خوشی سے روشن تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر خوب صورت لگ رہے تھے۔

"پرفیکٹ، ریفائنڈ اور بیوٹی فل کپل۔"

میں نے بے ساختہ ساتھ کھڑی روبینہ سے کہا تو ان کے منہ سے بھی اتنی ہی بے ساختگی سے ماشاء اللہ نکلا۔

ہنیہ کو اسٹیج پر چھوڑ کر شمس سیدھے ہماری طرف چلے آئے۔

"کپل کیسا لگا آپ کو۔" انہوں نے پوچھا تو میں ہنس دی۔ اب میں کیا بتاتی کہ تبصرہ تو میں کر چکی ہوں

جبکہ میرے ساتھ کھڑی کوثر فوراً بولی۔

"بڑا خوب صورت، ہائے بالکل فلمی کپل لگ رہا تھا۔"

اور میری بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ تو بعد میں سیما باجی نے بتایا کہ کوثر کو عادت ہے چٹکلے چھوڑنے کی، خود سیریس رہتی ہے، لیکن اگلا بندہ ہنس ہنس کے تباہ ہو جاتا ہے۔

تب ہی آخری ٹیبل پر سیما باجی سے گپ شپ کرتے عارف بھائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے زیادہ میرے بیٹے سے مل کر خوش تھے۔

"ہاں جی۔ ہمارا شہزدہ کتنے سال کا ہو گیا ہے اور ہمارے اسکول میں کب داخل کراؤ گی؟"

میں نے کہا۔ "ابھی کہاں، ابھی تو میں اس کے ساتھ جی بھر کے کھیلی بھی نہیں، اگلے سال ان شاء اللہ تین سال کا ہو جائے تب۔"

"چلو ذرا دلہن سے مل آئیں۔" میں کوثر کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

میرے تعارف کرانے پر ہنیہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ کا تعارف تو پہلے ہی میرے پاس پہنچ چکا ہے۔"

"چلو جی۔۔۔ گزشتہ شب تو تعارف میں ہی کٹ گئی ہوگی۔"

"ہنیہ۔۔۔ سنو۔۔۔ کیا ملا محبت میں؟" میری شرارت پر وہ کھل کے ہنسی۔

"محبت۔" اس نے گول مول سے جواب پر ٹالا۔

"وہ تو سب کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ؟" میں کہاں ٹلنے والی تھی۔

"ساری زرعی زمینیں۔" یہ یقیناً کوثر کی ہی آواز تھی اور میں ہنسی روکتے ہوئے اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔ اس دعا کے ساتھ کہ رب العزت اس خوش باش جوڑے کو ہنستا بستا رکھے (آمین)

نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل

خلیل جبران کہتا ہے۔

"تم غلام ہو اس شخص کے سامنے جس سے تم محبت کرتے ہو' اس لیے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔"

ماورا مرتضیٰ نے مضبوط اور نپے تلے سے لہجے میں کہتے ہوئے کالی گہری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی فارہ رحیم کو دیکھا تھا اور ذرا توقف سے دوبارہ گویا ہوئی۔ "اور بقول آفاق یزدانی' وہ تم سے محبت کرتا ہے اور اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو وہ تمہارا غلام کیوں نہیں ہے؟"

اس کے سوال میں نہ طنز تھا' نہ تمسخر' لیکن نہ جانے کیا تھا کہ فارہ رحیم کے دل پہ لگا تھا اور درد بھی ہوا تھا۔ جس کے آثار ماورا مرتضیٰ نے اس کے چہرے پہ دیکھے تھے۔ کہتے ہیں کہ انسان کے جسم میں درد ہو تو تکلیف کے آثار چہرے پہ نظر آجاتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کے دل کو درد پہنچے اور اس کے آثار چہرے پہ دکھائی نہ دیں؟

"ماورا۔ میں کب اسے اپنا غلام بنانا چاہتی ہوں؟" فارہ کے لہجے میں اضطراب تھا اور انداز میں بے بسی کا رنگ۔

"لیکن محبت کی رُو سے تو آفاق یزدانی کو تمہارا غلام ہی ہونا چاہیے۔" اس نے اپنی بات پہ زور دیا۔

"لیکن یار! غلام تو دور کی بات، وہ تو آقا بننے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔" فارہ کے بے بس سے جواب پہ اسے جھٹکا لگا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس نے ضبط کرتے ہوئے رخ موڑ لیا کہ مبادا اس کے منہ سے کوئی سخت سست نہ نکل جائے جس پہ فارہ کو مزید تکلیف ہو اسی لیے وہ جان بوجھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

یونیورسٹی کے سبز گھاس اور رنگین پودوں سے سجے وسیع گراؤنڈ میں لڑکے اور لڑکیاں ٹولیوں ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس وقت زیادہ گروپ لڑکیوں کے ہی دکھائی دے رہے تھے اور ایسے گروپس میں ہر لڑکی کے پاس دوسری لڑکیوں کو سنانے کے لیے کوئی نہ کوئی قصہ ضرور ہوتا تھا۔

یا اپنا... یا کسی اپنے کا۔ اور اس قصے کو سننے والیاں یا تو بور ہو جاتی تھیں... یا پہروں لطف اندوز ہوتی رہتی تھیں، لیکن افسوس ماورا مرتضیٰ ان سب لڑکیوں سے بہت مختلف لڑکی تھی، جو فارہ رحیم کا قصہ سن کر نہ تو بور ہوتی تھی اور نہ ہی لطف اندوز ہوتی تھی، بلکہ اسے غصہ آنے لگتا تھا۔ کبھی فارہ رحیم پہ، کبھی اپنے آپ پہ۔ اس وقت بھی اسے نہ جانے کس بات پہ غصہ تھا، جسے وہ ضبط کرنے کی کوششوں میں تھی اور بالآخر جب کچھ نہ بن پڑا تو اپنی کتابیں سمیٹ کر بیگ اٹھایا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماورا پلیز! کہاں جارہی ہو؟" فارہ تیزی سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئی۔

"لائبریری۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"لیکن ماورا... تم میری بات سنے بغیر..." فارہ نے کچھ کہنا چاہا، لیکن ماورا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دیکھو فارہ! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کبھی بھی اپنا ٹائم ویسٹ نہیں کرتی، لیکن پچھلے بیس منٹ سے تمہارے ساتھ بیٹھی خوامخواہ اپنا ٹائم ویسٹ کیے جارہی ہوں اس کام سے بہتر ہے کہ میں لائبریری جاکر تھوڑی دیر اسٹڈی کرلوں۔"

ماورا مرتضیٰ کی شخصیت کی طرح اس کا ایک ایک لفظ بھی نپا تلا سا تھا۔ فارہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہوگئی تھی۔ وہ مزید سلگ اٹھی۔

"کیا اب مجھے اپنی چپ کا دورانیہ جانچنے کے لیے روکا ہے؟" وہ چبا کر بولی۔

"پلیز ماورا... غصہ مت کرو، میری فیلنگز، میری پرابلم سمجھنے کی کوشش کرو، پلیز۔" فارہ نے کافی لجاجت سے کہا۔

"میں تمہاری ساری پرابلم سمجھ چکی ہوں۔" اس کا وہی دوٹوک انداز تھا۔

"کیا مطلب؟ کیسے؟"

"مطلب کہ تم میں اتنی جرات نہیں کہ تم آفاق یزدانی کے سامنے اپنی ذات کو منوا سکو۔ اپنی محبت اس کے ذہن پر طاری کرسکو۔ بلکہ تم نے خود اس کی ذات کے غرور کو سلامی پیش کرنا خود پہ فرض کرلیا ہے اور اس کی محبت کو اپنے ہی سر پہ سوار کر رکھا ہے۔ بس صرف اس سرشاری میں کہ آج سے دو سال قبل اس نے انگیجمنٹ کے روز تمہارے لیفٹ ہینڈ کی رنگ فنگر میں ڈائمنڈ کی رنگ پہناتے ہوئے تمہیں "آئی لو یو" کہا تھا اور تم دو سال سے اس "آئی لو یو" کو کسی ورد کی طرح حفظ کرتی پھر رہی ہو... اس بات سے بے خبر کہ وہ اپنے کہے ان معمولی الفاظ کو نہ جانے کب کا بھول بھی چکا ہے۔ بلکہ اسے تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ اس نے تمہیں آئی لو یو کہا بھی تھا یا نہیں؟ میری مانو تو اسے فون کرو اور کہو کہ تمہارا پہلے والا "آئی لو یو" پرانا ہوچکا ہے... دو سال پرانا... موسموں کے سرد گرم کی وجہ سے اس کا رنگ خراب ہوگیا ہے۔ چمک دمک ماند پڑ گئی ہے۔ پھیکا لگنے لگا ہے۔ اس لیے مجھے نیا "آئی لو یو" چاہیے... پھر دیکھنا وہ کیا کہتا ہے؟ نیا آئی لو یو دے گا... یا پہلے والا واپس لینے پر غور کرے گا۔"

ماورا مرتضیٰ کے الفاظ تھے یا تیز دھار خنجر، فارہ بلبلا کے رہ گئی۔

"ماورا...!"

"ہونہہ! تو اور کیا کہوں؟ ایک طرف تم کہتی ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ دوسری طرف کہتی ہو کہ وہ تم سے بات بھی نہیں کرتا۔ اب میں اس بات سے کیا مطلب اخذ کروں؟" یہی نا کہ اس کی محبت ختم ہوگئی ہے؟ آخر کسی چیز کے ختم ہونے کے لیے دو سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔"

اس نے فارہ کے دل پہ چھری چلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بولتی تھی تو کھرا کھرا۔

"بجائے اس کے کہ تم اس کے دل کی ملکہ بن کے رہو، الٹا تم اسے اپنا آقا بنانے پہ تلی ہوئی ہو۔ ہونہہ... بے وقوف لڑکی۔" اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"تو اور کیا کروں؟" فارہ بے چاری بے بس تھی ماورا کی باتیں سچ تھیں، لیکن دل اس معاملے میں بے اختیار تھا۔

"اسے آقا بنانے کا خیال دل سے نکال دو۔ دیکھ لینا! تم خود بخود اس کے دل کی ملکہ بن جاؤ گی۔ تمہارے پاس اللہ کی عطا کردہ سب سے بڑی طاقت تمہاری نسوانیت ہے۔ اپنی اسی طاقت کو آزماؤ گی تو کامیاب ٹھہرو گی۔ بس! اپنی نسوانیت کا غرور قائم رکھنا۔ ورنہ پچھتاؤ گی اور آفاق یزدانی کبھی تمہیں حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم جس چیز کی سمت جتنا لپکتے ہیں، وہ چیز ہم سے اتنا ہی پیچھے سرکتی ہے۔ بالکل ایسے، جیسے تم آفاق یزدانی کی سمت لپک رہی ہو اور وہ پیچھے ہی پیچھے سرک رہا ہے، دن بہ دن لمحہ بہ لمحہ۔"

وہ ماورا کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا وہ کر پائے گی؟ وہ کیسے اپنے دل کو باز رکھ سکتی ہے؟ آخر کیسے؟

اور ماورا مرتضیٰ اتنی عمیق نظر رکھتی تھی کہ اکثر اس کے سوال بن کہے ہی جان لیتی تھی۔ فارہ اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔

"بتاؤں گی تمہیں، یہ سب بھی بتاؤں گی، ابھی اندر چلو، لیکچر اسٹارٹ ہونے والا ہے۔"

اس نے سرہلا کر کہتے ہوئے کلاس روم کی طرف اشارہ کیا فارہ نے قدرے پرسکون ہوتے ہوئے اس کے ساتھ کلاس روم کی سمت قدم بڑھا دیے۔ ان دونوں کی دوستی بے حد گہری اور مثالی تھی۔ لیکن دونوں کے مزاج کا تضاد بھی مثالی تھا۔

☼ ☼ ☼

وین سے اترتے ہی تیز چلچلاتی ہوئی دھوپ سوئیوں کی طرح جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور انہی سوئیوں کی چبھن کی وجہ سے اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ یوں ہی تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوئی تو اس کی پشت دھوپ کی سمت ہوگئی تھی۔ کیونکہ ان کی گلی شمال کی طرف پہ تھی اور سورج صاحب اس وقت جنوبی سمت سنبھالے ہوئے تھے۔ اس لیے اس وقت دھوپ کی سوئیوں کا نشانہ اس کی خم دار کمر بنی ہوئی تھی۔

خدا خدا کرکے اس نے اپنی گلی سے اپنے گھر تک کا فاصلہ طے کیا اور گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر دروازہ ایک دم دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا۔ دروازہ کھلنے کے انتظار کے عذاب ناک مرحلے سے گزرتے ہوئے اپنی فائل کو سر اور چہرے کے سامنے کرتے ہوئے ذرا سی چھاؤں کا اہتمام کیا۔ اس وقت دھوپ کی آگ سے بچنے کے لیے یہ ذرا سی اوٹ بھی غنیمت تھی۔

اس نے ایک بار پھر دروازے پہ تشدد کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ خلاف توقع دروازہ فوراً" کھل گیا۔ اسے امید تھی کہ دروازہ کھولنے والی بی گل ہی ہوں گی۔ لیکن بی گل کی جگہ عافیہ بیگم کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی اور دروازے پہ تشدد کے لیے تیار اپنا دایاں ہاتھ پہلو میں گرا لیا۔

"السلام علیکم!" ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعصاب بھی ڈھیلے چھوڑنے پڑے تھے۔ اس نے آہستگی سے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" وہ بھی دھیمے سے جواب دیتے ہوئے سامنے سے ہٹ گئیں وہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی عافیہ بیگم دروازہ بند کرکے اس کے پیچھے ہی آگئیں۔

"کافی جلدی میں لگ رہی ہو؟" ان کے سوال میں ہلکے غصے کی آمیزش تھی۔ جس پہ اس کے ڈھیلے پڑنے والے اعصاب دوبارہ سے تن گئے۔

"سورج لگتا ہے کہ سوا نیزے پہ پہنچ گیا ہے۔ جسم میں آگ گھس رہی ہے۔ آدھے گھنٹے سے پیاس لگی ہوئی ہے۔ مگر کہیں سے پانی نہیں ملا۔ صبح ناشتے میں صرف ٹھنڈی لسی کا گلاس پی کر گئی تھی۔ اب بھوک کی وجہ سے آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے ہیں اور آپ کہتی ہیں کہ میں جلدی میں لگ رہی ہوں؟"

اس نے خفگی سے کہا۔ اپنا بیگ اور کتابیں تخت پہ ڈال کر سینڈل اتارتے ہوئے ننگے پاؤں ہی کچن کی سمت بڑھ گئی۔

"لیکن! اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم آتے ہی پولیس والوں کی طرح دروازہ پیٹنا شروع کردو؟ پورے محلے کو پتا چل جاتا ہے کہ تم گھر آئی ہو۔ ابھی کل کی بات ہے ساتھ والی امبرین شکایت کررہی تھی کہ۔ ماورا جب بھی گھر آتی ہے دروازہ اتنے زور سے پیٹتی ہے کہ میرا بچہ نیند سے ڈر کے اٹھ جاتا ہے۔ اس سے کہیں کہ دروازہ آہستہ بجایا کرے۔" عافیہ بیگم بھی اس کے پیچھے کچن میں چلی آئیں۔ وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر تعجب سے ان کی سمت پلٹی۔

"گویا اب گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے والوں کو بھی شکایت ہونے لگی ہے؟" اس نے بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"شکایت والا کام کروگی تو شکایت ہی ہوگی نا؟" وہ آگے بڑھ کے اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگیں۔

"آپ کو بھی آج تک شاید شکایت بھی صرف مجھ سے ہی ہوئی ہے اور کسی سے نہ شکوہ ہے' نہ گلہ۔"

وہ آہستگی سے بڑبڑاتی ہوئی کرسی پہ بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ عافیہ بیگم اس کی بات سن کر ضبط کرگئی تھیں۔ اس نے

تین سانس میں ٹھہر ٹھہر کر پانی پیا اور اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کا رخ واش بیسن کی طرف تھا۔ اس نے ٹونٹی کا وال کھول کر پانی چیک کیا۔ پانی ٹھنڈا ہی تھا۔ یعنی اس کا مطلب تھا کہ بجلی ابھی ابھی آئی تھی اور ٹنکی میں تازہ پانی بھر آگیا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر واپس برآمدے میں آئی اور تخت کے عین اوپر والا پنکھا آن کردیا تھا اور خود تخت پہ بیٹھ گئی۔ پنکھے کی تیز ہوا سے تپتے ہوئے جسم کو سکون ملا۔ وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

"کھانا کچن میں ہی کھاؤ گی یا باہر لے آؤں؟" عافیہ بیگم نے کچن سے آواز دے کر پوچھا۔

"کیا کچن میں کھانا کھانے کی کوئی صورت حال ہے؟" الٹا اس نے سوال داغ دیا۔ عافیہ بیگم اس کے سوال کا مفہوم سمجھ کر کھانے کی ٹرے برآمدے میں ہی لے آئیں۔

"سلاد لوگی ساتھ؟" انہیں پتا تھا کہ وہ سلاد شوق سے کھاتی ہے۔ لیکن صرف اس لیے پوچھ لیا تھا کہ اس کا موڈ بدلنے کون سا دیر لگتی تھی۔

"جی۔" اس نے آہستگی سے کہا اور ڈھکن ہٹا کر سالن دیکھنے لگی۔ "یہ قیمہ کریلے آپ نے بنائے ہیں؟"

وہ سالن کی رنگت دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی کہ سالن کس نے بنایا ہے۔ اس کے اتنے درست اندازے پہ عافیہ بیگم اسے دیکھ کے رہ گئیں۔

"ہاں! میں نے بنایا ہے' مجھے پتا تھا کہ کل تم نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا اسی لیے آج تمہاری پسند سے قیمہ کریلے بنائے ہیں۔"

وہ اسے کھانا بنانے کی وجہ جتا رہی تھیں۔

"تھینک یو۔" وہ نپے تلے سے انداز میں کہہ کر کھانا کھانے میں مصروف ہوگئی۔

"کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کے اس تھینکس پہ ضرور کچھ کہتیں۔ لیکن اس وقت وہ کچھ کہہ کر اس کا کھانا خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے اسے سلاد دے کر خاموشی سے پلٹ کر اندر آگئیں۔

"ماورا یونیورسٹی سے آگئی؟" بی گل نے چہرے سے بازو ہٹا کر عافیہ بیگم سے پوچھا۔

"دروازے کی آواز تو آپ سن ہی چکی ہیں۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ آگئی ہیں محترمہ۔" عافیہ بیگم کی خفگی کا رخ اب بی گل کی طرف نکلتا تھا۔

"آتے ہی شروع نہ ہوجایا کرو اس کے ساتھ۔ اس طرح بچہ چڑچڑا ہوجاتا ہے۔ اتنی گرمی اور دھوپ میں آئی ہے وہ۔ دماغ تو گرم ہوگا ہی اور تم ہو کہ فوراً" ہی شکایتوں کی پوٹلی کھول کے بیٹھ جاتی ہو' ماں ہو آخر۔ پیار سے اور دلار سے بٹھاؤ اسے۔ ٹھنڈا پانی دے کر اسے ٹھنڈا کرو اور جب اس کا دماغ ٹھنڈا ہوجائے تو پھر کچھ سمجھانے کا کام کرو۔ تم خود سمجھ دار ہو۔ لیکن سمجھ داری سے کام نہیں لیتیں۔"

وہ لیٹے لیٹے ہی انہیں سمجھانا شروع ہوگئی تھیں۔

"آپ بس مجھے ہی غلط کہتی ہیں۔ اسے کچھ نہیں کہتیں۔ آپ کی اسی طرف داری کی وجہ سے اسے اور بھی شہہ ملتی ہے۔" عافیہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

"تمہیں اس لیے کہتی ہوں کیونکہ تم سمجھ دار ہو۔ اسے اس لیے نہیں کہتی کیونکہ وہ ناسمجھ ہے۔ اور رہی بات طرف داری کی۔ تو ایک بات کان کھول کے سن لو! میں اگر یہ طرف داری بھی نہ کروں تو تم دونوں میں سے ایک اس گھر میں نہیں رہے گی۔ یا تو وہ تمہیں اس گھر سے نکال دے گی۔ یا تم اسے نکال دوگی۔ یہ جو گزارہ ہو رہا ہے نا' یہ صرف میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ سمجھیں تم؟" بی گل بات کرتے کرتے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے جواب اکثر بہت کرارے ہوتے تھے۔ جو کبھی ماورا کو گراں گزرتے تھے اور کبھی عافیہ بیگم کو۔

"لیکن بی گل! آپ خود سوچیں یہ کوئی طور طریقہ ہے گھر آنے کا؟ یوں لگتا ہے جیسے دروازے پہ قیامت آگئی

ہو۔ اور تو اور پورے محلے کو پتا چل جاتا ہے کہ محترمہ ماورا مرتضیٰ گھر آگئی ہیں۔" عافیہ بیگم کی خفگی کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"جانتی تو ہو یہ اس کی بچپن کی عادت ہے؟" بی گل نے ہاتھ اٹھا کر کہتے ہوئے انہیں یاد دلایا۔

"بچپن کی عادت بچپن کے ساتھ رخصت ہو جانی چاہیے اور اگر نہیں ہوتی تو اس پہ کنٹرول رکھنا چاہیے۔ بچی نہیں ہے وہ۔ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ ماسٹرز کی اسٹوڈنٹ ہے آخر۔" وہ جھنجلا گئیں۔

"تو پھر یہی سوچ لو وہ ماسٹرز کی اسٹوڈنٹ ہے اور تم میٹرک کی ٹیچر۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ماسٹرز کا اسٹوڈنٹ میٹرک کے ٹیچر کے قابو آجائے؟"

بی گل کی باتیں بھی کمال کی ہوتی تھیں۔ عافیہ بیگم انہیں دیکھ کے رہ گئیں۔

"دیکھو بیٹا! گھر میں ٹیچر بن کے نہ رہا کرو۔ ماں بن کے رہا کرو۔ تب ہی کچھ گزارہ ہوگا۔" انہوں نے عافیہ بیگم کو سمجھایا۔

"مجھے تو کچھ پتا نہیں ہے گزارہ ہوگا بھی یا نہیں۔ اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں کہتی اپنے بستر پہ بیٹھ گئیں۔ "بے شک اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے۔"

وہ پاؤں چارپائی سے نیچے اتار کر چپل پہننے لگیں اور سفید ململ کا دوپٹا اٹھا کر سر پہ رکھتے ہوئے باہر نکل آئی تھیں۔

"اسلام علیکم!" وہ کھانا ختم کر چکی تھی۔ پانی پی کر گلاس منہ سے ہٹاتے ہی فوراً انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام میرا بچہ! کھانا کھالیا؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"جی! کھالیا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"گرمی بہت ہے۔ پیاس بھی بہت لگتی ہوگی؟"

"ظاہر ہے! گرمی میں پیاس ہی تو لگتی ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ ٹھنڈے پانی کی بوتل ساتھ لے جایا کرو۔" وہ ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنے جا رہی تھیں۔ اس لیے اپنی قمیص کے بازو اڑسنے لگیں۔

"بی گل! اتنی بار آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں یونیورسٹی جاتی ہوں، اسکول نہیں کہ پانی کی بوتل اٹھا کر گلے میں لٹکاؤں اور پوری یونیورسٹی میں تماشا بن کے گھومتی پھروں؟"

"تو کیا یونیورسٹی میں پانی پینا بری بات ہے؟" بی گل معصومیت سے پوچھ رہی تھیں۔

"یونیورسٹی میں پانی پینا بری بات نہیں ہے۔ لیکن یونیورسٹی میں پانی کا ڈول گلے میں ڈال کر پھرتی ہوئی یقیناً مضحکہ خیز ہی لگوں گی جس کا شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے۔" اس نے کافی چڑ کر جواب دیا۔

"خیر! تمہاری مرضی۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ ان کا رخ واش روم کی طرف تھا، ماورا سر تھام کے رہ گئی۔

اسے بی گل کی باتوں پہ اکثر حیرت ہوتی تھی۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ ایسی ایسی گہری باتیں کہہ جاتی تھیں کہ بڑے بڑے اسکالرز کو بھی مات دے دیتی تھیں اور کبھی کبھی ایسی سادہ اور معصوم سی بات کر جاتی تھیں کہ کسی نا سمجھ بچے کا سا گمان ہوتا تھا اور ماورا سوچتی رہ جاتی کہ آخر وہ چیز کیا ہیں۔

بی گل ان دونوں ماں بیٹی کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ وہ ان دونوں کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں مگر افسوس کہ وہ دونوں ماں بیٹی آج تک بی گل کو نہیں سمجھ پائی تھیں، لیکن جو کچھ بھی تھا، ماورا مرتضیٰ کی شخصیت اور ذہانت ان ہی کی مرہون منت تھی۔

ماورا کی شخصیت کو انہوں نے اپنے حسب منشا تراشا تھا۔ وہ مجسم ان کی سوچ، ان کے خیالات کا پیکر تھی۔

حالانکہ انہوں نے اس پیکر میں عافیہ بیگم کو دیکھنا چاہا تھا۔ لیکن عافیہ بیگم کی بزدلی کے باعث انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر شکر تھا کہ ماورا نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ مردوں کے اس معاشرے میں مرد بن کے رہنے کا فن سیکھ گئی تھی۔ وہ کسی سے دبتی نہیں تھی بلکہ دبا کے رکھتی تھی۔ جس پہ بی گل خوش ہوتی تھیں۔ لیکن عافیہ بیگم خوش ہونے کے بجائے خائف ہو کے رہ جاتی تھیں۔

"کس سوچ میں گم ہو؟ نماز نہیں پڑھنی؟" بی گل وضو کر کے واپس آئیں تو ماورا کو ہنوز اسی جگہ پہ بیٹھے دیکھ کر ٹھہر گئیں۔ ان کی آواز پہ وہ ٹھٹک کر متوجہ ہوئی تھی۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ پڑھنی ہے نماز۔۔۔" وہ فوراً تخت سے اتری اور برتن سمیٹ کر کچن میں رکھتے چلی گئی پھر واش روم میں جا کر وضو کیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔

عافیہ بیگم اور بی گل کا کمرا مشترکہ تھا۔ البتہ اس کا کمرا الگ تھا، جو اس نے خود اپنی پسند کے مطابق ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا وہ اپنے کمرے کے درمیان بچھی چٹائی پہ جائے نماز بچھا کر نماز ادا کرنے کھڑی ہو گئی تھی۔ نماز تو وہ ہمیشہ ہی بہت یکسوئی سے ادا کرتی تھی۔ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد اس کا ایک گھنٹہ سونے کے لیے مقرر ہوتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ نیند لے کر تازہ دم ہونے کے بعد وہ ایک قریبی ٹیوشن سینٹر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے چلی جاتی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ اپنے آفس کا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے داخلی دروازے کے ساتھ ہی دیوار میں نصب اسٹینڈ میں سے ریموٹ نکال کر اے سی آن کیا اور کولنگ بڑھادی اور اسی طرح ریموٹ دائیں ہاتھ میں لیے میز کی سمت آگیا۔ ریموٹ اپنی ٹیبل پہ ڈالتے ہوئے بائیں ہاتھ میں پکڑا بریف کیس بھی اپنی کرسی کے قریب ہی نیچے کارپٹ پہ رکھ دیا۔ کمرے میں رفتہ رفتہ اے سی کی کولنگ بڑھ رہی تھی۔ تیز دھوپ سے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ پارکنگ سے بلڈنگ کے اندرونی حصے تک آتے آتے چہرہ دھوپ سے تمتما اٹھا تھا۔ اعصاب پرسکون ہوئے تو اس نے جیب سے موبائل اور گاڑی کی چابی بھی نکال کر میز پر رکھ دی تھی اور پلٹ کر کھڑکی کے پردے برابر کردیے۔ جس کی وجہ سے باہر سے آنے والی روشنی باہر ہی رہ گئی تھی اور اب روم میں صرف فینسی لائٹس کی روشنی جگمگا رہی تھی۔

"مے آئی کم ان سر۔۔۔؟" اس کی پی اے سحرش زمان دروازے پہ دستک دیتے ہوئے اجازت طلب کر رہی تھی۔

"یس! کم ان۔۔۔" اس نے آہستگی سے اجازت دی اور مضبوط قدم اٹھاتا اپنی کرسی تک واپس آگیا۔

"گڈ مارننگ سر۔۔۔!" سحرش زمان نے بے حد خوش گوار انداز میں کہا۔

"گڈ مارننگ مس سحرش! پلیز تشریف رکھیے۔۔۔!" اس نے شائستگی سے کہتے ہوئے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تھینک یو سر۔۔۔!" وہ بھی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"کیسی ہیں آپ۔۔۔؟" اس نے اپنی ٹیبل کے دراز کا لاک کھولتے ہوئے پوچھا۔

"الحمدللہ! بالکل ٹھیک ہوں سر۔۔۔" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

"ہوں! وہ تو نظر آرہا ہے۔" وہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے مسکرایا۔

"اوہ ریئلی سر! تھینک یو سو مچ۔۔۔" سحرش زمان اس کے تبصرے پہ بے پناہ خوش ہوئی۔ کیونکہ وہ کسی دوسرے

مخصوصاً" لڑکیوں پہ ذرا کم ہی دھیان دیتا تھا۔ اس کے سامنے حسین سے حسین ترین لڑکی بیٹھی ہوتی تب بھی وہ اپنی نگاہ اور نیت کو ایک انچ بھی آگے یا پیچھے ہلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور ایسے میں اس کے اس بھرے پہ سحرش زمان خوش نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔

"یو ویلکم...!" اس نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے کہا۔

"آج کے دن کی کیا ڈیٹیلز ہیں آپ کے پاس...؟" وہ فائلز نکال کر سیدھا ہوا اور اس سے آج کے دن کی مصروفیات دریافت کیں۔

"سر! آج کے دن آپ کو کوئی ٹینشن نہیں ہے۔ تقریباً" ایک گھنٹے کے بعد آپ کی فیبرکس ڈیزائنو کے ساتھ میٹنگ ہے جس میں آپ نے کلر اسکیم اور چند ڈیزائنز پہ ڈسکس کرنا ہے اور کچھ نئے ڈیزائن بھی سلیکٹ کرنے ہیں۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں" آج کل سیزن ہے۔ اس لیے اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ آج کل نئے ڈیزائنز کی ڈیمانڈ ہے۔" سحرش زمان اسے تفصیلات بتانا شروع ہو چکی تھی اور وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

"اس کے علاوہ...؟" وہ آج کے دن کا کوئی اور پروگرام پوچھ رہا تھا۔

"اس کے علاوہ آپ اپنے دوست کی طرف سے لنچ پہ انوائیٹڈ ہیں اور ان کی تاکید کے مطابق ٹھیک دو بجے آپ کو ریسٹورنٹ کے ہال میں موجود ہونا چاہیے۔" وہ چونک گیا۔

"کتنے بجے کا ٹائم ہے لنچ کا...؟" اس نے دہرا کے پوچھا تھا۔

"سر! دو بجے کا..."

"ہوں! تو فیکٹری کا راؤنڈ لگایا جا سکتا ہے؟" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے ٹائم کا اندازہ لگایا۔

"لیکن سر! ابھی تو آپ کی میٹنگ بھی ہے؟" اس نے پھر سے یاددہانی کروائی تھی۔

"یس اوکے! میٹنگ کون سا اتنی طویل ہوگی؟ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔ گیارہ بجے میٹنگ ختم ہوگی تو ہم راؤنڈ پہ چلے جائیں گے۔ لیکن ایک بات اور... فیکٹری میں کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہم آج راؤنڈ پر آرہے ہیں۔" اس نے تاکید کی۔

"اوکے سر! ایز یو وش۔ کیا میں جا سکتی ہوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے اجازت طلب کی۔

"ہوں! آپ جا سکتی ہیں، لیکن پلیز! فاروقی صاحب کو ذرا اندر بھیج دیجیے گا۔" اس نے منیجر کو اندر بھیجنے کا کہا۔

"اوکے سر!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تھینک یو۔" وہ کہہ کر اپنے سامنے پھیلی ہوئی فائلز کی سمت متوجہ ہو گیا۔ وہ باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے فوراً" بعد ہی فاروقی صاحب کا چہرہ دروازے سے نمودار ہوا۔ یوں جیسے وہ پہلے سے ہی دروازے پہ تیار کھڑے تھے۔

"السلام علیکم سر!"

"وعلیکم السلام! آیئے، تشریف رکھیے۔" اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا۔

"سر! آپ نے بلایا تھا؟"

"جی ہاں! اس فائل کی کاپی کروا کے لاکر میں رکھوا دیں اور یہ دونوں پیپرز کمپوز کروانے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میٹنگ ہے اور میٹنگ ختم ہونے سے پہلے یہ پیپرز مجھ تک پہنچا دیجیے گا اور ہاں! کمپوزر سے کہیے گا کہ ہاتھ ذرا جلدی چلائے۔" اس نے تاکید کی۔ یہ اس کی شروع سے عادت تھی۔ وہ بعد میں سر کھپانے کے بجائے پہلے ہی تاکید کر دیتا تھا۔ تاکہ نہ بعد میں اسے کوفت اٹھانا پڑے اور نہ ورکرز کو عجلت اور بے زاری میں کام کرنا پڑے۔

"ٹھیک ہے سر! ابھی کروا دیتا ہوں۔" فاروقی صاحب فوراً" کرسی سے کھڑے ہو گئے۔

"اور سنیے! وہ بینک سے لیٹر آیا؟" اس نے کچھ یاد آنے پر پوچھا۔

"نہیں سر! ابھی تو نہیں آیا۔"

"اوکے! جب آئے تو مجھے فوری انفارم کر دیجیے گا۔ بہت اہم کام رکا ہوا ہے۔"

"جی! ٹھیک ہے سر۔"

"اوکے! آپ جا سکتے ہیں۔"

انہیں جانے کی اجازت دے کر وہ دوبارہ فائلوں میں گم ہو گیا۔ وہ میٹنگ سے پہلے کے چند چھوٹے موٹے کام نپٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ شروع سے ہی ایسا تھا ذمہ دار اور سلجھا ہوا۔ کام کے وقت صرف کام کی بات کرتا تھا۔ ٹائم ضائع کرنا اسے قطعاً" پسند نہیں تھا۔ نیت کا صاف اور سچا کھرا آدمی تھا۔

اس کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ اس کے ورکرز اور بزنس کولیگز بھی اس سے خوش رہتے تھے، کبھی کسی بھی معاملے میں کوتاہی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کوتاہی ہونے دیتا تھا۔ اسی وجہ سے لوگوں کو اس سے شکایت بھی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ شکایت کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

فیکٹری کا راؤنڈ لے کر تقریباً" سوا ایک بجے وہ واپسی کے لیے نکل آیا تھا۔ لیکن راستے میں اتنا رش تھا کہ کوشش کے باوجود وہ وہاں سے جلدی نہیں نکل سکا۔ کراچی کی تپتی ہوئی سڑکوں پہ ٹریفک کا منہ زور سیلاب امڈا ہوا تھا۔ دھوپ، دھواں اور گرد و غبار نے گرمی کی شدت میں اور بھی اضافہ کر رکھا تھا۔ گاڑی کے تمام شیشے بند اور اے سی آن ہونے کے باوجود اسے الجھن اور گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بہت ہی نفاست پسند آدمی تھا۔

اسے ایسے ماحول اور ہجوم سے کوفت ہوتی تھی اسی لیے وہ جلد از جلد گاڑیوں کے اس اژدھام سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے آدھا گھنٹہ تو لگ ہی گیا خدا خدا کر کے روڈ خالی ملا تو اس نے بھی کئی اور بے چین لوگوں کی طرح گاڑی پوری رفتار پہ چھوڑ دی اور ٹھیک پونے دو بجے وہ ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔

"سر! آر یو تیمور حیدر...؟" ویٹر اسے دیکھ کر تیزی سے قریب آیا۔

"یس! آئی ایم تیمور حیدر..." اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"ویلکم سر! آیئے اوپر آجائیے۔ آپ کی ٹیبل ٹاپ فلور پہ ریزروڈ ہے۔" ویٹر اسے ساتھ لیے ریسٹورنٹ کے ٹاپ فلور پہ آگیا۔ ولید نے ٹاپ فلور کی کھڑکی والی ٹیبل ریزرو کروا رکھی تھی۔ تیمور حیدر کے ہونٹوں کو مسکراہٹ چھو گئی۔ ولید نے اس کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹیبل ریزرو کروائی تھی۔ کیونکہ ولید جانتا تھا کہ تیمور ہمیشہ ریسٹورنٹ کے ٹاپ فلور کی کھڑکی والی ٹیبل پسند کرتا ہے۔

تیمور حیدر دائیں ہاتھ میں پکڑا لیپ ٹاپ بیگ ٹیبل پہ رکھ کے بیٹھ گیا۔

ولید رحمان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ تیمور حیدر اکیلا بیٹھا پچھلے پندرہ منٹ سے بار بار ٹائم دیکھ رہا تھا، لیکن ولید کا تو دور دور تک کوئی نام و نشان ہی نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک بار تیمور کا دل چاہا کہ وہ اسے میسج یا کال کر کے اس کی عزت میں اضافہ کرے۔ لیکن پھر خود ہی سر جھٹک کر اپنا لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ ولید کو تو پتا نہیں کب آنا تھا۔ وہ بھلا کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا۔

"ارے! واؤ! تم... تیمور حیدر..." ایک نسوانی آواز پہ تیمور حیدر کی انگلیاں کی پیڈ پہ حرکت کرتے کرتے ایک لمحے کے لیے رکی تھیں۔

یہ آوازدائیں سائیڈ والی ٹیبل کی طرف سے سنائی دی تھی۔
"کون تیمور حیدر۔۔۔؟" دوسری آواز میں حیرانی تھی۔
"ارے! وہی تیمور حیدر' ہمارے شہر کا نمبرون بزنس ٹائیکون۔ حیدر گروپ آف انڈسٹریز کا مالک۔ شہر کا سب سے بڑا مل اونر ہے۔ لاسٹ سنڈے کو سنڈے میگزین میں انہی کا انٹرویو پڑھا تھا میں نے اور ماریہ نے۔۔۔؟ اور تم لوگوں سے ڈسکس بھی کیا تھا۔" پہلی نسوانی آواز نے دوسری کو یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔
"ارے ہاں! یاد آگیا' تو یہ ہیں تیمور حیدر۔۔۔؟ واقعی یار! ان کی پرسنالٹی تو غضب کی ہے۔" دوسری والی آواز میں اب حد سے زیادہ شوق' اشتیاق اور ستائش کی آمیزش تھی۔ گویا اب وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ تیمور حیدر نے سر جھٹکتے ہوئے اپنی توجہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی جانب مبذول کر دی۔ کیونکہ یہ سب اس کے لیے اک عام سی بات تھی۔ وہ جب بھی کہیں جاتا' اسے ایسے کئی کمنٹس سننے کو ملتے۔ کچھ اپنے بزنس اور کامیابی کی وجہ سے اور کچھ اپنی ڈیشنگ اور شاندار شخصیت کی وجہ سے۔۔۔ اسے ہمیشہ اسی طرح پروٹوکول ملتا تھا۔ جیسے اس وقت وہ لڑکیاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کی سمت متوجہ تھیں۔
"آج ان کی کسی کے ساتھ ڈیٹ تو نہیں ہے؟ کافی دیر سے اکیلے بیٹھے ہیں؟ انتظار میں لگ رہے ہیں؟" یہ کوئی تیسری آواز تھی۔ جس نے پہلی دو آوازوں میں مداخلت کی۔
"ارے یار! آہستہ بولو۔ اگر انہوں نے سن لیا تو کیا سوچیں گے؟" چوتھی آواز نے سرزنش کی۔
"کچھ نہیں سوچیں گے۔ وہ کہتے ہیں فضول سوچوں کے لیے ان کے پاس ٹائم ہی نہیں ہوتا۔" یہ شگوفہ تیسری آواز نے چھوڑا تھا۔ جس پہ باقی تینوں آوازیں ہنسی کا ساز لیے کھنک اٹھی تھیں۔ تیمور حیدر لڑکیوں کی اٹکھیلیوں پہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔
"ہائے۔۔۔!" اچانک اس کے قریب سے ولید کی آواز ابھری۔ لیکن تیمور نے اس کی آواز کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔
"ہیلو مسٹر تیمور حیدر! میں آپ سے مخاطب ہوں۔" ولید نے ٹیبل بجا کر اسے متوجہ کیا۔
"لیکن میں اس وقت کسی اور سے مخاطب ہوں۔" اس نے کافی لاپروائی سے جواب دیا۔
"کس سے۔۔۔؟" ولید نے جھٹ استفسار کیا۔
"اپنے کزن سے۔۔۔" اس نے مختصراً" بتایا۔
"اوہ! میں سمجھا کہ۔۔۔" ولید نے مایوسی سے کہا اور پھر بات ادھوری چھوڑ کر کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔
"تم سمجھے کہ کسی لڑکی کے ساتھ بزی ہوں؟" تیمور نے اس کے ذہن میں آنے والے خیال کو لفظوں کا روپ دیا۔
"آف کورس یار! مگر میں بھول گیا تھا کہ صنف نازک کے حوالے سے تمہارے اندر کشش کے تو کوئی جذبات ہی نہیں۔ تم صنف نازک کو بھی ایسے لیتے ہو جیسے کہ ولید رحمان کو۔۔۔" اس نے کافی افسوس سے سر ہلایا۔
"یہ جذبات تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے ہیں' کیا یہ کافی نہیں ہے؟" تیمور نے خفگی سے کہتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔
"ماشاء اللہ! ہم تو ایسے جذبات سے مالا مال ہیں۔" ولید نے فخریہ انداز میں بازو پھیلا کر کہا۔
"اسی لیے تو جگہ جگہ لٹاتے پھر رہے ہو۔۔۔؟" اس نے طنزیہ کیا۔
"اور تم تالا لگائے بیٹھے ہو؟" ولید نے بھی چڑ کے جواب دیا۔
"میں بددیانت نہیں ہوں۔" تیمور کا لہجہ مضبوط تھا۔ اس کے کردار اور شخصیت کی طرح۔

"واہ! کیا خوب کہی ہے' لیکن میرے یار! مجھے اتنا تو بتا دو "آج کل کے زمانے میں کون ایمان دار ہے؟ تیمور حیدر کے علاوہ۔۔۔" ولید اس سے بحث پہ اتر۔
"گویا تمہاری بات کا یہ مطلب ہوا کہ آج کل کے زمانے میں ایمان ختم ہو گیا ہے۔" تیمور حیدر نے اس پہ نظریں جماتے ہوئے سنجیدگی سے استفسار کیا۔
"ایمان ختم نہیں ہوا یار۔۔۔ ایمان دار ختم ہو گئے ہیں۔ ایمان بے چارا تو اب اکیلا نظر آتا ہے۔ مارا مارا پھرتا ہے' صرف اس تلاش میں کہ شاید کوئی اسے سنبھالنے والا مل جائے۔ جہاں بھی جاتا ہے' اسے وہاں پہلے سے ہی بے ایمانی براجمان نظر آتی ہے اور ایمان بے چارا منہ سر لپیٹ کے خاموشی سے واپس پلٹ آتا ہے۔ افسوس! کہیں ٹھکانہ نہیں ہے مسکین کا۔۔۔" ولید نے اسے عجیب سی وضاحت تھما دی۔
"سر پلیز! آٹوگراف۔۔۔"
وہ لڑکیاں آٹوگراف بک لے کر تیمور حیدر کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔ ولید نے ایک اچٹتی سی مسکراتی ہوئی نظر ان الٹرا ماڈرن لڑکیوں پہ ڈالی اور پھر دوسری نظر تیمور حیدر پر' وہ بغیر کچھ کہے خاموشی سے انہیں آٹوگراف دینے لگا تھا۔
"تھینک یو سو مچ سر!" وہ لڑکی دلکشی سے مسکرائی۔
"یو ویلکم۔۔۔!" وہ بھی خوش اخلاقی سے کہتے ہوئے دوبارہ ولید کی سمت متوجہ ہو گیا' لیکن وہ ایک لڑکی جانے کے بجائے وہیں کھڑی رہی تھی۔
"جی۔" تیمور حیدر نے استفہامیہ سے لڑکی کی طرف دیکھا۔
"سر! کیا آپ میرے ساتھ ایک کپ کافی پی سکتے ہیں؟" اس لڑکی کی اس نئی اور اچانک فرمائش پہ جہاں تیمور ٹھٹکا تھا' وہیں ولید اپنی گدی کے بال سہلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔
"پلیز سر! صرف ایک کپ۔۔۔ زیادہ ٹائم نہیں لوں گی آپ کا۔۔۔" وہ لڑکی کافی اصرار سے بولی۔ تیمور نے ایک نظر ولید کی سمت دیکھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنی توجہ اس کی طرف سے ہٹائے بے وجہ ہی ہال میں نظریں دوڑا رہا تھا۔
"دیکھیے مس! میں اس وقت آل ریڈی اپنے دوست کی طرف سے لنچ پہ انوائیٹڈ ہوں۔ فی الحال سخت بھوک لگی ہے' لہٰذا اس وقت کافی پینے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایم ایکسٹریملی سوری۔" تیمور حیدر نے کافی شائستگی سے معذرت کی۔
"اوکے! ابھی نہیں تو پھر کبھی سہی۔ آپ میرا یہ نمبر رکھ لیں۔ کبھی فرصت ملے تو یاد کر لیجیے گا۔ ریئلی سر! میں فوراً" آجاؤں گی۔"
وہ لڑکی کافی لجا کے بولی اور جلدی سے ایک چٹ پہ اپنا نام اور نمبر لکھ کر تھما گئی۔ تیمور حیرت سے ہاتھ میں پکڑی چٹ کو دیکھ رہا تھا۔ ولید نے اس لڑکی کے جانے کے بعد تیمور حیدر کو دلچسپی سے بغور دیکھا۔ پھر ذرا سا آگے ہوتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے وہ چٹ تھام لی اور اس لڑکی کا نام اور نمبر پڑھ کر مسکرایا۔
"مسٹر تیمور حیدر! یہ ہے وہ بے ایمانی جو ہمارے ایمان کو کہیں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اسی بے ایمانی کو دیکھ کر ہی ہمارا ایمان' ایمان داری کی دہلیز سے واپس پلٹ جاتا ہے' جب ایسی چلتی پھرتی ہوشربا بے ایمانی خود چل کر ہمارے پاس آتی ہے تو ایمان پہ دروازے بند کرنے ہی پڑتے ہیں۔" ولید نے اسے اپنی بے ایمانی کی وجہ بتائی۔
"یہ دروازے میں کیوں نہیں بند کرتا؟ ایسی بے ایمانی میرے پاس بھی تو آتی ہے خود چل کے۔۔۔؟" تیمور کے لہجے میں طنز تھا۔
"ہر کوئی تیمور حیدر نہیں ہو سکتا میرے دوست۔۔۔" ولید نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر یہ بھی سوچ لو میرے دوست کہ یہاں ہر کوئی ولید رحمان بھی نہیں ہے۔ بے ایمانی کی خاطر ایمان پہ دروازے بند کر دینے والا۔" تیمور نے بھی اسے دوبدو جواب دیا تھا۔

"خیر! چھوڑو اس بات کو۔ یہ بحث لاحاصل ہے۔" ولید نے سر جھٹکا۔

"تم نے شروع سے ہی یہ سوچا ہوا ہوتا ہے کہ تمہیں اس بحث میں متفق نہیں ہونا۔ اسی لیے آخر میں آکر بحث کو لاحاصل قرار دے دیتے ہو۔" تیمور کو اس کے اس طرح دامن جھاڑ دینے پہ مزید غصہ آیا۔

"کیا تم مجھ سے متفق ہوتے ہو جو میں ہو جاؤں...؟" ولید نے چھیڑنے والے انداز میں پوچھا۔

"تم سے متفق ہونا بہت مشکل ہے میرے لیے۔ اینی وے تم یہ بتاؤ کہ مجھے انوائٹ کر کے تم خود کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں پچھلے ایک گھنٹے سے بے وقوفوں کی طرح اکیلا بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ کیا تم نے مجھے یہاں بیٹھنے کے لیے انوائٹ کیا تھا؟" ولید کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بس یار! وہی مسئلہ آگیا تھا۔" ولید نے بال کھجاتے ہوئے کہا۔

"کون سا مسئلہ...؟" تیمور نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"بے ایمانی آڑے آگئی تھی۔ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کے آیا ہوں۔" ولید کے جواب پہ تیمور نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"دل چاہ رہا ہے ابھی یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں۔ میں تمہاری خاطر اتنی گرمی میں ہر کام جلدی ختم کر کے فیکٹری سے سیدھا یہیں آیا ہوں۔ تمہارے بتائے ہوئے وقت سے ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہوا۔ بھوک سے برا حال ہے اور تم ہو کہ..."

"کول ڈاؤن میری جان! کول ڈاؤن... جب تمہیں کسی سے محبت ہوگی تو پھر پوچھوں گا تم سے کہ بندہ ہر کام میں لیٹ کیسے ہوتا ہے؟" ولید نے ہاتھ اٹھا کر اسے غصہ کرنے سے روکا تھا، لیکن تیمور کو اس کی یہ بات بھی ناگوار گزری تھی۔

"شٹ اپ یار! محبت جیسے مقدس نام کو تو بدنام مت کرو۔" تیمور نے فلرٹ کو محبت کا نام دینے پہ اسے ٹوک دیا۔

"اوکے یار! اوکے۔ ویسے محبت بھی آج کل اس نوبت پہ آگئی ہے کہ دیکھنے والوں کو فلرٹ معلوم ہوتی ہے۔" ولید نے ہنس کر کہا۔ لیکن تیمور نے جواباً کچھ بھی نہیں کہا۔ ولید نے اس کی خاموشی پہ اس موضوع کو سمیٹنے کی خاطر ویٹر کو طلب کر لیا۔

"کھانا تم آرڈر کرو گے یا محبت کی طرح یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا؟" ولید نے جان بوجھ کر ایک بار پھر اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔

لیکن تیمور اس کی شرارت بھانپتے ہوئے خاموشی اختیار کر گیا اور ذرا سی گردن موڑتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"مجھے پتا تھا۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔ خیر کوئی بات نہیں تیمور حیدر! اللہ بھلا کرے تمہارا..."

ولید نے کہتے ہوئے آہ بھری اور پھر ویٹر کو تیمور کا پسندیدہ کھانا آرڈر کرنے لگا۔ جس پہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیمور کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"چلو! شکر ہے۔ بے رونق چہرے پہ بہار تو آئی۔" ولید نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

"بہت ڈھیٹ انسان ہو تم۔" تیمور نے اسے گھورا۔

"ڈھیٹ ہونے کے بڑے فائدے ہوتے ہیں یار! ویسے ڈھیٹ کو معزز لفظوں میں مستقل مزاج بھی کہا جاتا ہے جیسے ولید رحمان ڈھیٹ اور تیمور حیدر مستقل مزاج۔ غور کرو تو مطلب ایک ہی ہے۔" ولید نے فخر سے کالر کھڑے کیے۔

"اب ایسی ڈھٹائی پہ میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا۔" تیمور حیدر نے بے بسی ظاہر کی۔ ولید بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا۔ تیمور بھی اسے دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔

"آج بہت خوش لگ رہے ہو؟ کیا وجہ ہے؟" تیمور نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"جو بات تمہیں بہت پہلے پوچھ لینی چاہیے تھی وہ اب پوچھ رہے ہو۔" ولید سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"پوچھنا چاہتا تھا، لیکن تم نے کل سے اب تک پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ تمہارا موڈ، یہ ہنسی یہ لنچ وغیرہ آخر کس سلسلے کی کڑیاں ہیں؟" تیمور نے اب کافی سنجیدگی سے پوچھا۔ ولید ایک بار پھر مسکرایا۔

"سوچا ہمیشہ تمہارا کھایا ہے۔ آج تمہیں کھلا دوں۔" ولید کا لہجہ ذرا سا دھیما پڑ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" تیمور حیدر کی آنکھوں میں تعجب سمٹ آیا۔

"ارے! کچھ نہیں کہہ رہا یار۔ بس مجھے جاب مل گئی ہے، اس لیے آج تمہیں انوائٹ کیا ہے۔ اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ تمہیں انوائٹ کرنے کے علاوہ کچھ سوجھا ہی نہیں۔" ولید نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ریئلی...؟" تیمور کو اس کی جاب کا سن کر ایک دم خوشی کا اک جھٹکا سا لگا۔

"مبارک ہو یار! بہت بہت مبارک ہو تمہیں..."

تیمور کو اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج ولید کو نہیں اسے جاب مل گئی ہو اس نے ولید سے ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

شاید اس لیے کہ ولید کی بے روزگاری اس کے دل میں کسی پن کی طرح چبھتی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود اپنے دل میں چبھی اس پن کو نکال نہیں پاتا تھا۔ کیونکہ ولید اسے اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ اتنا خوددار تھا کہ کبھی بھی تیمور حیدر کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ تیمور نے اسے بارہا جاب آفر کی تھی۔ اسے اپنے ساتھ اپنے بزنس میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ولید کسی طور بھی نہیں مانا تھا۔ وہ دوستی کو دوستی کی حد تک رکھنا چاہتا تھا۔ مدد اور امداد کی حد تک نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ ایسا کرنے سے اس کی نظریں نیچی ہو جائیں گی اور نیچی نظروں کے ساتھ رشتے نہیں نبھ سکتے۔ چاہے وہ دوستی کے ہوں، چاہے رشتہ داری کے۔

"تھینک یو میرے یار!" وہ تیمور کو اتنا خوش دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"لیکن یار! تم نے یہ سب کیوں کیا ہے؟ فضول میں اتنے پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنی مشکل سے تو تمہیں جاب ملی ہے۔ بجائے اس کے کہ تم پیسے سنبھال کے رکھو، الٹا ضائع کر رہے ہو؟" تیمور نے اسے سرزنش کی تھی۔

"پیسے سنبھالنے کے لیے کیا تم کافی نہیں ہو، جو میں بھی پیسے سنبھالنا شروع کر دوں؟"

وہ پھر سے اپنا ٹریک بدل چکا تھا۔ تیمور نے اسے خفگی سے دیکھا۔

"ارے یار! اب اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ بھی تو سوچو کہ پیسے سنبھالنے کے لیے کوئی تجوری یا لاکر تو ضرور ہونا چاہیے۔ جبکہ میرے پاس تو صرف یہ جیب ہے اور تم جانتے ہو، جیب میں پیسے ذرا کم ہی ٹکتے ہیں۔ لیکن تمہارے مخلصانہ مشورے پہ غور کرتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ مہینے دو مہینے کی تنخواہ جمع کر کے ایک تجوری خرید لوں۔ جس میں باقی کے مہینے پیسے سنبھالتا رہوں گا۔"

ولید نے تیمور کی بات کو سنجیدگی سے لینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ بلکہ الٹا مذاق میں اڑا دیا۔

"ولید پلیز یار! کبھی کسی بات کو سنجیدگی سے بھی لے لیا کرو۔"
"ارے یار! لے تو رہا ہوں سنجیدگی سے۔ اور بھلا کس طرح لوں۔۔۔؟ یا پھر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی پینٹ اور شرٹس کی تمام جیبیں بند کروا دوں؟ تاکہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔۔۔؟" ولید نے تیمور کو زچ کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' لیکن تیمور پھر بھی سکون اور تحمل سے کام لے رہا تھا۔
"دیکھو ولید! تم کام کرو گے محنت کرو گے' پیسہ ضائع کرو گے تو کیا حاصل ہوگا تمہیں؟ الٹا تمہیں نقصان ہوگا۔ جبکہ پیسے سنبھال کے رکھو گے تو تمہیں فائدہ ہوگا۔ گھر والوں کو سہولت ہو جائے گی' وہ پیسہ ماں جی اور بہن بھائیوں کے کام آئے گا' مشکل وقت اور مجبوری میں کسی سے مانگنا نہیں پڑے گا۔ اس لیے پلیز! ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ احتیاط کیا کرو۔"
تیمور نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ولید رحمان سمجھ جانے والی مٹی سے نہیں بنا۔ وہ ہمیشہ وہی کام کرتا تھا۔ جو اس کے من میں سماتا تھا۔ ورنہ لاکھ کوشش کر لی جاتی' وہ کسی اور کام کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو کافی متلون مزاج آدمی تھا' لیکن کبھی کبھی اڑی (ضد) بھی کر ہی جاتا تھا۔ جیسے اس نے تیمور کی جاب نہ کرنے پہ کی تھی۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ تیمور کی جاب نہیں کرے گا۔ سو اس نے نہیں کی تھی۔
"اللہ مالک ہے یار! اچھا برا وقت سب اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم جوڑ جمع کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ ادھر ہم سالوں تو کیا صدیوں کے لیے جمع کرنے کی کوششوں میں ہوتے ہیں اور ادھر ہمیں اپنے اگلے ایک پل کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ اگلے پل میں ہمیں سانس لینا بھی نصیب ہوگا یا نہیں۔۔۔؟"
ولید کی بات میں انسان کی زندگی کی ایک ایسی سچائی' ایسی حقیقت بول رہی تھی' جسے سن کر کوئی بھی انسان چند ثانیے کے لیے چپ ہو سکتا تھا۔ سو تیمور حیدر بھی چپ ہو چکا تھا۔
"سر پلیز!" ویٹر نے آ کر انہیں متوجہ کیا اور پھر ٹیبل پہ کھانا سرو کر دیا۔
"آج تمہاری وہ خوب صورت سی پی اے کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی؟ میں تو اسی لیے خوش تھا کہ وہ بھی آئے گی؟"
ولید نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔ تیمور اس کی شرارت پہ ہنس پڑا۔ ولید کا مقصد بھی اسے ہنسانا ہی تھا کیونکہ وہ تیمور کو خوش گوار موڈ اور خوش گوار ماحول میں کھانا کھلانا چاہتا تھا۔ سو اب وہ دونوں قدرے ہلکے پھلکے اور خوش گوار موڈ میں کھانا کھا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"فارہ۔۔۔ فارہ بیٹا۔۔۔! کہاں ہو؟" وہ بیڈ پہ بیٹھی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ٹی وی دیکھنے میں محو تھی' جب منزہ رحیم اسے پکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔
"جی ممی! کیا بات ہے؟" اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ٹی وی کی آواز کم کر دی۔
"فارغ ہو۔۔۔؟" وہ آگے بڑھ کے اس کے بیڈ پہ بیٹھ گئیں۔
"جی! تقریباً" فارغ ہی ہوں' کیوں کوئی مسئلہ ہے کیا؟"
فارہ بیڈ پہ بکھرے فیشن میگزین سمیٹ کر ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئی۔
"ارے نہیں بیٹا! مسئلہ تو کوئی نہیں ہے' وہ دراصل میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ میں صبح کراچی جا رہی ہوں' تم ساتھ چلو گی کیا۔۔۔؟" ان کے پوچھنے پہ فارہ چونک گئی۔

"آپ کراچی جارہی ہیں؟ مگر کیوں۔۔۔؟" اسے اچنبھا ہوا۔
"بس! کسی کام سے جارہی ہوں۔"
"ایسا کون سا ضروری کام آن پڑا ہے کہ آپ یوں اچانک جانے کے لیے تیار ہو گئیں؟" فارہ وجہ جاننے کی کوشش میں تھی۔
"ثمینہ سے ملنے جارہی ہوں۔" انہوں نے اسے مختصراً "بتایا۔
"ثمینہ آنٹی سے ملنے؟ خیریت۔۔۔؟" اب کی بار تو وہ اور بھی چونکی تھی۔
"کہا نا! کوئی کام ہے' ساری باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں۔۔۔ یو نو! تمہارا ارادہ ہے جانے کا یا نہیں۔۔۔؟" وہ بات ٹالتے ہوئے بولیں۔
"میں کیوں جاؤں گی بھلا۔۔۔؟ آپ کو کام ہے' آپ جائیں۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے انکار کردیا۔
"اتنا عرصہ ہوگیا ہے تمہیں کراچی گئے ہوئے۔ میں نے سوچا کہ آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی۔ ساشا وغیرہ اتنا مس کرتی ہیں تمہیں۔ ہم چار پانچ روز میں واپس آجائیں گے۔" انہوں نے اسے ساتھ چلنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کی ہی لیکن فارہ کا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
"ساشا وغیرہ مس کرتی ہیں تو یہاں آجائیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہی جائیں؟" فارہ نے ناگواری سے کہا۔ منزہ رحیم نے ٹھٹک کر بیٹی کے تیور دیکھے۔
"کیا بات ہے؟ موڈ کیوں آف ہے تمہارا۔۔۔؟" انہوں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے کے زاویے تنے ہوئے تھے۔
"میرا موڈ آف نہیں ہے۔ میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں کہ ہمیشہ ہم لوگ ہی ان سے ملنے کراچی جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو کبھی بھی ہم سے ملنے فیصل آباد نہیں آئے؟" فارہ کے رویے نے انہیں تشویش میں مبتلا کردیا۔
"تو اس میں حرج ہی کیا ہے بھلا۔۔۔؟ وہ آئیں یا ہم جائیں۔ بات تو ایک ہی ہے نا؟" انہوں نے فارہ کو مطمئن کرنا چاہا۔
"بات ایک کیسے ہو سکتی ہے ممی! آنے اور جانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہمیشہ آپ ہی جاتی ہیں۔ کبھی وہ کیوں نہیں آئیں؟"
فارہ نجانے کیوں ضدی سے انداز میں ان سے بحث میں الجھ گئی تھی۔ حالانکہ ضد اس کے مزاج کا خاصہ نہیں تھی۔
"فارہ! یہ کن چکروں میں پڑ گئی ہو تم۔۔۔؟ اپنوں میں یہ لین دین نہیں ہوتا کہ وہ ملیں گے تو ہم ملیں گے۔ وہ آئیں گے تو ہم جائیں گے۔ بیٹا! اگر یہی باتیں سوچنے بیٹھ جائیں تو سارے رشتوں میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ دلوں میں بدگمانیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ان باتوں کو سوچنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔" انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"یہی بات کراچی والے کیوں نہیں سوچ لیتے ممی جان۔۔۔؟" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ اس کا ننھیال کراچی میں تھا۔ ایک ماموں اور دو خالائیں کراچی میں ہی مقیم تھیں۔ البتہ ایک خالہ شارجہ میں ہوتی تھیں۔ جن کے بیٹے سے فارہ کی بڑی بہن حسنہ بیاہی گئی تھی اور فارہ ثمینہ خالہ کے بیٹے سے منسوب تھی۔ یہ نسبت دو سال پہلے ان کے بیٹے کی خوشی اور رضامندی سے ہی ٹھہرائی گئی تھی۔ لیکن اب۔۔۔
"فارہ۔۔۔!" انہوں نے اسے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا۔

"پلیز ممی! آپ کو جانا ہے تو جائیں۔ میں نہیں جارہی۔"
وہ تمام میگزین اٹھا کر بیڈ سے اٹھ گئی۔
"تمہیں اتنا غصہ کس بات پہ ہے؟" اب منزہ رحیم کا لہجہ بھی بدل چکا تھا۔
"مجھے کسی بات پہ غصہ نہیں ہے۔" وہ میگزین ریک میں رکھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور بے وجہ ہی کلینزنگ لوشن لے کر اپنے چہرے پہ مساج کرنے لگی۔ شاید وہ اپنے اندر کے غبار کو چہرے سے ظاہر ہونے سے چھپا رہی تھی۔
"آفاق نے کچھ کہا ہے؟" انہوں نے اسے کریدا۔
"آفاق کے پاس کچھ کہنے کے لیے فرصت نہیں ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔
"تمہارے پاس تو فرصت ہے نا؟ تم کہہ دیا کرو۔" منزہ رحیم نے نرمی سے کہا۔ لیکن فارہ تپ اٹھی۔
"دو سال سے مجھے ہی فرصت ہے اور میں ہی کہتی آرہی ہوں۔ اسے تو ان دو سالوں میں ایک بار بھی فرصت نہیں ملی کہ وہ کچھ کہہ دے۔" فارہ جھٹکے سے ان کی سمت پلٹی۔
"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا تمہاری آفاق سے بات نہیں ہوتی؟" انہیں حیرانی ہوئی ان کے خیال میں تو فارہ اور آفاق کا آپس میں رابطہ ہوتا رہتا تھا۔
"ہوتی ہے۔۔۔ ہر چھ ماہ بعد۔ جب ہر لڑکی کی طرح میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنے منگیتر سے بات کروں اور پھر دل کی اس چاہت سے مجبور ہو کر میں بے اختیار اس کا سیل نمبر ڈائل کرلیتی ہوں۔ موڈ نہ ہو تو کال ریسیو نہیں کرتا۔ موڈ ہو تو کرلیتا ہے۔ میرا حال پوچھتا ہے اور مجھ سے ہی آپ سب کا حال پوچھتا ہے۔ حال پوچھنے کے دوران ہی اچانک اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے سیل کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ سیل ڈیڈ ہو جائے گا۔ اس لیے بات نہیں ہو پائے گی۔ لہٰذا وقت سے پہلے ہی "اللہ حافظ"۔۔۔ دو سال میں چار بار اسے کال کی تھی دو بار کال ریسیو نہیں ہوئی اور دو بار "اللہ حافظ"۔۔۔
فارہ نے ماں کو خاصے تلخ انداز میں ساری تفصیل سے آگاہ کیا منزہ رحیم بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
"مجھے بتایئے ممی۔۔۔! آج کل کے دور میں ایسا کون سا لڑکا ہے' جو اپنی منگیتر سے بات نہیں کرنا چاہتا؟ حماد بھائی اور ساشا آپس میں منگیتر ہیں نا؟ ان کا پورا پورا دن آپس میں باتیں کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ آپ ابھی ان دونوں کے نمبرز ڈائل کرکے دیکھیں۔ آپ کو ان دونوں کے نمبرز اس وقت بھی بزی ملیں گے۔ بھلا کیوں۔۔۔؟ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ان کی دنیا ایک سے شروع ہو کر دوسرے پہ ختم ہو جاتی ہے۔ جبکہ آفاق یزدانی کی دنیا شروع بھی کہیں اور سے ہوتی ہے اور ختم بھی کہیں اور پہ ہوتی ہے۔ لیکن ممی! اب کی بار آپ کراچی جائیں تو اسے اتنا ضرور بتا دیجئے گا کہ اس کے لیے ہمیشہ کھلا رہنے والا دروازہ بند بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگلے چھ ماہ بعد میں اسے کال کروں اور کہوں کہ آفاق یزدانی اس سے پہلے کہ تمہارے سیل کی بیٹری ڈاؤن ہو جائے "اللہ حافظ۔"
فارہ نے کبھی اتنی لمبی چوڑی بات نہیں کی تھی' لیکن آج جب بولنے پہ آئی تو بولتی چلی گئی منزہ رحیم دم بخود سی وہیں کھڑی تھیں۔ جبکہ فارہ واش روم میں بند ہو چکی تھی۔ واش روم کا دروازہ دھڑام سے بند ہوا تھا۔ دروازے کی اس زوردار آواز پہ منزہ رحیم کی عقل اور سوچ کا دروازہ بھی کھل گیا تھا۔ اس عقل اور سوچ کا جس سے انہوں نے فارہ اور آفاق کے حوالے سے کبھی کام ہی نہیں لیا تھا۔ جس سے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ فارہ خوش کیوں نہیں ہے؟ یا پھر آفاق کی طرف سے کبھی اس خوشی کا اظہار کیوں نہیں ہوا؟ اور اب جب اس نہج پہ سوچا تھا تو دل و دماغ میں اک الجھن کے باعث تناؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ فارہ ایسی تو نہیں تھی اتنی تلخ اور اتنی ضدی وہ تو بہت

نرم اور بہت میٹھی تھی' ٹھنڈی طبیعت کی' متحمل مزاج۔ جو کہا جاتا' فوراً" مان لیتی تھی۔ کبھی کسی بات پہ ضد اور انکار نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب وہی فارہ تلخ اور چڑچڑی ہو رہی تھی۔ اتنی کہ ماں کے سامنے بولنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

منزہ رحیم کا ذہن الجھتا ہی جا رہا تھا۔ ان کے ذہن میں ثمینہ یزدانی کی باتیں بھی گردش کر رہی تھیں۔ ان سے فون پہ بات ہوئی تھی۔ سو وہ بھی کچھ پریشان لگ رہی تھیں اور ادھر فارہ کا بھی یہی حال تھا۔

"اللہ رحم کرے۔" انہوں نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اللہ سے اس کا رحم مانگا تھا۔

✡ ✡ ✡

صبح کے سات بجے کا وقت تھا۔

بی گل برآمدے میں بچھے تخت پہ بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ عافیہ بیگم معمول کے مطابق کچن میں ناشتا بنانے میں مصروف تھیں۔ جبکہ ماورا صبح صبح گھر کی صفائی ستھرائی کے کاموں سے فارغ ہو کر شاور لینے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ آج کل گرمی بہت شدید تھی۔ صبح چھ بجے ہی سورج دھوپ کے گھنگھرو باندھے پوری کائنات کے سر پہ ناچتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سورج کے اس ناچ کے دوران محض منہ ہاتھ دھو کر گھر سے نکلنا بے حد محال لگتا تھا۔ سو وہ روزانہ صبح شاور لے کر ہی یونیورسٹی کے لیے نکلتی تھی۔ تب ہی یونیورسٹی میں کچھ وقت سکون سے گزر جاتا تھا۔ وہ پورے پندرہ منٹ شاور لینے کے بعد باہر نکلی تھی اور اب اندر باہر چکرائی کچھ ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ عافیہ بیگم کو اس کی تلاش کی خبر نہیں تھی۔ تاہم گیارہویں سیپارے کی آخری سطریں عقیدت سے پڑھتی بی گل کو اس کی تلاش کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اسی لیے قرآن پاک جزدان میں لپیٹتے ہوئے پہلا سوال اسی سے کیا۔

"کالا دوپٹا ڈھونڈ رہی ہو؟" برآمدے کے کونے میں رکھے لکڑی کے استری اسٹینڈ کے نچلے خانے میں جھانکتی ماورا ان کے سوال پہ ٹھٹک کر سیدھی ہوئی تھی۔

"جی! وہی ڈھونڈ رہی ہوں۔ کہاں ہے؟" اس کے انداز میں کوفت تھی۔

"پہلے مجھ سے تو پوچھ لیتیں؟ کل عافیہ نے کپڑے دھو کر رسی پہ پھیلائے تو ساتھ وہ دوپٹا بھی تھا۔ وزن میں ہلکا تھا۔ ٹھہر نہیں سکا۔ ہوا کے پہلے جھونکے سے ہی اڑ کر باہر کے دروازے پر جا گرا تھا۔ میں نے سوچا کہ خراب ہو جائے گا۔ اس لیے استری کر کے تمہاری الماری میں رکھ آئی تھی۔"

"اور میں اتنی دیر سے اسے باہر ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔" ماورا جھنجلا گئی تھی۔

"بیٹا! کسی بھی چیز کو باہر ڈھونڈنے سے بہتر ہوتا ہے کہ بندہ پہلے "اندر" کی تلاشی لے۔ جو باہر نہیں مل رہا' وہ اندر ضرور مل جاتا ہے۔ تم نے اندر دیکھنے کی زحمت کی ہوتی تو تمہیں باہر ڈھونڈنے کی کوفت نہ اٹھانا پڑتی۔"

بی گل کی بات تو سادہ سی تھی۔ لیکن مفہوم بہت گہرا تھا اور ماورا اس گہرائی کو سمجھ کے ٹھٹک سی گئی تھی۔ اس نے آج تک زیادہ باتیں بی گل کی ہی سمجھی تھیں۔ ورنہ کسی اور کی بات تو وہ پلے ہی نہیں باندھتی تھی۔ اس نے آج تک اپنی سگی ماں کی باتوں پہ کان نہیں دھرے تھے۔ وہ اگر بات سنتی تھی تو صرف بی گل کی' کیونکہ وہ اس کے مطلب کی بات کرتی تھیں' اس کی حمایت میں بولتی تھیں اور شاید اسی لیے وہ بی گل کے بہت قریب تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس کا زیادہ رجحان بی گل کی طرف ہی رہا تھا۔

"اب یہاں کیوں کھڑی ہو؟ جاؤ اپنا دوپٹا لو اور ناشتا کرو۔" بی گل قرآن پاک احتیاط سے سنبھالتے ہوئے تخت سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کیونکہ عافیہ بیگم ان کا ناشتا ٹرے میں سجائے برآمدے میں ہی لے آئی تھیں۔

"لائیے! قرآن پاک میں رکھ دیتی ہوں۔ آپ ناشتا کر لیں۔"

عافیہ بیگم نے ناشتے کی ٹرے تخت پہ رکھتے ہوئے بی گل کے ہاتھوں سے قرآن پاک بڑے احترام سے تھام لیا۔

"جیتی رہو۔ اللہ خوش رکھے۔" وہ انہیں دعائیں دیتے ہوئے دوبارہ تخت پہ بیٹھ گئیں۔ عافیہ بیگم اندر قرآن پاک رکھنے چلی گئیں۔

"تم بھی ناشتا کر لو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" انہوں نے کمرے سے واپس آتے ہوئے اسے بھی اطلاع دی تھی۔

"جی! آ رہی ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے میں گئی اور الماری سے دوپٹا نکال کر گلے میں ڈالتی ہوئی کچن میں آ گئی۔

"تمہارے فائنل ایگزامز کب اسٹارٹ ہو رہے ہیں؟" وہ سر جھکا کر بیٹھی ناشتا کرنے میں مشغول تھی' جب عافیہ بیگم بھی اپنے لیے چائے کا کپ لے کر اس کے سامنے آ بیٹھیں۔

"اسی مہینے کے اینڈ میں اسٹارٹ ہو رہے ہیں۔" وہ لسی کا گلاس اٹھاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"اور ختم کب تک ہوں گے؟"

"دو یا تین ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔ کیوں خیریت۔۔۔؟ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔۔۔؟" ماورا کا لہجہ سنجیدہ۔ مگر انداز لاپروا سا تھا۔

"میں اسی لیے پوچھ رہی ہوں کہ تمہاری ایجوکیشن تقریباً" کمپلیٹ ہو چکی ہے' اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کچھ سوچا تو ہو گا تم نے۔۔۔؟" عافیہ بیگم نجانے کیوں بلا ارادہ ہی اس کے ارادے پوچھ بیٹھیں تھیں۔

"فی الحال ایگزامز کے بعد تو تھیسس پہ کام کرنا ہے۔ تھیسس کے بعد ڈگری ملتے ہی میرا پہلا ارادہ کراچی جانے کا ہے اور میرے اس ارادے کو آپ بھی جانتی ہوں گی نا؟ یہ ارادہ تو بچپن سے میرے ساتھ چلا آ رہا ہے۔"

ماورا لسی کا گلاس واپس چھوٹی سی ٹیبل پر رکھتے ہوئے اطمینان اور سکون سے بولی۔ لیکن اس کے اس سکون اور اطمینان پہ عافیہ بیگم کا سکون اور اطمینان ایک پل میں غارت ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے پہ اضطراب کا جال بچھ گیا اور ان کا یہ اضطراب ماورا سے چھپا ہوا نہیں رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ان کی اس کیفیت سے انجان بن گئی۔ اور بڑی مہارت سے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارادہ میرا ہے اور پورا بھی مجھ ہی کو کرنا ہے۔ اس لیے آپ کو خواہ مخواہ خود پہ ٹینشن سوار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میری ماں ہیں۔ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔ صرف آپ کی دعا چاہیے۔"

ماورا کا مضبوط اور مستحکم لب و لہجہ اور انداز دیکھ کر عافیہ بیگم کو اپنے ہاتھوں سے اک ریت سی پھسلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا' جیسے ان کی مٹھی خالی رہ جائے گی اور اسی مٹھی کے خالی رہ جانے کا خوف و خدشہ ان کے دل کو یکبارگی سما گیا تھا۔

یہ خوف ان کے چہرے اور ان کی آنکھوں میں سمندر کی بکھرتی لہروں کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔

"ماورا۔۔۔! تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں! میں جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور آپ بھی جانتی ہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کراچی جا کر وہاں رہنا' وہاں بسنا میرا خواب ہے۔ کراچی میرے بابا کا شہر ہے۔ کراچی میرا شہر ہے۔ اس شہر میں کوئی اپنا نہیں ہے تو کیا ہوا۔ شہر تو اپنا ہے نا؟ اور اپنے شہر میں جا کر رہنے اور آباد ہونے کا ارادہ اتنا بڑا اور اتنا ہولناک نہیں ہے کہ آپ اتنی خوف زدہ ہو جائیں۔۔۔ اور اگر آپ کے دل میں یہ خیال اور یہ خوف بھی ہے کہ میں وہاں جا کر آپ کے ہاتھوں سے

نکل جاؤں گی' آپ کے اختیار آپ کے قابو میں نہیں رہوں گی تو یہ آپ کی غلط سوچ ہے۔

اللہ کے سوا دنیا کی
کوئی بھی طاقت مجھے آپ سے دور نہیں کر سکتی اور اس چیز کے لیے آپ کو مجھ پہ نہ سہی' اپنے اللہ پہ یقین تو ہونا چاہیے نا؟ یقین انسان کو ڈگمگانے نہیں دیتا' ڈرنے نہیں دیتا' پیچھے نہیں ہٹنے دیتا' ثابت قدم اور پر عزم رکھتا ہے'

مگر افسوس! آپ نے بھی یہ طاقت نہیں آزمائی۔ آپ کو اپنی ذات پہ یقین نہیں تھا تو آپ آج یہاں ہیں' مجھے اپنی ذات پہ یقین ہے تو دیکھیے گا میں کل کہاں پہ ہوں گی۔ کیونکہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ اللہ کی ذات پہ بھی بہت یقین ہے۔ زمین اور آسمان کی وسعتوں جتنا یقین۔۔۔ اتنا یقین کہ اگر میں یہ تصور کرلوں کہ دنیا میری مٹھی میں ہے تو۔۔۔ یقین جانیے ایک دن واقعی دنیا میری مٹھی میں ہوگی۔"

ماورا نے کھڑے کھڑے اپنی ماں کو لیکچر سنا دیا تھا۔ حالانکہ لیکچر دینے کا شعبہ ان کا تھا' لیکن اسکول کی حد تک۔۔۔ گھر میں یہ کام یا تو بی گل کرتی تھیں یا پھر ان کی بہادر اور بے خوف بیٹی ماورا مرتضیٰ کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا اور جواباً" وہ کچھ کہنے کے لیے سوچتی رہ گئی تھیں۔

"یہ یقین آپ کو کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ آزما لیجیے گا' اللہ حافظ۔" وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔

برآمدے میں تخت پہ بیٹھی بی گل نے اسے پیچھے تک دیکھا تھا۔ وہ ماورا کا تنتنا دیکھ کر جوان ہوا کرتی تھیں۔ تیز دھار انداز و اطوار والی' جیکھی چھری سی ماورا ان کے کلیجے کی ٹھنڈک تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ خوش ہوتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ اس کے پیچھے پڑھ کے پھونک رہی تھیں جبکہ وہ گھر کی دہلیز عبور کر گئی تھی۔

✡ ✡ ✡
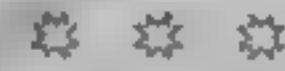
وہ پچھلے پندرہ منٹ سے بس اسٹاپ پہ کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اس کے روٹ کی بس آج شاید لیٹ ہوگئی تھی۔ ورنہ اتنا انتظار تو کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ ماورا بار بار اپنی خوب صورت سڈول سی کلائی پہ بندھی نازک اور نفیس سی رسٹ واچ سے ٹائم دیکھتی ہوئی پریشان ہو رہی تھی۔ وہ پہلے ہی گھر سے دیر سے نکلی تھی اور اب پندرہ منٹ یہاں ضائع ہوگئے تھے۔ اس کی پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ وہ کوفت کے مارے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی مطلوبہ بس کا دور دور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔

"بیٹا۔۔۔ تم آج جس بس کے انتظار میں ہو' وہ نہیں آئے گی۔ کل ڈرائیور' کنڈیکٹر اور کالج کے اسٹوڈنٹس لڑکوں کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ ڈرائیور کو بہت مارا تھا ان لوگوں نے۔ اس لیے شاید بسوں کی ہڑتال ہے آج۔"

اس بس اسٹاپ کے ساتھ ہی ایک بوڑھا آدمی بوٹ پالش کرنے کا کام لے کر بیٹھا ہوتا تھا۔ ماورا اسے روزانہ دیکھتی تھی۔ وہ بھی ماورا کو روزانہ آتے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے ماورا کی مطلوبہ بس کا بھی پتا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے مزید انتظار کرنے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

"اوہ نو۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا ہے۔ میں یونیورسٹی کیسے جاؤں گی؟ پہلے ہی اتنا لیٹ ہو چکی ہوں۔" ماورا تو جیسے سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی تھی۔

"انکل! آپ کو پکا پتا ہے کہ وہ بس نہیں آئے گی؟" اس نے اپنی تسلی کے لیے ایک بار پھر پوچھ لینا بہتر سمجھا۔

"بیٹا! مجھے خود بھی نہیں پتا تھا۔ وہ تو اخبار والا بتا کر گیا ہے کہ کل اسی سڑک پہ جھگڑا ہوا تھا۔ میں کل جلدی چلا گیا تھا۔ اس لیے مجھے نہیں پتا کہ یہ واقعہ کیوں اور کس وقت ہوا تھا؟" اس نے اسے تفصیل بتائی۔

"اوہ! تو اس کا مطلب ہے کہ اب کسی بھی بس کا انتظار کرنا فضول ہے؟" ماورا خود کلامی کے سے انداز میں کہتی

فٹ پاتھ سے اتر آئی۔

"اللہ حافظ۔" وہ اس آدمی کو اللہ حافظ کہتی ہوئی واپسی کے لیے قدم بڑھا چکی تھی اور ابھی وہ چار قدم ہی بڑھی تھی کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آئی اور اس کے قریب آکر اک جھٹکے سے رک گئی۔

"ماورا۔۔۔" یہ آواز فارہ کی تھی۔ ماورا نے ایک دم پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"ارے فارہ! تم۔۔۔ تھینک گاڈ یار! تم آگئیں۔" فارہ کو دیکھ کر ماورا کو اتنی خوشی شاید پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہوئی تھی۔

"مجھے پتا چل گیا تھا کہ آج بسوں کی ہڑتال ہے۔ اسی لیے یونیورسٹی جا کر دوبارہ تمہیں لینے کے لیے آگئی ہوں۔" فارہ نے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

"شکر ہے اللہ کا۔ ورنہ میں تو مایوس ہو کر گھر جا رہی تھی۔"

گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے اس کی نظر اس بوٹ پالش کرنے والے کی سمت اٹھی تھی۔ وہ انہی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ وہ نرمی سے ہاتھ ہلا کر گاڑی میں بیٹھی اور دروازہ بند کر دیا تھا۔ فارہ نے اک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ آج بسوں کی ہڑتال ہے؟" ماورا نے ذرا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"راستے میں تو مجھے احساس ہی نہیں ہوا اور نہ ہی پتا چلا تھا کہ کسی قسم کی کوئی ہڑتال ہے۔ وہ تو میں یونیورسٹی پہنچی تو کچھ لڑکے لڑکیاں بات کر رہے تھے۔ تب میرا پہلا خیال تمہاری طرف ہی گیا تھا اور میں فوراً" تمہیں لینے کے لیے آگئی۔ اگر تم مجھے یہاں نہ ملتیں تو میں تمہارے گھر جانے والی تھی۔" فارہ ڈرائیو کرتے ہوئے اسے ساری تفصیل بھی بتا رہی تھی۔ جس کے آخر میں آکر ماورا ٹھٹک گئی تھی۔

"ہر؟ تم بھول گئی ہو فارہ! میں نے تمہیں اپنے گھر جانے سے منع کیا ہوا ہے؟" ماورا نے اسے ٹوکا۔

"او سوری یار! میں اپنے دھیان میں تھی۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ تمہاری امی کو میرا آنا جانا پسند نہیں ہے۔" فارہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

"نہیں فارہ۔ بات صرف تمہاری نہیں ہے۔ وہ تو کسی کا بھی آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔ انہیں شروع سے ہی میرا کسی کے ساتھ دوستی کرنا' میل جول رکھنا اور ایک دوسرے کے گھروں تک آمد و رفت بڑھانا پسند نہیں ہے۔ اسی لیے تو میں نے کبھی کوئی دوست نہیں بنائی۔ سوائے تمہارے۔ کیونکہ تم نے تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اسی لیے امی کی اس قدر مخالفت کے باوجود میں بھی تمہیں نہیں چھوڑ سکی۔ لیکن تم یہ مت سمجھو کہ امی صرف تمہارے لیے ایسا کہتی ہیں۔ یہ بات تو سب پر لاگو ہوتی ہے۔ ہر اس انسان پہ جس سے میں دوستی کرنے کا یا کلوز ہونے کا سوچتی ہوں۔"

ماورا نے فارہ کے دل میں آئی غلط فہمی اور بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی امی کے حوالے سے فارہ اپنے دل میں کوئی میل رکھے۔

"لیکن کیوں یار! وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ دوستی تو اتنا پیارا' اتنا پاکیزہ اور اتنا خوب صورت رشتہ ہے اور وہ اسی رشتے کو ناپسند کرتی ہیں۔" فارہ کو ہمیشہ ماورا کی امی کی اس سوچ پہ تعجب ہوتا تھا۔ اس کے سوال پہ ماورا گہرا سانس کھینچ کے رہ گئی۔

"بس یار! سب کی اپنی اپنی تھنکنگ اور اپنا اپنا پوائنٹ آف ویو ہوتا ہے۔ میں یا تم کیا کہہ سکتے ہیں؟ کیونکہ کسی کے کہنے سے کسی دوسرے کی نہ تو تھنکنگ چینج ہوتی ہے نہ پوائنٹ آف ویو۔ اس لیے کچھ کہنا بے کار

ہے۔ انہیں دوستوں کا آنا جانا پسند نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ممی کبھی تمہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دی۔ خوامخواہ تمہارے آنے سے وہ الجھتی رہیں تو مجھے کیا خوشی تمہارے آنے کی؟ اگر ہماری دوستی اس آنے جانے کے بغیر بھی اچھے طریقے سے نبھ رہی ہے تو بس ہمیں اور کیا چاہیے؟ ویسے بھی تم میرے گھر نہیں آسکتیں۔ لیکن میں تو کبھی کبھار تمہارے گھر آجاتی ہوں نا؟ اور ہمارے لیے یہی کافی ہے۔" ماورا نے اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔

"لیکن ماورا۔۔۔ آنٹی کو اس پہ بندی ہے۔"

"پلیز یار! چھوڑو اس بات کو۔ کوئی اور بات کرو۔۔۔ یہ بتاؤ! تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟ انکل اور آنٹی کی کیا مصروفیات ہیں آج کل؟" ماورا نے موضوع تبدیل کردیا۔

"حماد بھائی اور جواد دونوں ٹھیک ہیں۔ حماد بھائی عشق و عاشقی لڑانے کے ساتھ ساتھ ڈیڈی کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ جواد لاہور میں ہاسٹل کے مزے لے رہا ہے۔ ڈیڈی دبئی گئے ہوئے ہیں اور ممی۔۔۔"

فارہ اپنے دھیان میں بتاتے بتاتے ممی کے ذکر پہ آکے ٹھہر گئی۔ ماورا۔۔۔ نے اس کے چپ ہوجانے پہ چونک کر دیکھا۔

"اور ممی؟" اس نے فارہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اور ممی آج کراچی جارہی ہیں۔" فارہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی بات مکمل کرنا پڑی تھی۔

"کراچی جارہی ہیں؟ کیوں سب ٹھیک تو ہے نا؟" ماورا نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔" فارہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیا مطلب۔۔۔ کیوں پتا نہیں ہے؟"

"بس! انہیں پتا تو نہیں پتا۔۔۔ رات کو سونے سے پہلے ممی میرے بیڈ روم میں آئی تھیں۔ مجھے بتانے کے لیے کہ وہ کراچی جارہی ہیں۔ میں نے بھی یہی پوچھا تھا کہ وہ کیوں جارہی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ کوئی کام ہے۔ اس لیے وہ ثمینہ آنٹی سے ملنے کے لیے جارہی ہیں۔" فارہ کے لہجے میں ہلکی تشویش اور خفگی کی آمیزش تھی۔

"پھر۔۔۔؟"

"ارے بھئی! پھر کیا۔۔۔! پھر انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ مگر میں نے انکار کردیا۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔

"ارے پاگل! انکار کیوں کردیا؟" ماورا کو حیرت ہوئی۔

"بس! دل نہیں چاہ رہا تھا جانے کو۔ اس لیے انکار کردیا۔" فارہ قدرے بےزاری سے بولی۔

"اف! اللہ رے قسمت۔۔۔ ایک میں ہوں کہ کراچی جانے کے لیے دن گن رہی ہوں اور ایک تم ہو کہ کتنے سکون اور کتنی لاپروائی سے انکار کیے جارہی ہو۔ کاش! تمہاری ممی نے یہ آفر مجھے کی ہوتی۔"

ماورا نے آہ بھرتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا۔ فارہ اس کی اس حسرت کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ ماورا کو کراچی جانے کا کتنا جنون ہے۔

"میں صرف چپل پہنتی اور دوپٹا اوڑھ کر ان کے ساتھ چل پڑتی۔ اپنا سامان باندھنے پہ بھی ٹائم ویسٹ نہ کرتی۔" ماورا خوشی خوشی اپنے خیالات بتارہی تھی۔

"اور اپنی امی کے بارے سوچا تم نے؟ وہ کیا کرتیں؟" فارہ نے اسے عافیہ بیگم کی مخالفت یاد دلائی۔

"انہیں کیا کرنا ہے بھلا؟ انہیں بھی اک دن میرے ساتھ چلنا ہے۔ میرے ساتھ رہنا ہے آخر۔" ماورا کو پورا یقین تھا۔

"ہوں! یہ تو ہے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اگر شادی کے بعد میں جاکر رہوں تو تم بھی میرے ساتھ کراچی میں ہی رہو۔ ہم دونوں دوستوں کا ساتھ ہمیشہ اسی طرح رہے۔" فارہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"اور یہ تو تب ہوگا، جب آفاق یزدانی تمہیں بیاہ کرلے جائے گا۔ ویسے کہیں تمہاری امی کا کراچی جانا اسی سلسلے کی کڑی تو نہیں ہے؟"

ماورا نے اپنا شک ظاہر کیا اور فارہ کو بغور دیکھا۔

"نہیں یار! ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ یہاں آتے۔ ممی کو وہاں نہ بلاتے۔"

"ہوں! یہ بھی عقل والی بات کہی ہے تم نے۔ لیکن یار! امیر لوگ ہو آپ۔ کچھ بھی کرسکتے ہو۔ بیٹی والوں کو گھر بلا کر بھی بات کرسکتے ہو۔" ماورا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو یار! لیکن ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ ایسی کوئی بات ہوگی۔" فارہ نے کہتے ہوئے انگریزی کلچر یونیورسٹی کے سامنے گاڑی کو بریک لگائے تھے۔

"او کے! مان لیتی ہوں، لیکن دیکھ لینا بات کوئی ایسی ہی ہوگی۔" ماورا کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر گئی۔ فارہ بھی گاڑی لاک کرکے اس کے پیچھے ہی آگئی۔ اب ان دونوں کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"آفاق۔۔۔ کہاں جارہے ہو؟"

وہ خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر کوریڈور کی سمت بڑھ رہا تھا۔ جب ثمینہ یزدانی کی آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

"جہاں روز جاتا ہوں۔" اس نے نپے تلے سے لہجے میں جواب دیا۔

"آج رہنے دو۔ آج تمہارے پاپا آفس میں سب سنبھال لیں گے۔ آج تم گھر پہ رہو۔" آفاق یزدانی ان کی بات پہ چونک گیا۔

"کیوں؟ گھر پہ کیوں رہوں؟ کوئی خاص وجہ؟"

"ہوں! خاص ہی ہے۔ وہ دراصل فیصل آباد سے منزہ آرہی ہے۔ اس لیے تم اسے ریسیو کرنے ایئرپورٹ چلے جاؤ۔" ثمینہ یزدانی نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"منزہ آنٹی آرہی ہیں؟ مگر کیوں؟" آفاق ایک بار پھر چونکا تھا۔ کیونکہ منزہ آنٹی کا ان کے گھر آنا بےمعنی نہیں ہوسکتا تھا۔ ورنہ وہ جب بھی کراچی آتی تھیں ہمیشہ حیدر ماموں کی طرف ہی آتی تھیں۔ اس لیے اس کا چونکنا بجا تھا۔

"اب مجھے کیا پتا کہ وہ کیوں آرہی ہے؟ کیا میں فون پہ ہی اس سے پوچھنا شروع کردیتی کہ وہ کیوں آرہی ہے؟" ثمینہ یزدانی سب کچھ جانتی تھیں۔ بلکہ انہوں نے خود ہی تو منزہ کو کراچی بلایا تھا۔ لیکن وہ آفاق کے سامنے جان بوجھ کر انجان بن گئیں۔

"ٹھیک ہے! وہ آرہی ہیں تو اچھی بات ہے۔ لیکن آپ مجھے کیوں روک رہی ہیں؟" آفاق اپنے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

"بتایا تو ہے کہ تمہیں ایئرپورٹ جانا ہے اسے لینے کے لیے۔" ثمینہ یزدانی جھنجلا گئیں۔

"میرا جانا ضروری ہے کیا؟ گھر میں ڈرائیور ہیں' گاڑیاں ہیں۔ آپ کسی کو بھی بھیج سکتی ہیں۔" وہ بھی جواباً جھنجلا کر ہی بولا۔

"وہ ہمارے گھر آرہی ہے۔ ہمارے لیے آرہی ہے اور ہم اسے ریسیو کرنے ڈرائیور کو بھیج دیں؟ کیا یہ مناسب لگے گا؟" ثمینہ یزدانی نے بیٹے کو شکایتی نظروں سے دیکھا۔

"پلیز مما! گاڑی ہماری ہے۔ ڈرائیور ہمارا ہے۔ ہمارے گھر آرہی ہیں تو اس میں غیر مناسب کیا ہے؟ ڈرائیور کا ریسیو کرنے کے لیے جانا غیر مناسب ہے؟ یا پھر میرا ریسیو کرنے کے لیے نہ جانا غیر مناسب ہے؟" آفاق کسی بھی صورت ایئرپورٹ نہیں جانا چاہتا تھا۔ اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں کے ساتھ الجھ پڑا۔ ثمینہ یزدانی اس کے رویے پہ روہانسی سی ہوگئیں۔ ان کا دل بھر آیا۔ وہ پہلے کبھی بھی ان سے اس طرح پیش نہیں آیا تھا۔ ہمیشہ نرمی' حلاوت اور احترام سے بات کرتا تھا۔ حد سے زیادہ حساس اور خیال رکھنے والا تھا۔ لیکن اب وہی آفاق اتنی سختی سے بات کررہا تھا کہ ثمینہ یزدانی برداشت نہیں کرپائی تھیں۔ خصوصاً "فارہ" کے حوالے سے۔

"تم جاؤ گے یا نہیں؟" انہوں نے جیسے آخری بار پوچھا۔

"ایم سوری! میں نہیں جاسکتا۔ مجھے... آفس میں ضروری کام ہے... بائے۔"

وہ لاتعلقی سے کہتے ہوئے پلٹ کر کوریڈور کی سمت بڑھ گیا تھا۔ ثمینہ یزدانی وہیں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ وہ شدید حیران تھیں کہ آخر آفاق کو ہوا کیا ہے؟ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ لیکن اب ایسا کیوں ہوگیا تھا؟ وہ فارہ کے نام پہ کھل اٹھتا تھا۔ اسے اتنا پسند کرتا تھا' اتنی محبت کرتا تھا کہ دو سال پہلے اس نے خود ہی ساری شرم ولحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے ثمینہ یزدانی سے کہا تھا کہ وہ منزہ آنٹی سے فارہ کا ہاتھ مانگ لیں اور وہ بیٹے کی ایسی شوخی' ایسی بے اختیاری پہ ایک پل بھی نہیں رہ سکی تھیں اور فوراً" منزہ سے فارہ کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔ اپنی منگنی پہ وہ بے پناہ خوش تھا اور ثمینہ یزدانی اس کی خوشی دیکھ کر اپنے اندر کا غم بھولنے لگی تھیں۔ لیکن منگنی کے فوراً بعد آفاق کا رویہ بدلتا چلا گیا۔ فارہ کے حوالے سے اس کی ساری شوخیاں اور سارے شوق بجھ کے رہ گئے تھے۔ وہ دنوں میں ہوا کے رخ کی طرح بدلا تھا اور اس کا یہ بدلنا ثمینہ یزدانی کے سینے میں گھاؤ کر گیا تھا۔

وہ سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی تھیں کہ آخر وہ کیوں فارہ کی محبت اور چاہت سے ہٹ گیا ہے؟ اسے اپنے نام کی انگوٹھی پہنانے اور اسے اپنی ذات سے منسوب کرنے کے بعد وہ ایسا سرد مہر اور لاتعلق کیوں ہوگیا تھا؟ اور اس "کیوں" پہ آکر ان کی ساری سوچیں نڈھال ہوجاتی تھیں۔ وہ پہلے ہی ایک غم کی ستائی ہوئی تھیں اور اب ایک اور غم ان کی ذات کو اپنے اذیت ناک پنجوں میں دبوچ رہا تھا۔ جس سے بچنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کررہی تھیں۔ لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوپا رہی تھی۔

"ثمینہ... کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑی ہو؟ سب ٹھیک تو ہے؟" اشتیاق یزدانی سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کے قریب آگئے۔ ثمینہ یزدانی ان کی آواز اور اپنے کندھے پہ ان کے ہاتھ کے لمس سے چونک کر متوجہ ہوئی تھیں۔

"اشتیاق..." انہوں نے روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے اشتیاق یزدانی کا بازو تھام لیا۔ وہ کافی نڈھال سی لگ رہی تھیں۔ اشتیاق یزدانی ان کے اس نڈھال انداز اور ایسی بے بس سی کیفیت کی وجہ بن کہے ہی سمجھ گئے تھے۔

"ہوں! تو وہ تمہارے روکنے پہ بھی نہیں رکا؟" وہ کافی پرسوچ اور متفکر سی آواز میں بولے۔

"اشتیاق... وہ ایسا نہیں تھا۔ وہ ایسا کیوں ہوگیا ہے؟ میری بڑی سے بڑی بات کو بھی حکم سمجھ کر سر جھکا دیتا تھا اور اب وہ میری چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ماننا تو دور کی بات' سننا بھی پسند نہیں کرتا؟ اور فارہ... اس کے تذکرے

بھی دور بھاگتا ہے۔ نام ہی نہیں سننا چاہتا۔ میں... میں منزہ سے کیا کہوں گی؟ کس منہ سے بتاؤں گی کہ میرا بیٹا اپنی محبت سے پھر گیا ہے۔ فارہ سے منہ موڑ چکا ہے وہ۔ وہ فارہ کا نہیں رہا۔ بلکہ وہ تو میرا بھی نہیں رہا اور جو انسان اپنی ماں کا بھی نہ رہے۔ وہ کسی اور کا بھی نہیں رہ سکتا۔ مجھے اس پہ بہت مان تھا۔ اشتیاق! وہ میرا مان توڑنے پہ تلا ہوا ہے۔ میں کیا کروں آخر؟"

ثمینہ یزدانی نڈھال اور شکستہ سے انداز میں کہتے ہوئے رو پڑیں اور اشتیاق یزدانی انہیں سہارا دے کر کمرے میں لے آئے۔

"دیکھو ثمینہ! آج جب وہ گھر آتا ہے تو ہم اس سے فائنلی بات کرتے ہیں۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ کن چکروں میں ہے؟ ہم سے صاف صاف بات کرے۔ کسی لڑکی میں انوالو ہے تب بھی بتائے اور اگر کوئی اور وجہ ہے تب بھی آگاہ کرے۔ ہمیں اس طرح اندھیرے میں تو نہ رکھے۔ کوئی فیصلہ تو کرے۔ کچھ بتائے تو سہی۔" اشتیاق یزدانی خود اس معاملے کو لے کر بہت پریشان رہتے تھے۔ لیکن پھر بھی ثمینہ یزدانی کو تسلی ہی دے رہے تھے۔

"اشتیاق... اس سے کہیے کہ میں اینق کا غم سینے میں دفن کیے اگر زندہ سلامت ———— ہوں تو صرف اس کی خاطر... میرے جینے کی وجہ ہے وہ... اور اگر وہی ایسا کرے گا تو کیسے جیوں گی میں؟"

ثمینہ یزدانی کے سینے میں دفن ان کے بیٹے کا غم جب زندہ ہوتا تھا تو وہ جیتے جی مرجاتی تھیں اور آج کل تو یہ غم کچھ زیادہ ہی سوا ہوگیا تھا۔ وہ دہرے غم' دہری اذیت کا شکار تھیں۔ غم سہنا مشکل ہوگیا تھا ان سے۔

☼ ☼ ☼

اس شان دار سے "حیدر ولا" میں سورج ہر روز اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ایک نئی نویلی صبح لے کر اترتا تھا۔ "حیدر ولا" میں اس نئی نویلی صبح کا استقبال بڑی شان و شوکت اور بڑے اہتمام کے ساتھ ہوتا تھا۔

اور یہ ساری شان و شوکت اور یہ سارا اہتمام صرف اور صرف رضا حیدر کے لاڈلے بیٹے تیمور حیدر اور لاڈلی بیٹی عزت حیدر کی خاطر ہوتا تھا۔

جو بذات خود حیدر ولا کی شان و شوکت کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کو دیکھ کر رضا حیدر کا سینہ کئی انچ اور چوڑا ہوجاتا تھا۔

اس وقت بھی وہ بڑے سے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں ڈائننگ ٹیبل کی بالکل سامنے والی کرسی پہ بڑے شاہانہ انداز میں براجمان اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب تیمور حیدر ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے کافی اونچی آواز میں سلام کیا۔ تاکہ اخبار پڑھنے میں محو رضا حیدر بھی اس کا سلام سن لیں۔

"وعلیکم السلام بیٹا جی... آؤ آؤ' بیٹھو یہاں۔ آج اتنے لیٹ کیوں اٹھے ہو؟" انہوں نے فوراً" ہی اخبار تہہ کرکے رکھ دیا۔

"جی! وہ دراصل آج مجھے آفس نہیں جانا۔" تیمور ان کو بتاتے ہوئے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔

"کیوں' خیریت؟" وہ پوری طرح سے اپنے بیٹے کی سمت متوجہ ہوگئے۔

"جی! کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے۔ دو گھنٹے بعد فلائٹ ہے۔" اس نے وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ جس کی سوئیاں اس وقت صبح کے آٹھ بجا رہی تھیں۔

"اچھا! کچھ دن اسٹے کروگے یا واپس آجاؤ گے؟"

"نہیں! اسٹے کرنا تو مشکل ہے۔ میری کوشش ہے کہ آج رات تک ہی واپس آجاؤں۔ لیکن اگر نہیں آسکا تو

پھر کل ان شاء اللہ لازما" آجاؤں گا۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

"کہاں جارہے ہو بیٹا؟" رابعہ بیگم ابھی ابھی کچن سے نکل کر ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تھیں اور ان کی سماعتوں کو تیمور کے کہیں جانے کا ذکر سنائی دیا تھا۔

"السلام علیکم مما!" اس نے انہیں دیکھ کر فورا" کھڑے ہو کر کرسی پیش کی۔

"ہاں! تو کہاں جانے کی بات ہو رہی تھی؟" انہوں نے جواب دے کر دوبارہ استفسار کیا۔

"اسلام آباد جارہا ہوں۔ کسی کام کے سلسلے میں۔" ان کے بیٹھنے کے بعد وہ خود بھی بیٹھ گیا۔

"اچھا! کب جانا ہے؟"

"جی! دس بجے۔"

"اور واپس کب آؤ گے؟"

"واپسی کنفرم نہیں ہے۔ شاید آج یا شاید کل۔"

"جب گھر سے باہر جاتے ہو تو فون پہ بتاتے رہا کرو کہ کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ آج کل کے حالات کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ تم آفس کے لیے بھی نکلتے ہو تو مجھے دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ یہ تو پھر تم شہر سے باہر جارہے ہو؟" رابعہ بیگم اس کے کہیں جانے کا سن کر پریشان اور متفکر سی ہو جاتی تھیں۔

"ارے مما! ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوتا۔ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہوتا وہی ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ہم بے شک ہزاروں تدابیر کرتے رہیں۔" اس نے ماں کا ہاتھ تھپکتے ہوئے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہیلو۔ گڈ مارننگ!" اچانک ڈائننگ ہال میں ساشا کی آواز ابھری۔ ان تینوں نے بیک وقت چونک کر دیکھا۔

"سیم ٹو یو ڈیر!" جوابا" تیمور نے اسے وش کیا۔

"واؤ! تو آج ہمارے مصروف ترین کزن تیمور حیدر بھی گھر پہ نظر آرہے ہیں؟ واؤ حیرت کی بات ہے؟" ساشا نے حیرت کا اظہار کیا۔ کیونکہ تیمور زیادہ تر اپنے بزنس میں مصروف رہتا تھا۔ اس لیے سب کزنز سے ملاقات بھی ذرا کم ہی ہوتی تھی اور جب بھی ہوتی تھی تو وہ سب اس کی مصروفیات کا شکوہ ضرور کرتے تھے۔

"ہوں! اب تو مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ میں گھر پہ ہوں۔" تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اف! ایسی شان دار پرسنالٹی اور وہ بھی اتنی خشک۔ افسوس ہوتا ہے کبھی کبھی۔" ساشا نے تاسف سے سر ہلایا۔ تیمور کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"ایسی شاندار پرسنالٹی اگر رنگین ہو تب بھی لوگوں کو افسوس ہی ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ لوگ نہ زاہد کو جینے دیتے ہیں نہ رند کو۔" تیمور نے ساشا سے بھی زیادہ تاسف کا اظہار کیا۔ اس کی بات پہ رابعہ بیگم اور رضا حیدر بھی مسکرا اٹھے۔

"ماموں! آپ کتنے سکون میں ہیں؟ کیا آپ کو کوئی فکر نہیں ہے کہ آپ کا اتنا خوب صورت، ہینڈسم اور جوان بیٹا ابھی تک کنوارا اور چھڑا چھانٹ پھر رہا ہے؟ کیا آپ کو کبھی بہو کی خواہش نہیں ہوئی؟ کیا آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ آپ کے بیٹے کے ساتھ والی کرسی خالی ہوتی ہے؟"

ساشا کے اتنے سنجیدگی سے کیے گئے سوال پہ تیمور کے ساتھ ساتھ رضا حیدر خود بھی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ کیونکہ ساشا کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

"بیٹا! میں تو تب ہی کچھ کر سکتا ہوں نا، جب یہ کسی کو پسند کرے گا۔ جب یہ کسی کو پسند ہی نہیں کر رہا تو میں اپنی خواہش کو لے کر کہاں جاؤں؟"

رضا حیدر نے مایوسی اور معذوری کا اظہار کیا اور یہ سب سچ بھی تھا۔ وہ تو کئی بار اس کو شادی کا اور کسی لڑکی کو

پسند کرنے کا کہہ چکے تھے۔ لیکن تیمور حیدر کی نظر سے فی الحال ایسی کوئی لڑکی نہیں گزری تھی، جو اس کے جذبات، احساسات اور دل کو چھو جاتی اور وہ دل کے ہاتھوں مجبور اور بے تاب ہو کر اسے پسند کرتا یا اس سے شادی کرتا۔ وہ ابھی تک اپنے ان چھوئے اور کورے کاغذ جیسے دل کو لیے آزاد پھر رہا تھا۔ ہر طرح سے آزاد اور بے فکر۔

"کیوں تیمور بھائی؟ آپ کیوں ماموں اور ممانی کی خواہش پوری نہیں کرتے؟ آخر آپ ان کے اکلوتے سپوت ہیں؟" ساشا کا رخ اب تیمور کی طرف ہو چکا تھا۔

"دیکھو ڈیر! اتنی لمبی چوڑی بحث میں پڑنے سے پہلے بہتر ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ تم صبح صبح یہاں کیوں آئی ہو؟" تیمور حیدر نے بڑی مہارت سے اس کی بات کا رخ موڑ دیا۔ ساشا اپنے سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی۔

"او مائی گاڈ! میں فضول میں ٹائم ویسٹ کیے جارہی ہوں۔ مجھے تو ابھی ایئرپورٹ بھی جانا ہے۔"

"ایئرپورٹ۔ ؟ کیوں کون آرہا ہے؟" تیمور جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے ٹھٹک گیا۔

"فیصل آباد سے منزہ آنٹی آرہی ہیں، ثمینہ آنٹی سے ملنے کے لیے۔ آفاق بھائی کو آفس میں کوئی ضروری کام تھا۔ اس لیے وہ جلدی چلے گئے ہیں اور ثمینہ آنٹی نے مجھے فون کیا ہے کہ میں انہیں ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے چلی جاؤں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ عزت کو بھی ساتھ لے لوں۔" ساشا نے کندھے اچکاتے ہوئے بتایا۔

"منزہ آرہی ہے؟ خیریت تو ہے نا؟" رضا حیدر کو بہن کی اچانک آمد کا سن کر تشویش ہوئی۔

"مجھے تو یہی پتا ہے کہ ثمینہ آنٹی سے ملنے کے لیے آرہی ہیں۔ اب اصل ریزن کیا ہے، یہ مجھے نہیں پتا۔" اس نے لاعلمی ظاہر کی۔

"منزہ نے ہمیں بھی نہیں بتایا کہ وہ آرہی ہے۔ ورنہ ہمیشہ تو وہ یہاں ہمارے گھر ہی آتی ہے؟" رابعہ بیگم کو بھی حیرت اور تشویش ہوئی تھی۔

"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں ممانی جان! جب وہ آئیں گی تو پوچھ لیجئے گا۔"

"ہوں! پوچھنا تو ہے۔" رابعہ بیگم کو نند کے حوالے سے فکر ہو رہی تھی۔

"گڈ گڈ! ضرور پوچھیے گا، لیکن فی الحال مجھے اتنا بتا دیجئے کہ عزت صاحبہ کہاں ہیں؟" ساشا نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو یونیورسٹی چلی گئی۔"

"واٹ۔ ؟ یونیورسٹی؟ اف! اس مصیبت سے بچنے کے لیے تو میں نے اس کے سیل پہ کال کی تھی۔ لیکن اس کا سیل شاید آف جارہا تھا۔" ساشا کو جیسے دھچکا لگا تھا۔

وہ صرف اس کی خاطر پندرہ منٹ کا سفر طے کر کے ایئرپورٹ جانے کے بجائے یہاں آئی تھی کہ اسے ساتھ لے لے گی تو ٹائم اچھا گزر جائے گا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی اتاؤلی لڑکی آٹھ بجے گھر سے نکلنے کے بجائے پونے آٹھ بجے چلی گئی تھی۔

"عزت جیسے جلد باز، بے صبرے اور من موجی لوگوں سے دوستی کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے، دیکھتے رہ جاتے ہیں۔"

تیمور ساشا کی حالت پہ مسکراتے ہوئے بولا ساشا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عزت اس کے سامنے ہو اور وہ اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دے۔ اس کی ساری جلد بازی نکال دے۔ لیکن وہ اس وقت بے بس تھی۔ اسی لیے مایوسی سے قدم واپس موڑ لیے۔

"بیٹا! ناشتا نہیں کرو گی؟" رابعہ بیگم نے اسے روکنا چاہا۔

"کر لیا ہے ممانی جانی! اور ہضم بھی ہو گیا ہے، خدا حافظ۔"

وہ کہہ کر باہر نکل گئی تیمور ساشا کی کیفیت پہ مسکراتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے خود اسلام آباد جانے کے لیے نکلنا تھا اور ابھی تیار بھی ہونا تھا۔ ورنہ وہ خود منزہ پھوپھو کو ریسیو کرنے چلا جاتا۔ لیکن فی الحال مجبوری تھی۔ وقت قلیل تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نعرہ مستانہ
میں نعرہ مستانہ
میں شوخی رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں؟
میں تشنہ۔۔۔
میں تشنہ کہاں جاؤں؟
پی کر بھی کہاں جانا؟
میں نعرہ مستانہ

بے حد خوب صورت میوزک کے حصار میں گونجتی عابدہ پروین کی آواز گاڑی ڈرائیو کرتی عزت حیدر کو بھی جھومنے پہ مجبور کر رہی تھی۔ اس کی دودھیا مخروطی انگلیاں اسٹیئرنگ پہ بڑے مست انداز میں متحرک رہی تھیں۔ اس کی کلائیوں میں سجے بریسلٹ بھی اس کی اس مستی پہ جھوم رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کیفیت رقص میں ہو وہ جب بھی یہ صوفیانہ کلام سنتی تھی تو اس کی میوزک آواز اور شاعری کے پراثر احساس میں رچ بس جاتی تھی۔ اس گانے کے مصرعے اس کے دل پہ اثر کرتے تھے۔ وہ اک طلسم اک سحر میں آجاتی تھی اور اس میوزک کے علاوہ سب کچھ پس منظر میں چلا جاتا تھا۔

وہ ہر بات سے بے نیاز ہو کر اس گانے کے فسوں میں گم ہو جاتی تھی اور اس وقت بھی اس پہ کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے یہ کلام پوری آواز سے سن رہی تھی۔ وہ آج گھر سے ذرا جلدی نکل آئی تھی۔ اس لیے یونیورسٹی پہنچنے کی ذرا بھی جلدی نہیں تھی۔ تب ہی تو وہ انتہائی سکون سے ڈرائیو کرتے ہوئے انجوائے کر رہی تھی۔ یہ اس کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ وہ جب بھی موڈ میں ہوتی تو یوں ہی فل میوزک آن کیے گاڑی بھی سڑکوں پہ آوارہ چھوڑ دیتی تھی اور ایسے میں ذرا بھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ شہر کے نامور بزنس مین تیمور حیدر کی بہن ہے۔

وہ تیمور حیدر جس کی سنجیدہ ریزروسی شخصیت کے سامنے کچھ بولتے ہوئے اکثر لوگ ہچکچا جاتے تھے اور اسی تیمور حیدر کی بہن اتنی شوخ، چنچل اور جذباتی تھی کہ تیمور کبھی کبھی خود بھی سر تھام کے بیٹھ جاتا تھا۔ جبکہ رضا حیدر بیٹی کی شوخیاں، شرارتیں، لاڈ اور ناز نخرے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ عزت ان کی بہت کرماں والی بیٹی تھی۔ بڑی دو بیٹیوں سے بھی زیادہ۔
ایک تو یہ کہ وہ سب بہن بھائیوں سے چھوٹی تھی۔

روک ٹوک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی من مانی بھی خوب کرتی تھی۔ اس کی دوستوں اور کلاس فیلوز کو اس پہ رشک آتا تھا۔ اس جیسا من چاہا لائف اسٹائل تو ہر لڑکی کی خواہش تھی وہ خوش قسمت تھی، جو بنا خواہش کیے ہی یہ لائف اسٹائل جی رہی تھی۔ اس کے دن رات، موج و مستی میں گزرتے تھے۔ لاکھوں روپیہ تو وہ پاکٹ منی کے نام پہ اڑا دیتی تھی۔ اس کی سہیلیاں اور کلاس فیلوز اس کی لاپروائی اور مستیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی تھیں۔ اس کے موڈ کی جولانیاں جب عروج پہ ہوتی تھیں تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس وقت بھی اس کا موڈ کچھ ایسا ہی تھا۔

جیسے ہی اس نے یونیورسٹی کے روڈ کی طرف موڑ کاٹا تو ساتھ ہی اس نے گاڑی کی رفتار بھی بڑھا دی تھی۔ کیونکہ اس کا پسندیدہ میوزک بھی ختم ہو چکا تھا۔ اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پہ مرکوز کر دی۔ وہ بھی پارکنگ تک پہنچ ہی گئی۔ اس کے راستہ بنانے پہ دو تین اور لوگوں کو بھی راستہ مل گیا تھا۔

”شکر ہے! راستہ تو ملا۔“ عزت کے پیچھے والی گاڑی میں ایک لڑکا اور لڑکی راستہ ملنے پہ شکر ادا کر رہے تھے اور عزت کی کارکردگی پہ خوش بھی ہو رہے تھے۔ عزت خود بھی مسکراتی ہوئی گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ گاڑی سے اپنا بیگ نکال کر گاڑی مقفل کی اور پیچھے پلٹ آئی۔ ان دونوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سراہا۔ وہ دونوں میڈیکل ڈپارٹمنٹ کے ذہین ترین اسٹوڈنٹ تھے۔ رشتے میں دونوں کزن اور منگیتر تھے۔ اسی لیے وہ دونوں یونیورسٹی میں سب کی توجہ کا مرکز اور مذاق کا نشانہ ہوتے تھے۔ عزت بھی جانتی تھی ان کو اس لیے دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے پارکنگ سے نکل گئی۔ لیکن وہ یونیورسٹی کے مین گیٹ تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ اس کے پیچھے ایک انتہائی تباہ کن دھماکا ہوا تھا۔ جس سے زمین و آسمان ہل کے رہ گئے تھے۔ اس دھماکے کی آواز اور دھمک اتنی شدید تھی کہ عزت کے ساتھ ساتھ کئی اور لوگ بھی زمین پہ چلتے ہوئے لڑکھڑا گئے تھے۔ یوں جیسے نیچے سے زمین سرک گئی ہو۔

اس نے ایک دم پیچھے پلٹ کر دیکھا اور اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ جیتے جاگتے انسان بے جان چیزوں کی طرح ادھر ادھر گر رہے تھے۔ خون اور انسانی اعضا کے بکھرنے کا یہ قیامت خیز منظر عزت حیدر کو خوف اور دہشت سے پاگل کر گیا۔ وہ بے ساختہ دونوں ہاتھ منہ پہ رکھے چیخ رہی تھی۔ اس وقت اس کا خود پہ کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں۔ اس کے سامنے قیامت مچی ہوئی تھی۔ اک کہرام سا تھا۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ تڑپ رہے تھے۔

پانچ منٹ کے اندر اندر پولیس، میڈیا اور رضا کار وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس قیامت اور حشر کے میدان میں انسانوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ بم وہاں بلاسٹ ہوا تھا، جہاں عزت نے گاڑی پارک کی تھی۔ کیونکہ وہاں اس کے ساتھ ہی ایک اور گاڑی پہلے سے پارک شدہ تھی اور وہی گاڑی خودکش بم دھماکے کے مواد سے بھری ہوئی تھی۔ اللہ کی رضا سے عزت تو وہاں سے محفوظ و مامون نکل آئی تھی۔ لیکن وہاں گاڑی پارک کرتے وہ دونوں لڑکا لڑکی نہیں بچ سکے تھے۔ جب ان دونوں کو بے جان جسموں کی طرح اسٹریچر پہ ڈال کے کچھ رضا کار پاس سے گزرے تو عزت اور بھی بے اختیار ہو گئی۔ اس کی چیخوں پہ کسی نے بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ مگر ایک اخباری نمائندہ ولید رحمان عجلت میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتے ہوئے اسے چلاتے ہوئے دیکھ کر ایک دم چونک کے ٹھہر گیا تھا۔

”عزت۔۔۔؟“

وہ اسے پہچان چکا تھا۔ وہ اتنے کہرام میں اکیلی کھڑی پاگلوں کی طرح دہشت زدہ چیخ رہی تھی۔ ولید لپک کے اس کے پاس آیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سلویٰ علی بٹ

"عطیہ! پورے دو بجے افضال کی کال آئے گی۔"
نسیم نے ایک بجے سے لے کر اب تک چوتھی بار یہ جملہ بولا تھا۔ اب کی بار اس میں تنبیہہ، تاکید اور حکم کی سختی تھی۔ چولہے کے قریب کھڑی نازیہ کا فیڈر بناتی عطیہ نے ایک لمبی سانس خارج کی اور وال کلاک کی طرف نگاہ ڈالی۔ دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ صبح سے نسیم مضطرب اور عطیہ ۔ سست اور مضمحل تھی۔ انہونی کا خوف اور عجیب سا بوجھل پن طبیعت کو مکدر کیے ہوئے تھا۔

اس نے نازیہ کے منہ میں فیڈر دیا۔ وہ فیڈر لیے اندر بیڈ پہ لیٹنے چلی گئی۔ عطیہ فون اسٹینڈ کے قریب پڑی چیئر پہ آبیٹھی۔ اسی ٹیلی فون سیٹ پہ اس کے شوہر افضال کا سعودی عرب سے فون آتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس دور جدید کے تقاضوں کے مطابق اس کے پاس موبائل نہیں تھا۔ لیکن آج کا فون کسی خاص مقصد کے لیے تھا۔ برآمدے میں لگے فون سیٹ پہ اس لیے آتا تھا۔ تاکہ نسیم بھی ساری گفتگو با آسانی سن اور سمجھ سکے۔ افضال کو ایسا کرنے کی تاکید بھی اس کی ماں نے کی تھی۔

صبح وہ سو کر اٹھی تو اس کی ساس نے اطلاع دی کہ آج افضال کی کال آئے گی۔ حالانکہ کل شام نسیم جب پچھلی گلی میں مقیم اپنی بیٹی کے گھر گئی تھی اس نے تب ہی اندازہ لگالیا تھا۔ نسیم کو اپنے پردیسی بیٹے کو بہو کے خلاف یا چھوٹے بہن، بھائیوں کے حقوق یاد دلانے ہوتے تو وہ بیٹی کے گھر جاکے اسے تسلی سے فون کرتی تھی۔

کل صبح ہی عطیہ اور نسیم کی ہلکی سی جھڑپ ہوئی تھی۔

عطیہ کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کے ابھر رہا تھا۔ دو بجنے میں اب بارہ منٹ باقی تھے۔ افضال وقت کا بہت پابند تھا۔ کرسی کی پشت پہ سر ڈالے، وہ بارہ منٹ گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔

اسے آنے والے لمحات کا ڈر، اذیت میں مبتلا کررہا تھا۔ وہ کسی قسم کی قیاس آرائی سے خود کو بمشکل روک پارہی تھی۔ اسی کشمکش میں مبتلا وقت اسے بہت پیچھے لے گیا۔ وہ پندرہ سال کی تھی۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہوا۔ وہ بڑے دو بھائیوں اور بہنوں سے چھوٹی اور باپ کی بہت لاڈلی تھی۔ باپ نے آنکھیں بند کیں تو اس نے ماں کی نرم گرم آغوش میں پناہ ڈھونڈلی۔ لیکن یہ آغوش اسے محض دو برس ہی چھپاپائی۔ وہ بلک بلک کے روئی۔ دلاسا دینے کے لیے بہنیں، بھائی اور بھابھیاں، سب ہی موجود تھے۔ وہ ان کے مضبوط دلائل اور چرب زبانی سے بہل گئی۔

ماں کا غم ہلکا ہوا تو زندگی بہت بھاری لگنے لگی۔ بالکل ایک سل کی مانند جسے اس کا نازک سا وجود ہٹاتا تو دور اس کا نازک سا وجود سرکا بھی نہ پاتا۔

ماں کے ہوتے اس نے خون کے رشتوں کو سمجھنے کا کبھی تردد نہیں کیا تھا۔ اسے رویوں اور لہجوں میں مین میخ نکالنا نہیں آتی تھی۔

ماں گئی تو اس کے ساتھ سب کا خلوص و مروت بھی جاتا رہا۔

وہ یکسر بدلتے حالات کے لیے ذہنی طور پر کب تیار تھی۔ پاؤ پکتا تو اس کی پلیٹ میں صرف چاول آتے بوٹیاں باقی سب میں برابر تقسیم کردی جاتیں۔ اس کا حصہ رکھنے کی کبھی کسی نے زحمت گوارانہ کی۔ بازاری ناشتا آتا تو سب اپنے حصے کی پلیٹیں بھر لیتے۔ اس کے دسترخوان تک آتے چنگیر اور کٹوریوں میں بچا کھچا ہی منہ چڑا رہا ہوتا۔

سب سیزن کے کپڑے بنواتے، اس کی باری آنے تک سیزن ہی گزر جاتا۔ اس نے ہمیشہ ماں سے لینا اور مانگنا سیکھا تھا۔ بلکہ ماں اکثر خواہش اور ضرورت بنا کہے ہی پوری کردیتی تھی کل، ماں بھی تو ان ہی بیٹوں سے لے کر پورا کرتی تھی۔ لیکن اب ترجیحات بدل گئی تھیں۔ بھائیوں کی ایک مکمل فیملی تھی۔ جس میں وہ مس فٹ اور اضافی بوجھ تھی۔

اشد ضرورت کے تحت وہ بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی تو اگلی پہلی کا وعدہ ہتھیلی میں ڈال دیا، جو کبھی ایفا نہ ہوتا۔

اس نے بارہا مرتبہ دبے الفاظ میں بیاہی بہنوں سے شکایت کی۔ وہ الٹا اسے سمجھانے بجھانے اور بڑھتی مہنگائی اور محدود آمدنی کے قصے سنانے بیٹھ جاتیں۔ وہ بھی مجبور تھیں۔ ان ہی بھائی اور بھابھیوں کے دم سے ان کا میکہ آباد تھا۔ وہ سسرال میں اپنا بھرم برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔

عطیہ مڈل پاس تھی۔ ورنہ وہ اپنے روزگار کے لیے ضرور کوشش کرتی۔ بہرحال وہ ہمت نہیں ہاری۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ماں کے پرانے لوہے کے سبز بکسے کو اسٹور سے باہر دھکیلا اور اس میں سے سلائی مشین نکالی اور سامنے والی آنٹی عمارہ کے صحن میں جا دھری۔ جہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں سلائی کا ہنر سیکھنے آتی تھیں۔ ان میں ایک اس کا بھی اضافہ ہو گیا۔

عمارہ آنٹی بوتیکس کے کپڑے سلائی کرتی تھیں۔ اس نے بھی دل جمعی سے کام سیکھنا شروع کر دیا اور صرف سال بھر میں وہ ہر طرح کے فیشن، ڈیزائن اور علاقائی کپڑے سینا سیکھ گئی تھی۔ اس نے بڑی عقل مندی اور صبر سے اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ نہ کسی سے شکوہ نہ شکایت۔ محلے کے لوگ عمارہ آنٹی سے کپڑے سلوانے کے لیے ترستے تھے۔ لیکن ان کے پاس بوتیکس کا رش بہت زیادہ ہوتا تھا۔ وہ ان سے معذرت کر لیتیں۔ اب محلے والوں کی یہ خواہش عمارہ آنٹی کی شاگردہ عطیہ بآسانی پوری کر رہی تھی۔

اس کے پاس کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ اسے سر کھجانے کی حتیٰ کہ گھر کے کسی کام میں ہاتھ بٹانے تک کی فرصت نہ ملتی۔

بھابھیوں نے بھی کبھی اعتراض نہ کیا۔ کیونکہ عطیہ ان کے اور بچوں حتیٰ کہ ان کے بھی بہن بھائی اور آل اولاد کے کپڑے مفت سی دیا کرتی اور ان کی مفت میں نور بن جاتی۔ پھر وہ سلائی کے پیسوں سے فضول خرچی نہیں کرتی تھی۔ وہ پیسے جمع کر کر کے اپنا جہیز اور زیور بنا رہی تھی۔ اس کی نسبت ماموں کے گھر طے تھی۔

جب اس کا جہیز مکمل ہو گیا تو اس نے خالہ اور بڑی بہن کو بتا دیا اور انہوں نے فیصل آباد فون کر کے ماموں کو۔

یوں وہ بیاہ کے ماموں کے گھر آ گئی۔ ساتھ ہی اس کی مشین بھی۔

اپنی ماں کی اس مشین سے اسے عقیدت سی ہو گئی تھی۔ اس نے آڑے وقت میں اسے ضروریات زندگی کے لیے روزگار مہیا کیا تھا۔

اس کا شوہر فیکٹری میں ملازم تھا۔ شروع کے چند ماہ بہت خوب صورت اور خواب کی سی کیفیت میں گزرے۔ وہ بہت باشعور اور سلیقہ مند تھی۔ وہ سارا وقت اپنے گھر کو سجانے اور سنوارنے، رشتوں کا احترام و خدمت کرنے اور شوہر کے انتظار میں گزار دیتی۔ اسے اپنی زندگی کا یہ رخ بہت اچھا اور پرسکون لگتا تھا۔

افضال ہر ماہ تنخواہ میں سے ایک مخصوص رقم بطور ماہانہ جیب خرچ تھما دیتا۔ اگرچہ رقم بہت تھوڑی سی ہوتی۔ صرف چند سو، لیکن وہ اپنے شوہر کی محنت کی کمائی کو حق سمجھ کر وصولتی۔ اس نے کبھی افضال سے بے جا فرمائش یا ضد نہ کی۔ وہ تھوڑے پہ ہی قناعت کر لیتی۔

مگر اس کی یہ خوشی صرف چند ماہ ہی قائم رہ سکی۔ پھر نسیم ہر ماہ واپسی کے وعدے پہ پیسے نکلوا لیتی یا وہ کچھ کھانے کی فرمائش کرتی تو اسے جتایا جاتا کہ وہ اپنے جیب خرچ سے یہ عیاشیاں کرے۔

اس کی چھوٹی نند نے کالج میں داخلہ لیا تو اس کا یہ معمولی سا جیب خرچ بھی بند ہو گیا۔ اس گھر کے تمام حالات اس کے سامنے تھے۔ وہ کس کو قصوروار ٹھہراتی۔ افضال خود اس سے شرمندہ سا تھا۔ کمانے والے سسر اور اس کا شوہر ہی تھے، دیور ابھی کام سیکھ رہا تھا گویا آمدنی کم تھی اور اخراجات زیادہ۔

اس نے ایک بار پھر سمجھوتا کر لیا اپنے گھر کے سکھ و آرام، شوہر اور آنے والے بچے کے لیے۔ اس نے دن رات کی تمیز کیے بغیر محنت کی۔ اس بار بھی اس نے سوچ بچار کے بعد ایک مقصد باندھ لیا تھا کہ وہ افضال کو سعودی عرب اپنے چھوٹے بہنوئی کے پاس بھجوائے گی۔

افضال اس کی جانفشانی کا قدردان تھا۔ ساس بھی اس کی ہمت بندھاتی۔ اس پہ گھر کے کاموں کا بوجھ کم کر دیا گیا۔ تاکہ وہ سہولت سے اپنا مشن جاری رکھ سکے۔

عطیہ نے کمیٹیاں ڈالیں۔ بچتیں کیں۔ مشین کی ہر وقت کی گھرر گھرر سے اس کے سر میں درد اور بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا۔ لیکن اس کی ہمت نہ ٹوٹی۔

اس مشین نے پھر اس کا مان رکھ لیا تھا۔ اس کی بدولت وہ ایک بار پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے محفوظ رہ گئی تھی۔ جن ہاتھوں میں ہنر ہو، وہ کسی کے آگے نہیں پھیلتے۔ اب گھر کے دوسرے افراد بوقت ضرورت اس کے محتاج رہنے لگے۔ اس نے بھی کبھی مدد کرنے سے انکار نہ کیا۔

یہ اس کی شب و روز کی محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ اس نے افضال کو سعودی عرب بھجوانے کے لیے رقم کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس نے کمیٹیاں ڈالی تھیں۔ اپنا زیور بیچ دیا۔ رشتے داروں سے ادھار مانگ کر ویزے کے پیسوں کا بندوبست کر لیا۔

اور وہ آخری رات جب افضال کو صبح لاہور ایئر پورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ وہ کیسے بھلائی جا سکتی تھی۔

"میں تمہارا اتنا ممنون ہوں کہ الفاظ میں اپنے جذبات بیان نہیں کر سکتا۔ میں تمہارا یہ قرض کیسے اتاروں گا۔ سب تمہاری لگن اور محنت کی وجہ سے ہوا ہے۔" وہ مخمور لہجے میں اس کا ہاتھ تھامے بڑی محبت سے کہہ رہا تھا۔

عطیہ ابھی اتنی تنگ نظر نہیں ہوئی تھی کہ سارا کریڈٹ خود ہی لے لیتی۔

"نہیں افضال! اس سب میں ممانی جان کا بھی حصہ ہے۔ اگر وہ میری پشت پناہی نہ کرتیں تو میں کچھ بھی نہ کر پاتی۔ میں سلائی کرتی تھی تو وہ اپنی بیٹیوں کو ساتھ لگا کے گھر کے کام کرتیں۔ آپ کی دونوں بیٹیاں ان ہی کی گود میں پلی ہیں۔ انہوں نے مجھے ہر طرح کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا۔ تاکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکوں۔ انہوں نے مجھے بچت کرنا سکھایا اور اب انہوں نے ہی رشتے داروں سے ادھار مانگ کر ویزے کی رقم پوری کی ہے۔ آپ کو ان کا بھی ممنون ہونا چاہیے۔"

وہ اس کے جذبوں کی حدت سے پگھلتی نظریں جھکائے دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہی تھی۔

"تم بہت عظیم ہو عطیہ! میں تمہارا یہ قرض ضرور اتاروں گا اور اتنی محنت کروں گا کہ تمہاری ہر خوشی اور خواہش پوری کر سکوں۔ تمہیں۔۔۔"

"صرف ایک خواہش افضال۔" اس نے بہت نرمی سے شوہر کو ٹوک دیا تھا۔

"کون سی؟" اس کا لہجہ سرگوشیانہ تھا۔

ان کمزور لمحات میں وہ ہر خواہش اور وعدہ لینے کو راضی تھا۔ اپنے زور بازو پہ وہ اپنے مستقبل کو روشن کرنے کا عزم کر چکا تھا۔

یہ حوصلہ اسے اس کمزور سی عورت نے دیا تھا۔

"آپ سیٹ ہو جائیں گے۔ قرض اتر جائے تو میں سلائی چھوڑ دوں گی۔" اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ہاں ضرور عطیہ! میں تمہارے کہنے سے قبل ہی یہ ارادہ کر چکا ہوں۔ اب تمہیں مزید مشقت نہیں کرنے دوں گا۔ اپنی ضروریات کا بوجھ میری کمر پر ڈال دو۔ میں بخوشی یہ بوجھ ڈھونڈنے کو تیار ہوں۔ میں تمہارے احسانوں کا بدلہ، تمہیں آرام و سکون دے کر ہی اتار سکتا ہوں۔" اس نے ایک عزم کے ساتھ دل سے وعدہ کر لیا۔

اس وعدے کو ایفا کرنے وہ سعودی عرب جا بسا۔

عطیہ کے بہنوئی نے نوکری اور رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ حالات بہتر ہونے لگے۔ بیرونی قرضہ بھی اتر گیا۔ عطیہ نے جو کمیٹیاں ڈالی تھیں۔ وہ بھی ختم ہو گئیں۔

کچھ شوہر کی جدائی اور کچھ ہر وقت کا مشین پہ بیٹھے رہنا، اس کا بلڈ پریشر اور شوگر دوائیوں سے بمشکل کنٹرول ہو پاتا۔

ڈاکٹر نے اسے اعصابی کمزوری کے پیش نظر سلائی چھوڑنے کا مشورہ دے دیا۔

عطیہ نے ڈاکٹر کی یہ ہدایات شوہر تک پہنچادی۔ افضال کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ نسیم نے بھی کچھ نہ کہا۔ اس نے مشین صاف ستھری کر کے سبز بکسے میں ڈال کے بند کردی۔ اب وہ ہر آنے والے گاہک کو واپس کردیتی۔

اعتراض کا طوفان پانچ دن بعد اٹھا تھا۔ جب افضال کے ہزاروں میں سے اس نے پانچ ہزار ماہانہ خرچے کا مطالبہ کردیا۔ نسیم نے اسے نرم لفظوں میں سمجھایا کہ یہ بہت زیادہ ہیں۔ لیکن اب عطیہ کے پاس بھی سو حیلے تھے۔ شوگر' بلڈ پریشر' بچوں پہ توجہ کی کمی' بچیوں کی اسکولنگ' سو ضروریات تھیں۔

اب وہ بڑے دھڑلے سے شوہر کی کمائی سے اپنا حق وصولنا چاہتی تھی۔

کل صبح جب اس نے ایک عورت کو سلائی کے لیے منع کیا اور پھر سے پانچ ہزار مانگے تو نسیم' عطیہ سے الجھ پڑیں۔

وہ نہ جانے مزید کیا کیا سوچتی رہتی کہ دو بج گئے اور فون سیٹ کی گھنٹی بجی۔

وہ اپنے خیالات سے بری طرح چونکی۔ اس نے تھوک نگلا اور کلپتے ہاتھوں سے فون اٹھالیا۔

"ہیلو۔ السلام علیکم افضال۔" اس نے سلامتی بھیجنے میں پہل کی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟" بہت دھیما اور سنجیدہ سا لہجہ۔ شوہر کے ساتھ آٹھ سال بتائے تھے۔ اس کے ہر ہر انداز سے بخوبی ازبر تھے۔ وہ چیخنے چلانے والی بات بھی رسان اور نرمی سے کرنے کا عادی تھا۔

"تمہیں پانچ ہزار ملے ہیں؟" اس نے لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھی تھی۔

"جی ہاں!" وہ مختصر ہی جواب دے پائی۔

"عطیہ! میں کوئی تمہید نہیں باندھوں گا۔ نہ ہی کوئی لمبے چوڑے عہد' نہ ہی آس دلاؤں گا۔ یہ میری قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ یہ لمحات ہمارے بیچ در آئے ہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم بہت عظیم عورت ہو۔ بالکل سچ کہا تھا۔ مگر جو بھی عہد کیے تھے' وہ سب جھوٹ تھے۔ عطیہ! تم ہر مشکل وقت میں میری ڈھال بنی رہی ہو۔ تم میرا مضبوط آسرا ہو۔ لیکن میں۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں تمہاری ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔"

"نہیں افضال! آپ اس قابل ہیں۔" اس نے ٹوٹے ہوئے شکستہ لہجے میں شوہر کو یاد دلایا۔

"نہیں۔" اس کے یک لفظی جواب نے بہت کچھ توڑ دیا تھا۔ مان' اعتبار' بھرم' وعدہ اور دل پر سے اختیار۔

"میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی اور تم بہت بدنصیب کہ میں ایک کمزور مرد تمہارا نصیب کردیا گیا۔ میری کمر ہر رشتے کا بوجھ سہارتی ہے۔ لیکن جب تمہاری باری آتی ہے۔ میں ڈھے جاتا ہوں۔ میں بہت مجبور ہوں اور میری مجبوری میری دو غیر شادی شدہ بہنیں اور غیر شادی شدہ بھائی ہے۔ مجھے بہنوں کی شادی کرنی ہے۔ گھر کو از سر نو تعمیر کر کے چھوٹے بھائی کے لیے پورشن بنوانا ہے۔ چھوٹے بھائی کو کاروبار کروا کے دینا ہے۔ پھر شادی شدہ بہنوں کی فرمائشیں اور اماں' ابا کی دوائیاں۔ میں اکیلی جان اور سو بکھیڑے۔ امی اپنی جگہ صحیح ہیں کہ جو پیسے تمہیں خرچ کے طور پر دیے ہیں' ان سے وہ بیٹیوں کا جہیز بنا رہی ہیں اور تم بھی اپنی جگہ پہ درست ہو کہ اب تمہاری صحت بھی تمہیں اجازت نہیں دیتی۔ جہاں تم نے اتنے برس میرا ساتھ دیا ہے۔ میرا بازو بنی رہی ہو۔ وہاں پلیز! چند برس اور۔ میں دھوکے باز نہیں' مجبور ہوں' پلیز عطیہ۔"

وہ کتنی عاجزی' منت و لجاجت سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ عطیہ کے ہاتھ اس وقت اتنے ٹھنڈے اور بے جان ہو رہے تھے کہ ریسیور کا وزن سہارنے سے انکاری تھے۔

افضال ابھی تک بول رہا تھا۔ لیکن اس کی قوت سماعت جیسے ختم ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کی ساس صحن میں چارپائی پہ بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ عطیہ نے کچھ بھی کہے بغیر فون رکھ دیا۔ وہ اپنا مزید تماشا نہیں بنوانا چاہتی تھی۔

وہ کمرے میں جا کے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹنے لگی۔

افضال کے رشتوں کی فہرست میں وہ بھائی' بہنوں' ماں اور باپ کے بعد آخر میں آتی تھی۔ اسے آخری نمبر پر بھی کوئی عار نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے لیے کبھی کسی نے حصے نہیں رکھے تھے۔ رشتوں کی تقسیم میں اسے کبھی شامل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ صبر و تحمل کا پیکر تھی۔ وہ تصویر کا ہمیشہ دوسرا رخ بھی مدنظر رکھا کرتی۔ افضال کی ماں بھی اپنی جگہ درست تھی۔ ہزارہا ضروریات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی۔

شاید سب اپنی جگہ خود کو اس کا مجرم گردانتے۔ لیکن اس کا دل سب کے لیے صاف تھا۔ وہ دل میں کدورت اور میل رکھنے والی نہیں تھی۔ رب نے اسے سمجھ بوجھ اور ہنر دیا تھا۔ جس کا وہ استعمال کرنا جانتی تھی۔

امید پہ دنیا قائم ہے۔ اسے ایک بار پھر صبر سے اپنی باری اور اپنے حصے کے آرام و سکون کا انتظار کرنا تھا۔ یقیناً" اس پاک پروردگار نے' جس نے اس کے ہاتھ میں ہنر دے کر' اسے ہاتھ پھیلانے اور اپنے بستے گھر کو اجاڑنے سے بچائے رکھا تھا۔ اس ہستی نے اس کا حصہ بھی ضرور سنبھالا ہوگا' جو وقت آنے پہ اس کا نصیب ہو جانا تھا۔

اس نے چہرہ خشک کیا اور سبز بکسے کو بیڈ کے نیچے سے باہر گھسیٹا۔ ابھی مشین کے پرزوں کو تیل دے کر' دھوپ بھی لگوانی تھی۔ تاکہ یہ سالوں کی' اس کے دکھ سکھ کی ساتھی' ساتھی اس کا ساتھ مزید نبھا سکے۔

صدف آصف
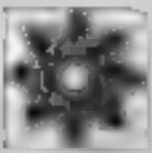
"اری ۔۔۔ اوندیدی۔۔ اب سنبھالے گی بھی مجھے یا یوں ہی ٹکر ٹکر منہ دیکھتی رہے گی؟ چل کے اندر بستر پر لٹا۔ مجھے تو تیری بد نظری ہی کھا گئی۔ جب ہی سارا کھایا پیا نکل گیا۔ کل تک بھلا چنگا تھا۔ مزے سے سحری کی۔ اب اچانک جو طبیعت بگڑی تو سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔" وہ کرسی سے اٹھ کر دو قدم چلنے ہی میں بے حال ہو گیا تھا۔ فوراً" منیبہ کو آواز لگائی۔

علی بخش کو شدید قسم کا فوڈ پوائزن ہو گیا تھا۔ منیبہ کے منع کرنے کے باوجود سحری میں اس نے بازار کی باسی تلی نہاری اور بل دار پراٹھے کھائے تھے۔ اب اسی نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ بیوی کی ضد میں اس نے کچھ زیادہ ہی کھا لیا تھا۔ لالچی طبیعت کے باعث بیوی کو جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا تھا۔ اسی لیے اب خمیازہ بھگت رہا تھا۔ حالانکہ منیبہ نے اسے سمجھایا بھی تھا سحری میں ہمیشہ ہلکی پھلکی غذا کھانی چاہیے۔ اس سے پیٹ بھی خراب نہیں ہوتا اور طبیعت میں گرانی بھی نہیں ہوتی۔

اس کی بدفطرتی آج منیبہ کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ جو اس نے سادی روٹی اور گھر کی پکی ہوئی بھنی مونگ کی دال سے سحری کی تھی۔ ورنہ باسی تلی نہاری کھا کر وہ خود بھی دوسری چارپائی پر پڑی ہوتی اور اس گھر میں اس کا تو کوئی پرسان حال بھی نہ تھا۔ اس کو سوچ میں گم دیکھ کر علی بخش کا غصہ بڑھنے لگا۔

"اب رج کے افطاری میں اپنے پسندیدہ دہی بھلے کھانا۔ تیرے چلتر میں خوب جانوں۔ تو نے ہی مسکرا مسکرا ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر میرے کھانے پینے پر پابندی لگوائی ہو گی ۔۔۔ ہے نا؟ کیسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا اور تو بھی تو خوب اس سے باتیں مٹھار رہی تھی۔"

منیبہ نے او آر ایس کا پانی گلاس میں نکال کر اسے دیا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ مار کر گلاس توڑ دیا اور چیخنے چلانے لگا۔ وہ حیران و پریشان اپنے اوپر لگنے والے الزامات سن رہی تھی۔ اس نے تو ڈاکٹر صاحب سے صرف "دوائیں' احتیاط اور علی کو کیا کھلانا پلانا ہے۔" اس کی بابت ہی بات کی تھی۔ مگر یہاں تو شوہر نے ایک فسانہ بنا دیا۔

علی بخش کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ منہ سے گویا جھاگ نکل رہے تھے۔ منیبہ نے احتیاط سے ٹوٹے گلاس کے شیشے چنے اور باہر کوڑے دان میں پھینک آئی۔ اتنی دیر چیخ و پکار کرنے کے بعد وہ چارپائی پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ الٹی اور دست نے اس کے لمبے چوڑے وجود کی توانائی جیسے کھینچ سی لی تھی۔ اب تو اس سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ منیبہ نے بمشکل اسے دوا کھلائی۔ اس کے بعد لٹا دیا۔ علی بخش کے سر کے نیچے نرم تکیہ لگا کر وہ کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ جیسا بھی تھا۔ تھا تو اس کا مجازی خدا ہی نا۔

☼ ☼ ☼

علی بخش خاوندوں کی ایسی قسم سے تعلق رکھتا تھا' جن کے فخر کے لیے یہ ہی بات کافی تھی کہ مردوں کی صنف سے ہے۔ جسے قدرت نے دنیا میں برتری عطا فرمائی ہے۔ اس کی نظر میں بیوی کی حیثیت پاؤں کی

جوتی جیسی تھی۔ جب دل بھر جائے' بدل دو۔ منیبہ کو اس بات کا بخوبی احساس دلانے کے لیے بات بے بات اس کی بے عزتی کرنا اس کا معمول تھا۔ وہ اس کی کم عمری اور ملکوتی حسن کی آب و تاب سے اکثر گھبرا اٹھتا۔ اسے کھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے دبا کر رکھتا۔ ہمیشہ منیبہ کی کسی بات کی مخالفت کرتا۔ اس کے دماغ پر خناس سوار تھا کہ زیادہ پیار و محبت اور نرمی دکھانے سے بیویوں پر سے شوہروں کا رعب ختم ہو جاتا ہے اور وہ سر چڑھ کر ناچنے لگتی ہیں۔

علی بخش شہر کا مشہور درزی تھا۔ ہاتھوں میں ہنر تھا۔ اسی لیے دکان بھی خوب چلتی تھی۔ شکل و صورت بھی اتنی بری نہ تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ عمر چور تھا۔ اسی لیے ثمینہ کو بیٹی کے لیے یہ رشتہ دل سے بھا گیا۔ خصوصاً" جب لڑکے نے منیبہ کو ایک جوڑے میں بیاہ کرلے جانے کی بات کی تو اس نے خوشی خوشی دوبارہ جو مرد سے اپنی کچی کلی سی بیٹی بیاہ دی۔ اس نے اپنے تئیں بھلائی سوچی کہ بیٹی کو جہیز کے انتظار میں گھر بٹھا کر بوڑھا کرنے سے بہتر ہے کہ علی بخش کے ساتھ وداع کر دیا جائے۔

علی بخش ایک کائیاں آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہیز کے لالچ میں پڑا تو مکھن ملائی جیسی لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ویسے بھی اتنی بدنامی کے بعد اس کو اپنی ذات برادری میں کوئی رشتہ دینے کو تیار نہ تھا۔ منیبہ کے گھر کی حالت دیکھ کر کوئی اندھا بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہاں سے جہیز کے نام پر تنکا بھی نہیں ملے گا۔ سو اس نے اس گھر کے ہیرے کو اپنی دسترس میں لینے کا سوچا۔ اپنی لالچی طبیعت کے برعکس' جہیز لینے سے خود ہی انکار کرتے ہوئے ایک پیالی چائے پر نکاح پڑھوانے کی درخواست پیش کی۔ ثمینہ جو خرچے کی وجہ سے ہامی بھرنے میں متامل ہو رہی تھی۔ خوشی خوشی علی بخش کو اقرار کر بیٹھی۔ یوں منیبہ کا نکاح ہوا اور وہ تن کے جوڑے میں بیاہ کر علی بخش کے گھر سدھاری۔ رخصتی کے وقت ثمینہ نے اپنے شوہر کی آخری نشانی سونے کی بالیاں کانوں سے اتار کر بیٹی کو پہنا دیں۔

شادی کو دو سال ہونے کو آئے تھے۔ مگر منیبہ نے دن کے وقت علی بخش کو بہت کم مہربان دیکھا۔ آج تو ویسے بھی موڈ آف ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔ طبیعت کی خرابی کے باعث روزے کا ٹوٹنا' کھانے پینے پر پابندی کے ساتھ سادہ دلیہ کھانے کی سزا۔

وہ چارپائی پر لیٹا بہت بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ طبیعت اتنی بگڑ جائے گی۔ نہیں تو وہ بیوی کو افطاری کے لوازمات پکانے سے ہی منع کر دیتا۔

اس کا خیال تھا' خود سے ہی ہلکی پھلکی دوا دارو کر لے گا تو شام تک طبیعت سنبھل جائے گی۔ مگر جب پیٹ کا پانی بھی نکل گیا تو وہ مجبوراً" بیوی کا سہارا لے کر رکشے میں قریبی محلے کے کلینک تک جا سکا تھا۔

سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ جب ڈاکٹر صاحب نے مریض سے زیادہ اس کی نازک اندام بیوی پر توجہ دینا شروع کی تو علی بخش کا بلی پی شوٹ کر گیا۔ ڈاکٹر مسکرا مسکرا کر منیبہ کو مخاطب کرتا رہا۔ علی بخش کے تو جیسے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ چارپائی پر لیٹتے ہی فلم کی طرح سارا منظر نگاہوں میں کیا گھوما' اس نے زور سے روزہ دار بیوی کو ایک لات رسید کی۔ وہ دور جا گری۔ لیٹے لیٹے وہ مغلظات بکیں کہ منیبہ کو کانوں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ آج تو علی بخش نے حد کر دی' اس کی لاچار ماں کو بکنے کے ساتھ ساتھ مرے ہوئے باپ کو بھی نہ چھوڑا۔

وہ روتی ہوئی کمرے سے بھاگی۔ اس کی کمر اور دل میں ایک ساتھ شدید درد اٹھا تھا۔ جانے زیادہ تکلیف اس لات کی تھی' جو کمر پر پڑی تھی یا ان الفاظ کی' جو دل میں کانٹوں کی طرح جا چبھے تھے۔ علی بخش کی زبان تو کبھی کبھی تو ایسے ناخن جیسی بن جاتی تھی' جنہیں وہ بڑے آرام سے منیبہ کے دل میں کھبو دیتا تھا۔

"او ماں! تو کہاں ہے۔ اپنے سے جدا کر کے تو نے مجھ پر یہ کیسا ظلم ڈھایا؟" سر کو گھٹنوں پر جھکائے وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کے گھر میں غربت سہی' مگر ایسی ذہنی اذیت نہ تھی۔ روتے روتے وہ ماں کو دل سے یاد کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

یہ۔ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں۔ خود دکھوں کی بھٹی میں جلنے مرنے کے باوجود اپنی معصوم سی بیٹیوں کو سپنے دکھاتی رہتی ہیں کہ جو بھی من مانی کرنی ہو وہ شوہر کے گھر جا کر کرنا۔ حالانکہ خود سسرال اور شوہر کے دل میں اپنے لیے چھوٹی سی جگہ بنانے میں پوری زندگی تج دیتیں۔ پھر بھی اپنی پریوں کو شوہر کے گھر جا کر آزادی کی اڑان بھرنے کے سپنے دکھاتیں۔ ان سے کوئی یہ پوچھے کہ جب ماں' باپ سے خون کا ناتا رکھنے والی بیٹیاں اپنے گھروں میں دل کی خوشی پوری نہ کر سکیں' تو شوہروں سے کیا گلہ؟ وہ تو پھر غیر ہی ہوتا ہے' اس سے کیسی امیدیں؟ کہ اس کے گھر جا کر راج کریں گی۔ منیبہ نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو سختی سے پونچھ ڈالا۔ ساتھ ہی ان خوابوں کو بھی مٹانے کی کوشش کی' جو شوہر کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے کے لیے ماں نے اس کی آنکھوں میں بچپن سے بسائے تھے۔ دروازے پر ہونے والی درد بھری صدا نے اس کے خیالات کا ڈور کاٹ دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔

"باجی۔ مسافر ہوں۔ روزے کی حالت میں ہوں۔ افطاری کے لیے کچھ دے دو۔" ایک عورت چھوٹے سے بچے کو اپنی کمر پر ٹکائے پپڑی زدہ ہونٹوں کو زبان سے گیلا کرتے ہوئے اس کے سامنے فریادی بنی کھڑی تھی۔ منیبہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ روزے کا مقصد اس پر عیاں ہو گیا۔ بھوکا رہ کر کسی دوسرے کے خالی پیٹ کی اذیت کا احساس کرنا۔

اس نے عورت کو رکنے کا اشارہ کیا اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔ احتیاط سے علی بخش کے کمرے میں جھانکا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔ اس کی موجودگی میں تو وہ کسی مانگنے والے کو ایک دھیلا دینے کی مجاز نہ تھی۔ وہ ویسے بھی مانگنے والوں کو فراڈ قرار دیتا تھا۔ منیبہ نے جلدی جلدی سارے پکوڑے' فروٹ چاٹ الگ الگ تھیلیوں میں نکالے' جو علی بخش نے آج کے لیے بنوائے تھے اور ڈاکٹر نے اسے کھانے کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ دہی بھلے کا پیالا اٹھاتے ہوئے اس کا دل ایک لمحے کو جیسے ٹھہر سا گیا۔ مگر علی بخش کے طعنوں نے سارے منظر دھندلا دیے۔ اس نے فوراً" ساری چیزوں کی تھیلیاں اس مانگنے والی عورت کو تھمائیں اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ اسے دعائیں دیتی ہوئی چل دی۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کھینچتے ہوئے جیسن کا پیالا بے دلی سے فریج میں رکھا۔ علی بخش کی باتوں نے ویسے بھی اس کا دل اتنا خراب کر دیا تھا کہ وہ اس کے لیے بنائی جانے والی افطاری میں سے ایک لقمہ بھی لینے کی روادار نہ تھی۔ اس نے دوسرے چولہے پر دلیہ چڑھایا تاکہ شوہر کے جاگنے پر اسے کھلا سکے۔ اب اس کے پاس فراغت ہی فراغت تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے ماضی کی سیر کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼
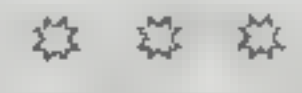
"اماں۔ اے اماں۔ سن نہیں رہی ہے نا۔"

منیبہ نے ماں کے ماتھے کی سلوٹوں کو نظرانداز کیا اور لاڈ سے اسے پکار کر متوجہ کرنے لگی' جو جلدی جلدی برقعے کے بٹن کھولنے میں مصروف تھی۔ وہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی تھی۔

"کیا۔ اماں۔ اماں کی رٹ لگا رکھی ہے؟ کچھ منہ سے پھوٹے گی بھی۔" ثمینہ نے منیبہ کو غصے سے جھاڑا اور گرمی سے تپتے ہوئے باورچی خانے میں داخل ہوئی' جہاں اسے چھ جنوں کی پیٹ کی آگ بجھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اس نے بنگلوں میں جا کر کھانا اور روٹی پکانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ پڑھی لکھی نہ تھی۔ اس لیے کوئی دوسرا کام نہ سوجھا۔ نہ ہی کچھ اور کرنے جوگی تھی۔

"اماں! آج پہلا روزہ ہے۔ اگر تو ناراض نہ ہو تو میں افطاری کے لیے دہی بھلے بنا لوں؟" منیبہ نے لجاجت سے ماں کا گھٹنا ہلایا اور سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف

دیکھنے لگی۔ وہ رات میں آٹا نکال کر گوندھنے کی تیاری میں مصروف تھی۔

"منی! تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ہم غریبوں کا کیا روزہ اور کیا افطاری؟ تیل کی قیمت آسمان تک جا پہنچی ہے۔ دال جو پہلے غریبوں کے گھر پکا کرتی تھی۔ اب اس موئی مہنگائی کی وجہ سے ہماری پہنچ سے دور ہو گئی ہے۔ دودھ دہی والے بھی دینی احکامات بھلائے خصوصاً اس بابرکت مہینے میں ملاوٹ شدہ دودھ اور اس سے بنا دہی دگنی قیمت میں بیچ کر خوب ثواب کماتے ہیں۔ بھلا بتا! میں تیری زبان کے چٹخارے دیکھوں یا باقی بچوں کی بھوک؟ جن پیسوں میں تیرے دہی بھلے بنیں گے نا' اتنے پیسوں میں' میں ان کے لیے ایک وقت کی ہانڈی کا انتظام کرلوں گی۔"

"اماں۔۔۔ پلیز! میرا بڑا دل کر رہا ہے۔" منیبہ نے ایک بار پھر ماں کو منانا چاہا۔

"نہ بھئی نا۔۔۔ میں تیری محبت میں باقی جنوں کے ساتھ دشمنی نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی تھوڑا ٹھہر جا۔ چند مہینوں میں تو بیاہ کر علی بخش کے گھر چلی جائے گی۔ پھر وہاں جا کر اپنی ساری خواہشات پوری کرتی رہنا۔ اس کی دکان خوب چلتی ہے۔ وہاں سے اسے بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ تجھے کسی چیز کی کمی نہ ہو گی۔ ساس نندوں کا بھی کوئی چکر نہیں۔ مکمل آزادی ہو گی۔ پھر چاہے تو روز روز دہی بھلے بنا کر کھانا کوئی منع نہیں کرے گا۔" ثمینہ نے بچی کی معصوم خواہش سے نگاہیں چرائیں اور بہلانے کے لیے اس کے سامنے مستقبل کا خوش کن نقشہ کھینچا۔ مگر منیبہ کے چہرے کی اداسی دور نہ ہوئی۔ وہ جا کر ایک جگہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس نے ملال سے بیٹی کو دیکھ کر میلی اوڑھنی سے چپکے سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"اماں۔۔۔ ایک بات کہوں۔ یہ ٹی وی والے تیرے آگے کیا بیچتے ہیں؟ سیاست دانوں کو بٹھا کر ملکی حالات پر ایسے ہی بحث کرتے رہتے ہیں۔ قسم سے ایک دن تجھے مدعو کرلیں نا تو' تو ان سب کے چھکے چھڑا دے گی۔" پپو جو چارپائی پر لیٹا سب سن رہا تھا' گردن اٹھا کر اماں کو چھیڑنے لگا۔ اسی بہانے وہ ماں' بہن کا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ٹھہر جا۔۔۔ تجھے بتاتی ہوں منحوس اماں کا مذاق اڑاتا ہے۔ صبح سے چارپائی پر پڑا ہے۔ اسی لیے کام پر دیر ہو جاتی ہے۔ وہ تیرا کالی شکل والا موٹا استاد مجھ سے جہاں ٹکراتا ہے' تیری شکایتیں لگانا شروع کر دیتا ہے۔ چل اٹھ جلدی دفع ہو۔" کہیں کا غصہ کہیں جا نکلا۔ اس نے اپنے پاؤں سے چپل نکال کر کھینچ کر پپو کو ماری جو پٹاخ کی آواز کے ساتھ ہمیشہ کی طرح جا کر سیدھی نشانے پر جا لگی۔ ساتھ ساتھ اس کی زبان سے جلی کٹی بھی جاری تھیں۔

"ارے۔۔۔ میری بھولی ماں لوہ تو تجھے دیکھ کر میری شکایتیں یوں لگاتا ہے کہ کہیں تو اس سے میری تنخواہ بڑھانے کی بات نہ کر دے۔ ورنہ وہ رشتے میں میرا ماما تھوڑی لگا ہے۔ میں صحیح کام نہ کروں اور وہ مجھے نوکری سے نہ نکالے۔ جس دن اسے میری ضرورت نہ رہے گی۔ وہ دوسرے دن ہی میرا ہاتھ پکڑ کر ورکشاپ سے باہر کھڑا کر دے گا۔" پپو پیٹھ سہلاتے ہوئے غسل خانے کی جانب بڑھا۔ پھر لحہ بھر ٹھہر کر ماں کو گر کی بات بتانے لگا۔ ویسے بھی اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب سب منیبہ کی جگہ اس کی طرف متوجہ تھے۔

ہوشربا مہنگائی سے مجبور ہو کر ثمینہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک سال قبل پپو کو کہہ سن کر استاد انور کی ورکشاپ پر لگا دیا تھا' جہاں کام سکھانے کے بجائے استاد انور غریب گھرانوں کے بچوں کا استحصال کرتا تھا۔ پپو سے بھی وہ دن بھر کولہو کے بیل کی طرح کام کرواتا اور ذرا سی غلطی یا لاپروائی پر ایک آدھ ہاتھ جڑنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اتنی صعوبتیں سہنے کے بعد جب مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ پپو کی ہتھیلی پر قلیل سی رقم رکھتا تو اس کا دل چاہتا کہ استاد انور کے ساتھ ساتھ اس کی نوکری کو بھی ایک زوردار ٹھوکر مار دے۔ مگر اف۔۔۔ یہ مجبوریوں کی ان دیکھی زنجیریں انسان کو کس کس مقام پر لے جا کر بے دست و پا کر دیتی ہیں۔

جب بھی استاد کی بے جا زیادتیوں پر اس کی

شریانوں میں خون ابلتا' ماں کا تفکر بھرا دبلا پتلا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا اور وہ دوبارہ سے اس بھٹی میں اپنے آپ کو جھونکنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس کی تنخواہ گھر کی غربت مٹانے کے لیے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" ثابت ہوتی تھی۔

وہ بالوں کو ہاتھوں سے اوپر کی جانب کھڑا کر رہا تھا۔ جس پر کچھ دیر پہلے اس نے تیل پانی لگایا تھا۔ ماں کے پکارنے پر وہ اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ صحن میں چپ چاپ بیٹھی بہن کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ سوچ میں گم بیٹھی بہن اور ماں کو اللہ حافظ کہے بغیر گھر سے باہر نکل گیا۔

ثمینہ کا دل بھی اداس تھا۔ مگر وہ کیا کرتی۔ مہینے کا آخر تھا۔ جن گھروں میں کام کرنے جاتی تھی۔ رمضان کے باعث ان کے چولہے ٹھنڈے پڑے رہتے۔ اب وہ لوگ صرف افطاری کے لیے چیزیں کٹوا پٹوا لیتے تھے۔ ورنہ پہلے تو کہیں نہ کہیں سے اسے دوپہر کا کھانا مل جاتا تھا' جو وہ گھر لے آیا کرتی تھی۔ چھوٹے بچوں کا روزہ نہیں تھا۔ اس لیے اب گھر میں دونوں ٹائم کا کھانا پکانا پڑ رہا تھا۔ لہٰذا تیل' گھی بھی خوب خرچ ہو رہا تھا۔ ورنہ بیٹی کی خواہش پوری کرنے کو اس کا دل بھی مچل رہا تھا۔

باہر کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور پپو ڈرامائی انداز میں دوبارہ گھر میں داخل ہوا۔ منیبہ اور ثمینہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا بہن کے پاس آیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ایک تھیلی اسے تھمائی۔

"بھائی! اس میں کیا ہے؟" منیبہ سمجھ تو گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"میری پیاری صابر اور شاکر بہنا کے پسندیدہ۔۔۔ دہی بھلے۔" پپو نے ہنستے ہوئے پہلے سسپنس قائم کیا۔ پھر اپنا منہ اس کے کان کے قریب لا کر زور سے چیخا۔

"او بھائی۔۔۔ تم کتنے اچھے ہو۔" بھائی کی محبت پر اس کی آنکھوں میں شکر کا پانی بھر آیا۔

"میری بہنا بھی تو اتنی اچھی ہے' جو دن بھر ہمارا خیال رکھنے کے لیے پھرکی بنی رہتی ہے۔" پپو نے ہنستے ہوئے اس کی چوٹی کھینچی اور باہر نکل گیا۔

"میرے مالک۔۔۔ جیسے آج بھائی نے میرا دل رکھا ہے۔ ویسے ہی تو ہر مقام پر اس کے دل کا خیال رکھنا۔ اس کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کر دینا۔" منیبہ نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے بھائی کے حق میں دعا مانگی۔

بھائی بہن کی محبت پر ثمینہ کی آنکھوں سے شکر کے آنسو بہہ نکلے۔ سر پر باپ کا سایہ نہ تھا۔ عالم غربت میں بھی اس نے بچوں کی تربیت میں کمی نہ آنے دی تھی۔ بیٹے کی بہن سے اس درجہ محبت دیکھ کر دل میں بیٹے کے لیے دل میں فخر کا احساس جاگ اٹھا۔ وہ ماں تھی۔ اپنی ہر اولاد کی رگ رگ سے واقف تھی۔ جانتی تھی کہ پپو نے ایک طرف کے کرائے کی قربانی دے کر بہن کی خوشی پوری کی ہے۔ جب وہ روزے میں پیدل ہانپتا کانپتا ورکشاپ پہنچے گا تو اس کا سخت گیر استاد اسے چار باتیں ضرور سنائے گا۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھ بھر آئی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو منیبہ کی شادی وہاں کروں گی۔ جہاں میری بچی کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو۔" ثمینہ نے رشتے کرانے والی خالہ سے جو پہلی فرمائش کی' وہ یہی تھی۔ سکینہ نے پہلے حیران نظروں سے اسے دیکھا' پھر نگاہوں میں ہی نگاہوں اس کی کیفیت کو جانچا اور جھٹ علی بخش کا رشتہ پیش کر دیا' جو منیبہ کی تصویر دیکھتے ہی لٹو ہو گیا تھا۔ اس جگہ رشتہ کروانے پر اس نے سکینہ کو ایک بھاری جوڑا' دو کلو مٹھائی اور پانچ ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ منیبہ کی بات علی بخش سے طے ہونے کے بعد وہ جب بھی بیٹی کے سامنے ہونے والے داماد کا ذکر کرتی تو فخر سے کھانے پینے کی وہ چیزیں ہی گنواتی رہتی' جو علی بخش نے پہلی ملاقات پر اس کے اور پپو کے سامنے ڈھیر کر دی تھیں۔ بھولی بھالی ثمینہ اس بات سے ناآشنا تھی کہ علی بخش تو ان پر سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ ورنہ وہ اتنا کنجوس شخص تھا کہ دو کسی کو

"اپنا بخار نہ دے۔" اس نے سموسوں، مٹھائیوں، چکن تکے اور کولڈ ڈرنک سے ان دونوں کا منہ یوں بھر دیا تھا کہ وہ کسی اعتراض کے لیے منہ کھول ہی نہ سکیں۔

"ہونہہ! لوگوں کی تو عادت ہے باتیں بنانے کی۔ مارنے والے کا ہاتھ تو پکڑا جا سکتا ہے، مگر بولنے والے کی زبان نہیں۔" ثمینہ نے رشن خالہ کو جھڑکا، جو علی بخش کی پہلی بیوی کے حوالے سے اسے کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ ثمینہ کے پیش نظر یہی بات اہم تھی کہ علی بخش اس کی بیٹی کو عیش بھری زندگی دینے کا اہل ہے۔ ورنہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بچی نے کتنے صبر و شکر سے گزارا کیا ہے۔ یہ اس سے بہتر کون جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے محلے میں جاری چہ مگوئیوں پر کان نہ دھرنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ بیٹی کی اتنی جلدی شادی کا سوچ کر دل کئی بار دھڑکا۔ مگر اس نے دل کو بھی سمجھا لیا۔

یہ رشتہ لگانے والیاں بھی لوگوں کی نفسیات سے کھیلنا خوب جانتی ہیں، سکینہ اسی محلے میں رہتی تھی۔ وہ منیبہ کو بچپن سے جانتی تھی۔ مذہب سے اس کا خصوصی لگاؤ پورے محلے پر عیاں تھا۔ وہ اسی گلی میں قرآن شریف پڑھانے والی بی بی کی سب سے ہونہار شاگرد تھی۔ انہوں نے اسے نہ صرف قرآن کی تعلیم دی۔ بلکہ حدیثوں کے ذریعے اس کی عملی تفسیر بننے کی کنجیاں بھی اس کے ہاتھوں میں تھما دیں۔

سکینہ نے بھی اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے منیبہ کے سامنے بار بار علی بخش کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ "علی بخش سچا پکا مسلمان ہے، نمازی اور پانچوں شرعی عیب سے پاک ہے۔"

منیبہ جیسی صابر شاکر لڑکی کے لیے یہی بات کافی تھی کہ اس کے ہونے والے شوہر کا رجحان بھی مذہب کی طرف ہے۔ وہ ہاتھ پیروں سے صحت مند، اچھا کھاتا کماتا ہے۔ اس جیسی غریب لڑکی کو اور کیا چاہیے تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ سچا مسلمان بننے کے لیے صرف نمازی ہونا شرط نہیں۔ بلکہ ایک مسلمان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حقوق العباد کی ادائیگی ایک کڑا امتحان ثابت ہوتی ہے۔ اسلام میں ہاتھ اور زبان سے کسی کو ایذا پہنچانے والے کی بڑی پکڑ ہے۔ جبکہ پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرنے والا علی بخش ان ہی معاملات میں کورا تھا۔

☼ ☼ ☼
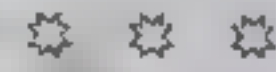
منیبہ کی دوست رانی نے دولہا بنے علی بخش کو ہنستے ہنستے چھیڑا تھا کہ منیبہ کی جان تو "دہی بھلوں" میں ہی اٹکی رہتی ہے۔ اگر وہ اسے منہ دکھائی میں ایک کلو دہی بھلے دے دے گا تو وہ خوشی سے پوری رات نہ سو سکے گی۔"

علی بخش نے کینہ پرور ساس کی طرح سہیلی کی یہ بات گرہ سے باندھ لی اور شادی کے بعد اس نے بھی بیوی کی یہ فرمائش پوری نہ ہونے دی۔ وہ ویسے بھی انتہائی کنجوس آدمی تھا۔ ایک ایک پیسے کو دانتوں سے پکڑتا تھا۔ منیبہ اس کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی فروا، علی بخش کی کنجوسی، تنگ دلی اور بدمزاجی کے باعث اسے چھوڑ گئی تھی۔

فروا سے لوگوں نے جب علیحدگی کی وجہ پوچھی تو وہ سب کو ببانگ دہل بتاتی پھرتی کہ "جب سے بیاہ کر علی بخش کے گھر گئی تھی، پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو ترس گئی۔" علی بخش کتنا بھی خوش حال سہی۔ مگر ایک بیوی کے خلع لینے کے بعد جو بدنامی اس کے حصے میں آئی۔ اس وجہ سے اس کی دوسری شادی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی اپنی ضروریات تھیں۔ اسی لیے وہ دوسرے نکاح کے لیے بے چین تھا۔ ویسے بھی اسے ایک شکار کی ضرورت رہتی تھی۔ جس پر وہ اپنی برتری ثابت کرتا رہے۔ درزی ہونے کی وجہ سے اسے بیگمات کے ناز نخرے اٹھانے پڑتے تھے۔ اکثر ذرا ذرا سی بات پر وہ اسے جھاڑ کر بھی رکھ دیتی تھیں، مگر ان سے ہی اس کی روزی روٹی منسوب تھی۔ اسی لیے وہ دکان داری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ان کو آگے سے جواب نہیں دے سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے موقع پر اس کے اندر کا انا پرست مرد جل بلا کر رہ جاتا یہی

وجہ تھی کہ اپنے تئیں بیویوں پر ظلم و ستم روا رکھ کر وہ ان سب عورتوں سے بدلے لے لیتا، جو اسے اپنی اونچی ایڑی کی جوتی تلے رکھتی تھیں۔

علی بخش کے شکنجے میں اب منیبہ پھنسی تھی۔ وہ اس کو تنگ کرنے کے نت نئے بہانے ڈھونڈتا۔ اس کے چھوٹے دماغ کی یہ سوچ تھی کہ اگر بیوی کی فرمائشیں یوں ہی آسانی سے پوری کر دی جائیں تو وہ منہ کو آتی ہیں۔

وہ اکثر حیران رہ جاتا، جب اس کی ڈانٹ پھٹکار پر پہلی بیوی کی طرح منیبہ زبان نہیں چلاتی۔ اس کو حسرت ہی رہی کہ منیبہ، فروا کی طرح اس سے گڑگڑا کر کھانے پینے کی فرمائش کرے تو پھر وہ بھی جتا جتا کر اسے کھلائے۔ مگر وہ اتنی صابر و شاکر تھی کہ پہلی بار کے بعد کبھی دوسری دفعہ کسی چیز کے لیے منہ نہ کھولتی۔ اس کی یہی عادت تو علی بخش کو کھاتی تھی کہ "اس کمزور عورت میں اتنا غرور۔" اس کا جب کسی بات پر بس نہ چلتا تو وہ اسے بلاوجہ دھنک کر رکھ دیتا۔

☼ ☼ ☼

"اماں۔۔۔ اے اماں۔۔۔" پپو کی آواز شدت جذبات سے پھٹ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کیوں سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے؟" ثمینہ جو کپڑے دھو کر پھیلا رہی تھی۔ ہاتھ دھو کر اندر کی طرف دوڑی۔ جب تک بیٹیاں بابل کے آنگن میں رہتی ہیں۔ ان کا بے ضرر وجود اپنا احساس نہیں دلاتا۔ مگر جب وہ چلی جاتی ہیں تو گھر والوں کو پتا چلتا ہے کہ وہ خاموشی سے کتنی ذمہ داریاں اپنے نازک کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ کتنے کام جب ان کے جانے کے بعد رکنے لگتے ہیں تو گھر والوں خصوصاً ماں کو پتا چلتا ہے کہ وہ کتنی کارآمد تھیں۔ پھر ان کے دلوں سے بیٹیوں کے حق میں بے اختیار دعائیں نکلتی ہیں۔

ثمینہ بھی آج کل اسی قسم کے حالات سے گزر رہی تھی۔ منیبہ جو پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس نے ماں کو کبھی پتا ہی نہیں چلنے دیا کہ بھائیوں کے چھوٹے چھوٹے کام وہ بڑے آرام سے کیسے کر لیتی ہے۔ نہ صرف بھائیوں کو بلکہ اس گھر کو بھی اس نے اپنے نرم ہاتھوں سے سمیٹا ہوا تھا۔ اب تو ثمینہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ باہر، گھر اور بچوں کے کاموں میں کیسے توازن پیدا کرے۔ کبھی کبھی تو وہ منیبہ کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی تھی۔

"اماں۔۔۔ میں اگلے ہفتے سعودی عرب جا رہا ہوں۔ اب تمہیں گھر گھر جا کر کھانا پکانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" پپو نے ماں کو گود میں اٹھا کر گھما ڈالا۔ وہ ہولاں وافتاں ٹکر ٹکر بیٹے کا منہ دیکھنے لگی۔

"کیوں۔۔۔ مذاق کر رہا ہے؟ باہر جانا۔۔۔ آسان ہے؟ اتنے ڈھیر پیسے چاہئیں۔" ثمینہ نے ہانپتے ہوئے اسے ایک دھپ لگائی۔

"ارے۔۔۔ اماں۔۔۔ پہلے میری تو سنو۔ وہ فہیم نہیں تھا، جو میرے ساتھ ورکشاپ میں کام کرتا تھا؟ اس کا ایک چاچا تھا جدہ میں۔ اس نے اپنی کمپنی میں اس کی نوکری کا بندوبست کیا۔ پھر کمپنی کے خرچے پر اسے بلا لیا۔ جاتے جاتے فہیم نے مجھے گلے لگا کر کہا تھا کہ وہ جلد ہی مجھے وہاں بلائے گا۔ اس بات کو سال ہونے کو آیا۔ میں تو بھول بھال گیا تھا۔ مگر آج اس کا ورکشاپ میں فون آیا کہ اس نے اپنی کمپنی میں میری نوکری کی بات کر لی ہے۔ وہ لوگ مجھے ویزا دینے کو تیار ہیں۔ اس نے میرے کچھ کاغذات منگوائے ہیں۔ جلد ہی وہ مجھے اپنے پاس بلوا لے گا۔" پپو نے خوشی خوشی ماں کو بتایا۔ اس کے چھوٹے بھائی پلنگ کے گرد بیٹھے یہ خوش خبری سن رہے تھے۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔ مگر باہر جانا آسان تو نہیں۔ اچھا خاصا خرچ آئے گا۔ یہاں تو وہ حال ہے کہ روز کی پکائی، روز کی کھائی۔ بچت کے نام پر دھیلا بھی نہیں۔" خوشی کے احساس سے نکل کر ثمینہ پر خرچے کی فکر سوار ہو گئی۔

"اماں بس۔۔۔ یہ تیری اور منیبہ کی دعائیں ہیں، جو

اللہ تعالیٰ نے میرے سارے راستے آسان کر دیے۔
نعیم سے بات کرتے ہوئے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔
مگر اس نے خود ہی پیش کش کر دی کہ وہ ابھی سارا
خرچ اٹھا کر مجھے بلا لے گا۔ بعد میں میں اسے قسطوں
میں ادا کر دوں گا۔"

پپو کی بات سے اس کے ذہن پر چھائے تفکر کے
بادل ایک دم چھٹ گئے۔ وہ ہلکی پھلکی ہو کر جیسے بادلوں
میں اڑنے لگی۔ پپو بھی پلنگ پر لیٹ کر آنے والے
دنوں کے سپنوں میں کھو گیا۔

"اماں! آج۔۔۔ تو افطاری میں سوجی کا حلوہ بنا دو۔
قسم سے بڑا دل چاہ رہا ہے۔" پپو سے چھوٹے ببلو نے
موقع دیکھ کر ثمینہ سے فرمائش کی۔ وہ شکرانے کے نفل
ادا کرنے جا رہی تھی۔

"ویسے۔۔۔ اگر اس وقت یہاں منیبہ ہوتی تو کیا
کہتی؟" پپو نے شرارت سے بھائیوں سے پوچھا۔
ثمینہ رک کر ان سب کو مسکرا کر دیکھنے لگی۔

"ہاں۔۔۔ اس خوشی میں آج تو دہی بھلے بنا لو نا۔"
پانچوں بھائیوں نے کورس میں کہا تو ثمینہ کی ہنسی نکل
گئی۔ وہ سب ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگانے لگے۔

☼ ☼ ☼

منیبہ کا دل بہت اداس تھا۔ وہ عصر کی نماز کے بعد
بہت دیر تک جائے نماز پر بیٹھی رہی۔ اپنی بے وقعتی
پر اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔
شادی کے بعد اس نے علی بخش جیسے انسان کے ساتھ
بہت صبر و شکر سے گزارا کیا۔ مگر آج اس کی تیز دھار
والی زبان کا زخم سیدھا اس کے دل پر لگا تھا۔ غربت کے
باوجود منیبہ نے اپنے وقار کا دامن ہاتھ سے نہ جانے
دیا۔ مگر آج علی بخش نے نہ صرف منیبہ کو لالچی ٹھہرایا
تھا۔ بلکہ اس کے کردار پر بھی انگلی اٹھائی تھی۔ یہ بات
اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ روتے روتے
بے حال ہو گئی۔ پھر استانی جی کی بات یاد آئی اور قرآن
شریف کھول کر بیٹھ گئی۔ تلاوت کی حلاوت سے رفتہ
رفتہ اس کے دل کو سکون حاصل ہو گیا۔

مغرب کا وقت قریب تھا۔ اسے افطاری کی فکر
لاحق ہوئی۔ اس نے آٹا ریفریجریٹر سے نکال کر باہر رکھ
کہ ایک روٹی پکا کر رات کی بچی ہوئی دال سے کھا لے
گی کہ دروازے پر دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ اس نے دوپٹا
سر پر رکھا اور جا کر دروازہ کھولا۔

شیخ صاحب کا بڑا بیٹا سلمان ایک بڑا سا ڈھکا ہوا
خوان لیے کھڑا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
"بھابھی۔۔۔ امی آج پورے محلے میں افطاری بانٹ
رہی ہیں۔ میں نے کہا سب سے پہلے منیبہ بھابھی
کے گھر لے کر جاؤں گا۔ پھر کسی دوسرے گھر میں
بانٹوں گا۔" سلمان نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ
میں ٹرے تھما دی۔

اس نے باورچی خانے میں جا کر خوان پوش ہٹایا تو
آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ چکن بریانی، کسٹرڈ، کئی
قسم کے پکوڑے، فروٹ اور چنا چاٹ کے ساتھ ایک
گہرے پیالے میں ڈھیر سارے دہی بھلے موجود تھے۔
"شکر ہے میرے مولا۔ تو دلوں کا حال جانتا ہے۔
میں نے اپنی خواہش کو پس پشت ڈال کر کسی غریب کی
افطاری کا انتظام کیا۔ تو تو نے مجھے اس سے دگنا عطا
کیا۔"

اس نے روزہ کھولنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔
نماز ادا کرنے کے بعد وہ علی بخش کو دلیہ کھلانے کے لیے
اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اپنے رب سے
ناامید نہ تھی۔ اس کا دل پر سکون ہو چکا تھا۔

"ایک نہ ایک دن میں اپنے صبر سے تم جیسے پتھر کو
پگھلانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔" منیبہ نے محبت
سے شوہر کو چمچے سے دلیہ کھلاتے ہوئے سوچا۔

علی بخش نے بیوی کو بغور دیکھا۔ سفید دوپٹے کے
ہالے میں منیبہ کے چہرے پر اس وقت اتنا نور برس رہا
تھا کہ علی بخش کے دل کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ زبان پر
تو جیسے تالے پڑ گئے اور وہ نظریں جھکانے پر مجبور
ہو گیا۔

قطرہ قطرہ نل ٹپک رہا تھا۔ وہ سجدہ کر رہی تھی اور
سجدے میں ٹپ ٹپ ہو رہی تھی۔ "ٹب بالٹی بھری کہ
تب"
قیام کیا "ٹب پانی بہے گا۔" رکوع۔ سجدہ۔ ہوا

کی یا سانس کی آواز آئے گی۔
"تو شی۔۔۔ او نوشی۔۔۔!"
سارے سجدوں، ایام، رکوع، آیات میں "او
نوشی۔۔۔ نوشی۔۔۔ ٹپ ٹپ۔۔۔ وہ بہا۔۔۔"

سمیرا حمید

دُھند دُھند کہاسا

سلام پھیرتے ہی دعا مانگے بغیر وہ بالٹی کے پاس آئی جو آدھی بھی نہ ہوئی تھی۔ بوا کے کان بالٹی کے پانی کے بہنے کے انتظار میں ہی لگے تھے کہ پانی باہر نکلے اور وہ اپنی آواز سے ہجوم اکٹھا کرے۔ واپس جا کر اس نے دعا مانگی' وہ اکلوتی بھابھی سب کی۔ بڑے بھائی کے بعد چار بہنیں تھیں جنہیں بیاہ کر ہی بھائی کو فارغ کیا گیا' بھائی پینتیس سے کئی اوپر کے ہو چکے تھے اور نوشی اٹھارہ انیس سے ذرا اوپر کی دلہن بن کر آگئی۔

پہلا کام جو بھی کو شادی کے اگلے ہی دن کرنا پڑا۔ وہ غسل خانے میں رکھی بالٹی کو باہر رکھی ٹنکی سے بھرنے کا تھا' کرم نے کہا۔

"سب ہی اپنے اپنے نہانے کے لیے خود ہی بالٹی بھرتے ہیں۔ میرے لیے تم بھر دو۔"

اس نے صحن میں ایک طرف رکھی ٹنکی سے پانی نکال نکال کر بالٹی بھر دی۔ یہ تو پہلا دن تھا' ذرا الگ رہا۔ کھیر پکانے سے پہلے پہلے وہ کئی سو بار بالٹی کو بھر چکی تھی۔ نندیں سب جا چکی تھیں۔ ساس برآمدے کے تخت پر بیٹھی ہمہ وقت نل کے پانی کے آنے اور جانے کا اعلان کرتی رہتی۔ ایک بوڑھی بوا بھی تھی جو ساس کے قریب ہی بیٹھی رہتی۔

اتنا ضرور ہوا کہ دلہن کو آتے ہی ایک بات اچھی طرح سے معلوم ہو گئی کہ اس گھر میں پانی بہت قیمتی ہے' سب دل و جان سے اس پانی کی قدر کرتے ہیں۔ دونوں دیور گھر آتے ہی پہلے پانی کا پوچھتے۔

"ٹنکی بھری ہے؟"

ٹنکی بھری ہی ہوتی اور کون بھرتا۔ نوشی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ شادی سے پہلے اسے کون بھرتا تھا' لیکن اب تو چوبیس گھنٹے وہ اسی کے پاس لگی رہتی۔ ساس اعلان کرتی۔

"نوشی! نل ٹپک رہا ہے۔ ٹنکی بھر لو۔" نل کے نیچے بڑی بالٹی دھری رہتی' اور یہ بالٹی وہاں ایسے ہی دھری ہوتی جیسے آسمان پر چاند نکا رہتا۔ لیکن وہ بالٹی جس رفتار سے پانی آتا تھا' بالٹی کو بھرنے میں بہت وقت لگ جاتا' ساس اعلان کیے ہی جاتی۔ کیے ہی جاتی کہ اگر ایک قطرہ بھی گر گیا تو غضب ہو جائے گا دنیا اس قطرے میں بہہ جائے گی۔ ڈوب جائے گی۔

اہم تھا یہ پانی۔ اونچے نیچے ٹیلے دھبوں کا علاقہ تھا' زمانوں کے پانی کے پائپ دبے تھے۔ چند ایک گھروں کے بہت پرانے ہو گئے تھے پائپ۔ کئی تو درمیان میں ہی ٹوٹ کر زیر زمین رستے تھے۔ پائپ رہ گئے' بہت نیچے اور گھر ٹیلوں پر اونچائی میں ہو گئے۔ اب بہت ہی پریشر سے پانی آتا تب ہی نل تک آتا' قریب قریب کے گھروں کا بھی یہی حال تھا۔ ہزاروں روپے لگاؤ۔ کھدائی کرواؤ۔ پائپ کی نئی فٹنگ کرواؤ اور موٹر لگاؤ اور پانی کھینچ لو۔ لیکن یہ ہزاروں جو کہ لاکھوں لگتے تھے کوئی پانی پر لگانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ساس کے زمانے کا ایک بڑا حمام اور کچن میں چھوٹے بڑے ڈرم۔ اور بھی بہت کچھ تھا چھوٹا بڑا بھرنے کے لیے۔

ساس کا تو جی چاہتا کہ پانی ذرا رفتار پکڑے تو صندوق' الماریاں بھی پانی سے بھر دیں۔ اور تو اور منہ تک سب کو پانی سے بھر کر منہ بند کروا کر دونوں بیٹھا دیں۔

زیادہ پریشر سے پانی منہ اندھیرے آتا' جب لوگ تہجد کے وقت اٹھنے کی تیاری کر رہے ہوتے۔ اس وقت بقول بوا کے ٹنکی آدھ گھنٹے میں۔ حمام بیس منٹ میں اور باقی کے چھوٹے بڑے برتن سب چٹکی بجاتے میں بھر جائے۔ اگر کوئی سوتا نہ رہے اور وقت پر اٹھ جائے۔ وقت پر کون اٹھے۔ سسر یا دیور۔ وہ سارا دن کے تھکے ہوئے باہر کے ہزار کام کرتے۔ گھر کے کام بھی کریں گے تو عورتیں کیا مجرا کریں گی؟

نوشی نے سن تھا کہ اس کے آنے سے پہلے سسر یہ کام کرتے تھے۔ شادی کے بعد چند مہینے سسر اٹھتے رہے پھر تنگ آگئے بولے۔ "میں اس مشقت سے تنگ آ چکا ہوں۔" نوشی کو ان پر ترس آیا' کرم کو کہا وہ اٹھا کرے۔ الٹا اس نے پیاری بھری آواز میں کہا۔

"تو کیوں نہیں اٹھ جاتی۔" سسر بیمار ہو گئے پانی کے لیے ہاہاکار مچ گئی۔

نوشی بہت پچھتائی۔

"اگلے دن وہ اٹھی بالٹی بھر بھر ٹنکی میں ڈالی۔ وہ بھر گئی تو حمام اور باورچی میں رکھے ڈرموں کے پاس آئی۔ لیکن بالٹی کے بھرنے تک اونگھ اونگھ جاتی۔ اس سے یہ ہوا کہ اسے فجر کے وقت اٹھ کر جلدی جلدی کام نہیں نپٹانے پڑے۔ آٹا گوندھ لیتی۔ بالٹی انڈیل آتی' رات کے برتن دھو لیتی۔ بالٹی انڈیل آتی۔ کپڑے دھو لیے۔

باری باری سب اٹھتے جاتے بالٹی بھرتے جاتے' نہاتے جاتے جب تک سب ناشتا کر کے جا چکے ہوتے کچن کا برتن برتن خالی ہو چکا ہوتا' ٹنکی میں پانی پیندے سے جا لگتا۔ اب قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا۔

"نوشی! بالٹی بھر گئی۔"

"جی اچھا!" کچن کی کھڑکی سے وہ بھی بالٹی کو ہی دیکھ رہی ہوتی۔ ساس اور بوا برآمدے میں بیٹھی ہوتیں۔ وہ نکل کر دیکھتی "ابھی آدھی ہوئی ہے۔"

"آدھی ہی انڈیل دے۔ تو اپنے دھیان میں لگی رہی اور پانی بہہ گیا تو۔"

وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی وہ اور سب بھلے سے کتنے ہی اپنے اپنے دھیان میں لگے ہوتے پانی کا قطرہ نہیں بہنے دیتے۔ وہ کچن میں کام کرے' کھانا پکائے' سبزی بنائے اپنے کمرے کی صفائی کرے۔ گھر کے دوسرے کام کرے۔ کرم کے' دیوروں کے کپڑے استری کرے۔ کھانا کھائے حتی کہ باتھ روم بھی جائے تو ساتھ ساتھ بالٹی ضرور انڈیلتی جاتی۔

یہ بالٹی اس کا حق مہر تھی۔ گرمی' سردی' بہار' خزاں۔ وہ کسی پل دن میں سو نہیں سکتی تھی۔

دیور آتے ہی ٹنکی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھتے کہ کتنا پانی بھرا جا چکا ہے۔

"نہا لے۔ نہا لے۔" بوا پچکارتی۔

کارخانے میں کام کرتے تھے دونوں' ان کا حق بنتا تھا۔ گھر کا صحن بارش کے دنوں میں ہی دھلتا۔ صحن میں سرخ ٹائلیں لگی تھیں۔ بارش کے دنوں میں ہی سرخ نظر آتیں۔ مٹی سے اٹی رہتیں۔ نوشی کو گھبراہٹ ہوتی۔ وہ کوشش کرتی کہ جلدی جلدی سب بھر جائے تو وہ بالٹیوں سے صحن کو دھو ڈالے۔ کچھ مٹی چھٹے تو سانس آئے۔ مگر ہوتا یوں کہ جیسے ہی سب بھر جاتا جو کہ بہت کم ہوتا۔ بوا اٹھتی۔

"اچھا ہوا۔ اب میں نہا لیتی ہوں۔" وہ نکلتی تو ساس چلی جاتی۔ ساتھ ایک دو کپڑے دھو ڈالتی۔ بھاڑ میں گیا فرش وہ اونی سویٹر سے بھگو بھگو کر ٹائلیں رگڑتی۔

"کیوں اتنا پانی ضائع کر رہی ہو نوشی!"

فرش رگڑ رگڑ اس کی جان نکلی جا رہی ہوتی اور مصیبت فکر پانی کی لگی ہوتی۔

برسات آئی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ بھیگ کر تر بتر ہو گئی پانی بھرنے میں۔ غسل خانے کے باہر نکا لگا تھا پانی کا پریشر اتنا تو ہوتا ہی نہ تھا کہ پائپ لگا کر ہی سب بھر لے۔ کچن میں رکھے ڈرم بھرنے کے لیے اس نے کرم کو کہا کہ وہ مدد کرے' پر وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ ذرا فارغ ہو کر مجھے حلوہ بنا دو۔

پانی کے ساتھ اس کا رشتہ ایسے جوڑ دیا تھا سب نے جیسے نکاح اسی سے ہوا ہو اور اور سسرال سے منہ دکھائی میں بھی یہی ملا ہو۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس کا پیر باورچی خانے کے فرش پر پھسلا اور اس کی کلائی کی ہڈی تڑخ گئی۔ بالٹی ہاتھ سے چھوٹی۔ کلائی سے زیادہ سب کو اسی کا غم زیادہ ہو گا۔ وہ جانتی تھی۔ وہ بھاگی اپنے میکے ہفتہ رہ کر آئی۔ اس نے اماں کو اتنی لمبی لمبی داستانیں سنائیں۔ اس کی اماں کے گھر پانی کا ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے تو زندگی میں کبھی پانی کے اتنے جھمیلے نہیں دیکھے تھے جن میں اب جی رہی تھی خوب روئی اماں کے سامنے۔

اماں نے جیسے تیسے ادھر ادھر سے پیسے پکڑا دیے کہ کرم کو دے کر موٹر لگوا لے۔ خوشی سے اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ اب وہ مزے سے دوپہر کو سویا کرے گی۔ صبح کو آرام سے اٹھا کرے گی۔ وہ ملتان سے شادی ہو کر بڑے گاؤں آئی تھی۔ شہر بدلا نصیب بھی بدلا۔ اس کا نصیب پانی پانی ہو گیا۔ پیسے لے کر خوشی خوشی گھر آئی کمرے میں کرم کو بٹھا کر چپکے سے بتایا اس

نے فوراً "سارے پیسے لے لیے۔
"جانتا ہوں پتا کرتا ہوں کتنا خرچا آتا ہے۔"

وہ ابھی گیا بھی نہ تھا کہ بات سب کے کانوں تک چلی گئی۔ ساس نے ہاتھ نچا نچا کر اس سے پوچھا۔

"جو اتنے گھنٹے موٹر چلے گی اس کا بل وہ دے گا؟"

یہ جو نل لگا ہے اس کا بل تو نہیں بھرنا پڑتا۔

نوشی کی اماں کے دیے پیسے کرم نے جیب میں ڈالے اور پرانی موٹر سائیکل بیچ کر نئی لے لی۔ موٹر آگئی سڑک پر دوڑنے والی۔

وہ روئے جارہی تھی اور بوا دوپٹا کھول کر خود پر پھیلا کر سونے کے چکر میں تھی۔

"ہم نے اتنا عرصہ نہیں بھرا، تو نے بھر لیا تو کیا نیا کیا؟ ہمارے وقت میں تو یہ نل بھی نہ تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے بھر کر لاتے تھے۔ کن کن راستوں سے گزرتے تھے۔ کیسی کیسی نظروں سے پالا پڑتا تھا۔ تو گھر بیٹھے بھر رہی ہے اور شکر نہیں؟ آج کے زمانے کی عورت بڑی ناشکری ہے اسی لیے لعنتی ہے۔"

"ہماری تو عمریں گزر گئیں ہم تو نہ روئے نہ تھکے نہ شکایت کی۔" ساس شروع ہوگئی۔

کرم کمرے میں لیٹا سستا رہا تھا۔

"نوشی۔۔۔! نوشی۔۔۔!" برآمدے کے تخت اور چارپائی سے دو آوازیں آگے پیچھے آرہی تھیں۔ رات وہ روتے روتے سوگئی تو آنکھ ہی نہ کھلی۔

"پانی آگیا بھر لے۔" وہ ڈھیٹ بنی لیٹی رہی۔ بوا اٹھی کہ ساس۔ بالٹی کو دیکھا کہ بھر تو نہیں گئی اور پھر اس کے سر پر آکر کھڑی ہوگئی۔

"وہ اٹھتی کیوں نہیں؟" کرم غنودگی میں ہی دھاڑا۔

وہ چیخ کر اٹھی' دو بالٹیاں بھر کر غسل خانے میں گھس گئی۔ خوب جی بھر کر نہائی۔

بوا اور ساس بل کھا گئیں۔

"اتنا پانی انگنی تو بھر لیتی پہلے۔"

جب تک وہ باہر نکلی۔ دونوں نے ہی باری باری اٹھ کر بالٹی انڈیلی۔ پانی چلا گیا۔ نہ ٹنکی بھری گئی نہ ہی کوئی اور بڑا برتن۔ سب بنا نہائے ہی چلے گئے۔ دوسرے دن کے بعد کہیں پانی آیا۔ اس وقت وہ دونوں اسے اتنی بار منا چکی تھیں کہ وہ باؤلی ہوگئی۔

"کیا ضرورت تھی اتنا غصہ کرنے کی؟" وہ پچھتائی پانی آیا تو سارا غصہ بھلا گئی لیکن بوا بھولنے کی تھیں تھی یہ سب۔ غسل خانہ نیچے تھا اور باتھ روم اوپر چھت پر۔ جو جاتا پانی ساتھ لے جاتا۔ پانی بھرتے بھرتے اس کی کمر ٹوٹنے کے قریب تھی۔ وہ باتھ روم چلی گئی۔

"یہ اتنی اتنی دیر اوپر کیا کرتی ہے؟" بوا کوئی دس بار سر اوپر کی طرف کرکے کہہ چکی تھی۔

"بالٹی بھر گئی ہے نوشی! آجا۔ آتے ہی وہ سب نہائیں گے۔"

"نوشی۔۔۔ نوشی۔۔۔!" آوازیں گونجیں۔ نوشی نہ آئی۔

"نوشی۔۔۔!" ساس برآمدے سے نکل کر صحن میں آکر چلانے لگی۔ اوپر چڑھنے کو تھی کہ وہ جیسے ہڑبڑاتے ہوئے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔

"کب سے پانی بہہ رہا ہے۔" آواز میں اتنا غم تھا جیسے پانی نہیں ...... کسی کا خون بہہ رہا ہو۔

وہ نماز پڑھتی اور پانی کے لیے دعا کرتی۔ نئے ٹیوب ویل کے لیے منتیں مانگتی۔ بوا اور ساس کو اس کی گود کی پڑی تھی اسے نل کی۔ نل گود سے زیادہ پیارا ہوگیا۔ آج کے زمانے کے انداز نرالے ہیں تو دکھ بھی نرالے ہی ہوں گے۔ اور ان دکھوں کے علاج بھی نرالے ہی ہوں گے نا۔

عورتیں کپڑے گہنے کی باتیں کرتیں' خواب دیکھتیں اور اسے پانی سے بھری بالٹی کا خیال للچائے رکھتا۔ اس کے خواب میں ایک موٹا سا پائپ اور پانی کی تیز دھار ہوتی اور وہ پودوں پر بوچھاڑ مار رہی ہوتی۔ اس کا جی چاہتا کہ پانی سے بھرا حوض ہو اور وہ اس میں ڈوب مرے۔ اس سے پیاری موت کیا ہوگی۔

کئی دن گزرے پھر "نوشی۔۔۔ نوشی" ہوئی۔ صحن میں کھڑی دونوں گلا پھاڑ رہی تھیں۔ وہ سمجھی آئی۔ وہ نیچے آئی تو دنگ رہ گئی۔ دونوں کی آنکھوں میں

غصے کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔

"تو اتنی اتنی دیر کیا کرتی ہے اوپر؟" انہوں نے پوچھ لیا۔ اس نے جواب نہ دیا سبزی بنانے لگی بوا نے اپنی بھاوج کو دیر تک تاڑ کر کھنکھارا۔

"وہ ساتھ والوں کا قمر چھت پہ ہی چڑھا رہتا ہے بھاوج! اور وہ چالیس کے پیٹے کا رنگین مزاج کنوارہ اسلم بھی اور وہ ادھر کی چھت والا اور وہ ذرا ہمارے تین گھر چھوڑ کے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔"

"دوپٹا کیوں نیچے ہی چھوڑ جاتی ہے؟"

"وہاں کہاں لٹکاؤں؟"

"سارے زمانے کی نظریں پڑتی ہیں۔" ساس کو اس کا جواب بہت برا لگا۔ نند کی نظریں تاڑ گئی تھیں وہ۔

میکے سے اس کا بھائی اور باپ آئے کہ پائپ کے لیے کھدائی مل کر کرلیتے ہیں۔ موٹر لگا لینے سہولت رہے گی۔ سارے بیٹھے ہوں ہاں کرتے رہے۔ ان کے جاتے ہی وہ فساد ہوا کہ نوشی کا جی چاہا کہ پانی کی ٹنکی میں منہ پر کپڑا باندھ کر گر جائے۔ دم گھٹنے سے مر ہی جائے اور انہیں اگلے دن پانی نصیب نہ ہو۔ لیکن وہ اپنا دم نہ گھوٹ سکی۔ ہاں ان سب کو اگلے دن خوب پانی ملا۔

ساتھ والوں نے موٹر لگوائی تھی۔ ان کی لڑکی جوہی سے نوشی کی علیک سلیک تھی۔

شام ہوئی تو پائپ لے کر آگئی۔

"بھابھی! بھر لو سب کچھ۔ بھائی نے کہا ہے اتنا تیز پانی ہے کہ آدھے گھنٹے میں ہی سب بھر جائے گا اور پائپ ٹنکی میں لگایا۔ فٹافٹ بھر گئی۔ اندر باہر کے سب فٹافٹ بھر گئے۔ ٹھیک ہی کہا تھا بھائی نے۔

اس نے پائپ سے فرش دھو ڈالا۔ فرش چمک چمک کرنے لگا۔ بنا برسات کے ابر برسا اور خوب برسا۔

جوہی سارا وقت بھائی بھائی کرتی رہی۔ "بھائی نے کہا ایسے کرلیتے ہیں ویسے کرلیتے ہیں۔"

وہ خوشی سے کان لگا کر سنتی رہی۔ آخر بھائی کی ہی مہربانی سے آج اس پر مہربانی ہوئی تھی۔ بھائی بھائی کرتی جوہی چلی گئی۔ بھائی بھائی کی سنتی نوشی لمبی تان کر سو گئی۔ نل بہتا رہا۔

اب نوشی' جوہی کی راہ تکا کرتی۔ وہ آجاتی تو اچھی طرح بات کرتی' نزدیک سے نزدیک ہوتی اس سے دوستی بڑھاتی اس دوران دونوں ہنستی رہتیں۔ کبھی نوشی پانی کی بوچھاڑ اس پر کردیتی جوہی خوب ہنسی۔

"بھائی نے کہا کہ موٹر کا بل اگر ہم دونوں مل کر دے دیں۔"

"اے بچی سن۔" بوا کے کان بڑے تیز تھے دھاڑ کر بولی۔

"یہ اپنا بھائی نامہ لے کر یہاں نہ آیا کر۔" وہ بھائی نامہ لے کر چلی گئی۔ نقصان نوشی کا کر گئی۔ رات میں سب اکٹھے ہوئے تو دیوروں نے اسے خاصی کڑی نظروں سے گھورا۔

"بھابھی! شرم نہیں آتی تمہیں؟" وہ سمجھ پائی تو شرم آئی۔

"وہ قمر تمہیں پانی کا پائپ کیوں بھیجتا ہے؟"

"منہ کالا ہو اس پانی کا۔۔۔ خدا کی مار پڑے ایسے پانی پر۔" نوشی رات گئے تک سوں سوں کرتی رہی۔ وہ دنیا کی پہلی عورت ہوگی' جو پانی کی چاہ میں نین مٹکا کرے گی؟ کرم نے بھی سخت نظروں سے دیکھا۔ پتا نہیں کیوں برداشت کرگیا۔

"نند کے یہاں بیٹا ہوا تو ساس اور بوا' دونوں وہاں چلی گئیں۔ نوشی کے پاس چند سو تھے۔ جوہی کو بلوا کر اس کے ہاتھ میں دیے چپکے سے پائپ لگوا کر پانی بھرا اور لمبی تان کر سوگئی۔ نل کا بوند بوند پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے خوب بدلہ لیا پانی سے اسے بہنے دیا۔

اگلے ہی دن صبح دونوں واپس آچکی تھیں۔ اب کرم کے ساتھ اسے جانا تھا۔ منہ اندھیرے پانی بھر کر وہ کرم کے ساتھ آگئی۔ وہ دوسرے شہر رہتی تھی۔ راستے میں وہ اور کرم اونگھتے رہے۔ نند کے گھر گئی۔ ذرا سب ادھر ادھر ہوئے اور وہ نند کے پلنگ پر بچے کے پاس جگہ بنا کر سوگئی۔ نند کو بڑا غصہ آیا۔ جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا۔

"میرے سسرال آئی ہو۔ اپنے گھر نہیں ہو کہ جہاں جی چاہا اونگھ لیا۔"

وہ اٹھ بیٹھی۔

نند کے جیٹھ کا بچہ گلاس بھر بھر پانی گلی میں پھینک رہا تھا۔ اسے غصہ آیا۔ بچے کو جھڑک دیا۔ بچہ رونے لگا۔ نند کو اور غصہ آیا۔

"یہ تمہارا گھر نہیں ہے بھابھی! کہ جان جائے' پانی کی بوند نہ جائے۔"

راتوں کو اس کی نیند پوری نہ ہوتی' اس کا جی چاہتا جلدی سے مر جائے اور جی بھر کر اپنی نیند پوری کرے۔ ٹانگیں پھیلائے' آنکھیں بند کیے بس بے سدھ ہو جائے۔

جوہی کا آنا بالکل ہی بند ہو گیا تھا۔ خاص کر اس دن کے بعد سے جب بوا نے لحاظ کیے بنا کہہ دیا کہ بچی یہاں نہ آیا کرو' پھر سرگوشیاں کیں ساس کے کان میں۔ نوشی سرگوشیاں سن لیتی تو رات ہی رات میں سر کے بال سفید کر لیتی یا دیدوں کی شرم بیچ کھاتی۔

مہینوں بعد اماں کے چکر لگا لیتی۔ وہی اس کی عید ہوتی۔ غسل خانے میں گھسی رہتی۔ سوتی رہتی۔ اماں پوچھتی' اتنی نیند کہاں سے آ گئی۔ اتنا سوتی ہو۔ وہ کہہ دیتی۔

"اماں! صدیوں کی نیند ہے۔"

سیدھی سادی اماں اس کی بات نہ سمجھ پاتی۔

اس دن ایسا ہوا کہ منہ اندھیرے بھی پانی نہ آیا۔ چند بالٹیاں ہی بمشکل بھریں۔ دوپہر تک صرف برتن ہی دھو سکی وہ۔ پھر ٹپ ٹپ ٹپکنے لگا۔ موڑھے پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی۔ اپنے بستر پر جا کر آرام کرتی تو یقیناً" آنکھ لگ جاتی۔ پھر کوئی اٹھانے آتا۔ نیند بھی جاتی اور غصہ بھی نکلتا۔ دیوار سے سر ٹکائے ٹکائے وہ اونگھنے لگی۔ بالٹی بھر گئی۔ سات نسلوں کو بھی سلا کر اگر وہ دونوں سوئی ہوتیں تو ایسے پانی جھتا دیکھ کر اٹھ جاتیں۔ وہی ہوا بوا فوراً" اٹھ بیٹھی۔ بوا نے آواز دی۔ وہ اٹھی پانی انڈیل کر موڑھے پر آ کر بیٹھ گئی۔ بوا نے پھر آنکھ جھپک لی۔ وہ اٹھی' دوپٹا اچھی طرح سے اوڑھا اور اوپر چلی گئی۔

بالٹی سے پانی باہر نکلنے لگا۔ غضب ہو گیا۔ بوا چلانے لگی۔ اس کا نام نہ پکار۔ دونوں گھٹنے پکڑے اٹھی۔ باورچی خانے میں دیکھا۔ کمرے میں دیکھا۔ پچھلے کمرے میں دیکھا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ اوپر چھت کی طرف منہ کر کے آوازیں دیں۔ مگر کوئی بن گن نہ ملی۔ وہ دونوں تو چھت پر چڑھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ ان کے لیے غسل خانے میں ایک طرف چھوٹا فلیش لگوایا تھا۔ یہاں بھی پانی کا ہی مسئلہ تھا۔ ایک' دوبار استعمال کر لیتے تو بدبو سارے گھر میں پھیل جاتی۔ ان دونوں کی تو مجبوری تھی۔

بوا نے تو عرصہ پہلے ہی ایسے واقعے کی پیش گوئی کر رکھی تھی۔

کیسے واقعے کی؟ نوشی کے چال چلن کی۔ اس کے چھت پر اتنا اتنا وقت لگانے کی داستانیں' سرگوشیاں۔

شام کا وقت تھا سسر' دیور آگے پیچھے آ گئے۔ بوا صحن میں بیٹھی ہاتھ مل رہی تھی۔

"وہ چلی گئی کسی کے ساتھ۔ سب دیکھ لیا۔ کہیں نہیں ہے۔"

دیور آپے سے باہر ہونے لگے۔ گھر سے باہر لپک لپک جاتے۔ ساس نے بمشکل قابو کیا۔

"بھابھی چلی گئی۔ بھابھی چلی گئی۔" کرم کو فون کیا۔ وہ بھاگا آیا۔

"کیسے بھاگی؟" کرم نے عجیب بکواس کی۔

یہ عورتیں کیوں بھاگ جاتی ہیں۔ کمروں سے چھت پر۔ سرنگوں سے کھڑکیوں تک۔ روشن دانوں سے نکل جاتی ہیں۔ چاند پر نظر رکھے آسمان کی طرف بھاگ جاتی ہیں۔ کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانسیں کیوں لیتی ہیں۔ بستروں سے لگی زمین کے راستے باہر کیوں نکل جانا چاہتی ہیں؟ کبھی کسی نے سوچا کہ عورت کیوں بھاگ جانا چاہتی ہے۔ یہ کوئی کیوں نہیں پوچھتا؟

بوا بھائی کا قصہ ہوا میں چھوڑ رہی تھی۔ جوہی کے انداز بیان میں' وہ بڑھاپے کی آواز کہاں گئی؟

"میں نے کہا بھائی! نوشی بھابھی کے پانی بھر آؤں۔ بھائی بولے ہاں ہاں جاؤ۔ سارا دن بے چاری پانی بھرتی رہتی ہے۔ ایک پل کو سانس نہیں۔ اپنے گھر میں تو ایسے نہیں بھرتی ہوں گی نا۔ کچھ آرام ملے گا۔ جاؤ جاؤ بائپ لے جاؤ۔ حال احوال رکھا کرو ان کا۔ کمزور سی ہیں' اتنی وزنی وزنی بالٹیاں اٹھاتی ہیں۔ گرمی سردی لگی رہتی ہیں۔ گوری چٹی آئی تھیں' کالی سیاہ ہونے میں دن نہ لگے۔"

بھائی نے اتنا کچھ کہا یا نہیں' لیکن بوا ضرور کہہ رہی تھی۔ دیور بھڑک بھڑک جا رہے تھے۔ کرم کمرے میں جا کر ستانے لگا۔ وہ ہر معاملے میں ہی سست تھا۔ بوا اور ساس بیٹھی اس کے چال چلن کے قصے سنا رہی تھیں اور وہ بھلا مانس اونگھ رہا تھا۔ ساس نے جا کر اسے جھنجھوڑا۔ بھائی الگ غیرت دلانے لگے۔

"وہ گئی۔ وہ گئی۔"

"میں کیا کروں؟" وہ سستی مارا تپ گیا۔ اس سے بڑھ کر نوشی کی کیا اوقات ہوگی۔

بوا کے قصے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے کہ کیسے وہ گھنٹہ گھنٹہ چھت پر لگا کر آتی تھی۔ بہت سے بڑھے رہتے ہیں اپنی اپنی چھتوں پر۔ بنا دوپٹے کے جاتی تھی۔ کہا تھا دوسرے شہر کی نہ لاؤ۔

بوا شادی کے کئی سالوں تک بے اولاد رہی تھی۔ پھر بیوہ ہو گئی۔ اسے لگتا تھا اس کا تجربہ گھر کے سارے مردوں سے زیادہ ہے۔

نل سے بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ بالٹی بھر گئی۔ دیور نے اٹھ کر ٹنکی میں انڈیل دی۔

ابھی بھی اس بوند بوند ٹپکتے پانی کی ہی سب کو پڑی تھی۔

کرم نے اس کے میکے فون کیا۔ پہلے گالیاں دیں' پھر بات بتائی۔ نوشی کی اماں سنتے ہی بے ہوش ہو گئی۔

"کہاں گئی نوشی؟"

"بھاگ گئی اور کیا۔" کرم دھاڑا' پیچھے دونوں دیور۔

"کیوں بھاگے گی وہ؟" نوشی کا بھائی چلایا۔ "کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ۔"

دو گالیاں ادھر سے' دو گالیاں ادھر سے۔ اس دوران بھی دیور۔ سسر بالٹی ٹنکی میں انڈیلتے رہے۔ ٹنکی بھرنے لگی۔ دیور بکتے جھکتے رہے۔ نوشی سامنے ہوتی تو ضرور پوچھتی دیوروں سے۔

"گالیاں دے رہے ہو۔ تمہارے لیے بوند بوند پانی جمع کیا۔ ہزاروں بار ٹنکی بھری کہ تم گرد سے آزاد ہو جاؤ۔ معلوم ہے کتنی مصیبت سے ایک بالٹی بھرتی ہے؟ تہمت لگا رہے ہو؟ کتنی بار تمہارے کپڑے ان بوندوں سے دھوئے۔ خود گندی رہ کر تمہیں صاف رکھا' آرام دیا' اب کیسے باتیں بنا رہے ہو۔ اب سارے عیب نظر آنے لگے ہیں۔ کن تو نظر نہ آئے۔ آنکھوں میں تیرتے آنسو تو نظر نہ آئے۔ اب اتنا کچھ دیکھنے لگے ہو۔ اب کیسے آنکھیں آ گئیں۔ اب کیسے زبان والے ہو گئے۔"

اتنے سوال کرتی نوشی کہ جواب دیتے دیتے وہ پانی پانی ہو جاتے۔ پانی پانی بھی وہی ہوتے ہیں جو پانی کی طرح بہتے ہیں۔ جوہڑوں کی طرح رکے تو بدبو ہی دیتے ہیں بس۔ سسر نے بالٹی بھری اور اوپر چھت پر آ گئے۔

"یہ لیٹرین میں کون ہے۔" چھجے سے سسر نیچے کی طرف منہ کر کے بولے۔

"کون ہو گا۔" دونوں دیور کرم اوپر لپکے۔

کوئی۔ چور۔ لٹیرا۔ کون چھپا بیٹھا ہے۔ رات ہونے کو آئی ہے۔ چھت پر کوئی جاتا ہی نہیں۔ اوپر کاٹھ کباڑ رکھا ہے۔ ساس اور بوا نے بھی اوپر چڑھنے کی کوشش شروع کر دی۔

دیور نے زور کا دھکا مارا۔ دیمک زدہ لکڑی کا دروازہ ایک ہی جھٹکے سے کھل گیا۔ اوہ۔ اوہ۔ اندر کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ ان کے لیے جو آنکھ رکھتے ہیں۔

فلیش پر لکڑی کا تختہ رکھے نوشی دیوار سے سر ٹکائے خراٹے لے رہی تھی۔ اتنی سی جگہ میں وہ بمشکل آڑی ترچھی۔ بوا سے پرے۔ ساس اور دیوروں سے پرے اور قطرہ قطرہ ٹپکتے نل سے بھی پرے۔ مزے سے خراٹے لے رہی تھی۔

☆

پانچویں قسط

صائمہ اکرم چوہدری

سکینہ جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کبڑے پن کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگاتار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کمرا دلوا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی پیشنٹ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکولوجسٹ ہے۔ اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن عائشہ کے کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈیپنڈنٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد رامس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کمپٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زویا کو ان کا سکینہ پر مہربان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی وقتاً فوقتاً سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔

ناولٹ :
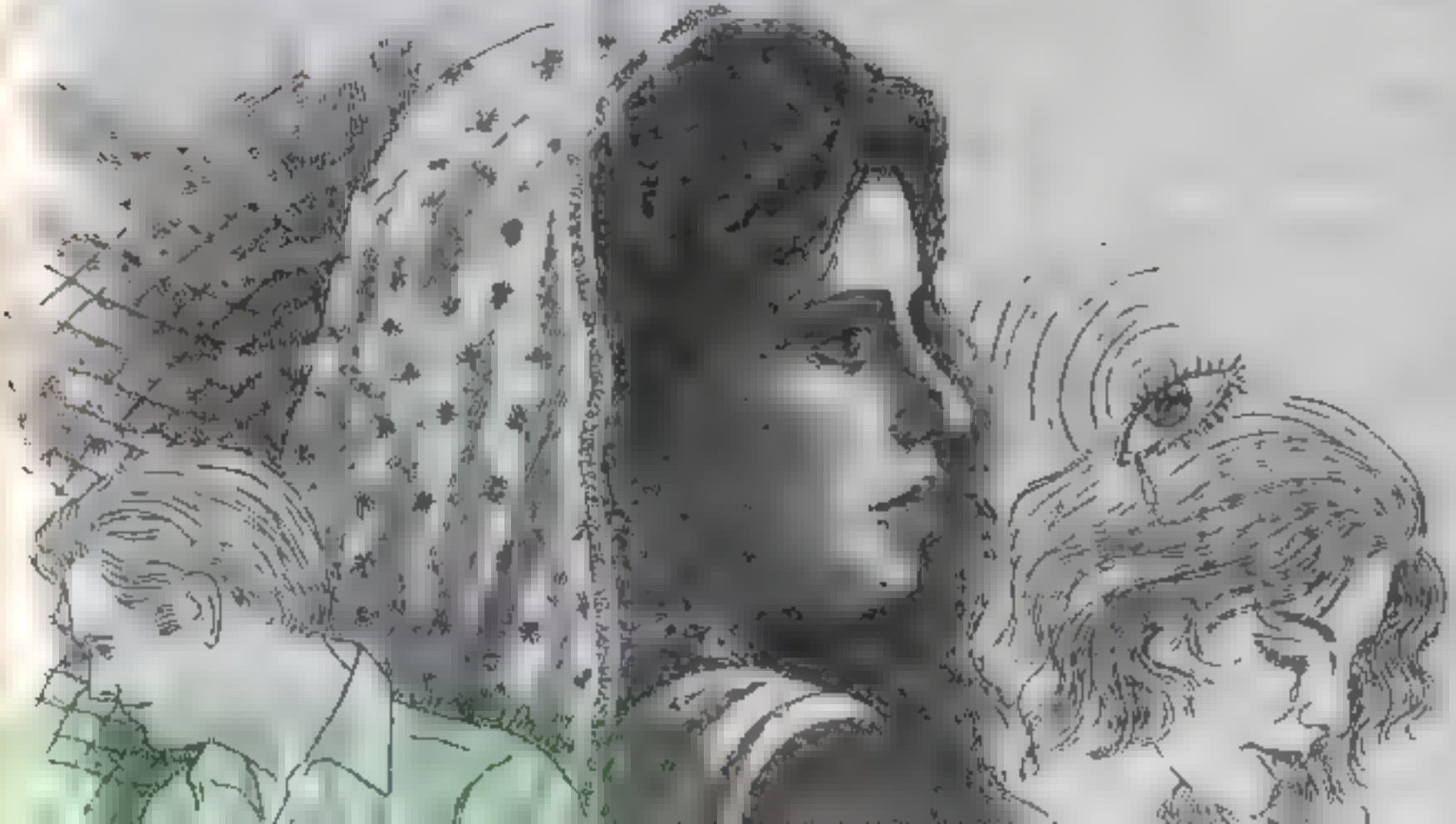
ماہم کے کلینک میں اپنے خراب موڈ کی وجہ سے عائشہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکی اور اس کے عجلت میں واپس چلے جانے پر ماہم کو احساس ہوا کہ وہ اس سے ٹھیک ٹھاک خفا ہو چکی ہے۔ اسی وجہ سے وہ شام کو فوراً" عائشہ کی طرف پہنچی تھی تاکہ اسے منا سکے۔

وہ گیٹ کھول کر اندر آئی۔ سامنے لان میں عائشہ اپنے باغبانی کے مشغلے میں مصروف تھی۔ ماہم کو اندر آتا دیکھ کر بھی وہ اپنے کام میں محو رہی۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور انداز سے لاتعلقی نمایاں تھی۔ ماہم اس کے پاس آگئی۔

"تم مجھ سے خفا ہو؟" وہ خاموش رہی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے ناراض ہونے کی۔" وہ آج کافی دن کے بعد بڑی فراغت کے ساتھ پورچ میں رکھے پودوں میں پانی ڈال رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے مالی بابا کے ساتھ مل کر لان کے پودوں کی کانٹ چھانٹ کا مرحلہ بھی عبور کیا تھا۔ اس لیے اس کے ہاتھ اور کپڑوں میں کہیں کہیں مٹی کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

"رامس کے پروپوزل پر حیران ہونے والی کیا بات تھی۔" ماہم نے تجاہل عارفانہ کا خوب مظاہرہ کیا۔ عائشہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"مجھے حیرانی رامس کے پروپوزل پر نہیں تمہارے تین دن کے بعد بتانے پر ہو رہی تھی۔" عائشہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اسے کچھ باور کروانے کی کوشش کی، جواب خفت زدہ انداز سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں اندازہ تو تھا یار کہ وہ مجھے پروپوز کرنے والا ہے۔" ماہم نے ہلکی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"میرے "اندازوں" کی تم بات نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ تمہارے بارے میں میرے اندازے اکثر غلط ہی نکلتے ہیں۔" اس کے طنز پر ماہم کی پیشانی پر ہلکا سا بل آیا۔

"تم انسانوں کی طرح بیٹھ کر بات نہیں کر سکتیں۔"

ماہم نے اس کے ہاتھ سے زبردستی پائپ پکڑ کر آسٹریلین گھاس پر پھینکا۔

"پہلے تم انسانوں کو انسان سمجھنا تو سیکھ لو، پھر رویوں کی بات کرنا۔" عائشہ نے تیزی سے کہا اور ناراضی کے اظہار کے لیے منہ پھیر کر کوسموس کے پودے کو دیکھنے لگی۔

"تم نے کیا کوسموس کے پودے پر ریسرچ پیپر لکھنا ہے جو مسلسل ان پر نظریں جمائے کھڑی ہو۔" ماہم چڑ کر بولی۔

"کم از کم ان پھولوں کے رنگ اصلی تو ہیں، دھوکا تو نہیں دیتے۔" عائشہ نے سنجیدگی سے کہا تو ماہم کچھ چپ سی ہو گئی پھر خود پر قابو پا کر بولی۔

"آج کیا تمہارا بس لڑنے کا ہی موڈ ہے؟"

"چائے پیو گی؟" اس نے سرد انداز میں پوچھا۔

"اتنے روکھے پھیکے انداز سے پوچھو گی تو کس کافر کا چائے پینے کو دل چاہے گا۔" ماہم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری داستان امیر حمزہ میں خالی پیٹ تو ہرگز نہیں سن سکتی۔ اس لیے چائے پینی ہے تو بتا دو، ورنہ میں اپنے لیے بنوانے لگی ہوں۔" عائشہ کا انداز اگرچہ ابھی بھی اپنے اندر خفگی لیے ہوا تھا، لیکن اس میں نرمی کی جھلک محسوس کر کے وہ بھی بے تکلفی سے بولی۔

"صرف چائے نہیں بلکہ قیمے والے سموسے بھی بنواؤ اور فرنچ فرائز بھی۔"

"یہاں تمہارے رامس صاحب نے کوئی ہوٹل نہیں کھول رکھا جو فرمائشی پروگرام نشر کر رہی ہو۔" اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ محسوس کر کے ماہم نے بڑی جھنجلاہٹ سے پہلو بدلا۔

"ایک بات تو بتاؤ، تمہیں غصہ رامس کے پروپوزل پر آ رہا ہے یا میرے نہ بتانے پر۔" اس کی کھوجتی نظروں پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"پروپوزل تو میرے اب تک ایک سو ایک آچکے ہیں، لیکن تم نے کبھی اس طرح ری ایکٹ نہیں کیا، جس طرح تم رامس کے نام پر کرتی ہو۔" اس کے

بالکل ٹھیک تجزیے پر عائشہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ محترمہ کو رامس علی کے پروپوزل پر اعتراض ہے بس۔" اس نے سو فیصد درست اندازہ لگایا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے لاپروائی سے کہا، ماہم تپ اٹھی۔

"مجھے لگتا ہے تمہارا بات کرنے کا موڈ نہیں۔" وہ برہم ہو کر اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"زیادہ ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں، آرام سے بیٹھ جاؤ، وہ قیمے والے سموسے تمہاری ساس کھائیں گی؟" ماہم بیٹھ گئی اور لاتعلق انداز سے میوسیفولیا کے نیلے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ اس کی ناراضی کو عائشہ نے محسوس کر کے خود کو سنبھالا۔

"یہ لو نیلا پھول۔" عائشہ نے صلح جو انداز سے ایک پھول توڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میں نے سنا ہے نیلے رنگ کے پھول ڈپریشن کے مرض کے لیے جادوئی اثر رکھتے ہیں۔ ان کی رونق، مہک، دلفریبی کسی دوا کی طرح مزاج پر اثر ڈالتی ہے۔" عائشہ کے شرارت بھرے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"بہت بڑی چیز ہو تم۔" اس کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ ماہم نے سکون کا سانس لیا۔

"دیکھا کتنی جلدی اثر ڈالا۔" عائشہ نے دانستہ خوشگوار انداز سے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ کہ پھر کب کر رہی ہو منگنی۔"

"منگنی۔؟" وہ چونکی۔

"میں نے کب کہا کہ اس کا پروپوزل قبول کر لیا گیا ہے؟" اس کی بات پر عائشہ ششدر رہ گئی۔

"کیوں، اب کیا مسئلہ ہے؟" اس نے کوفت زدہ انداز سے پہلو بدلا۔

"مسئلہ تو کوئی نہیں ہے بس دل نہیں مانتا۔" اس نے مختصراً" قصہ نبٹایا۔

"تم نے کب سے دل کے اشاروں پر چلنا شروع کر دیا۔" عائشہ اب غور سے اس کا زرد ہوتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"جب سے دل نے مبہم قسم کے اشارے دینا شروع کیے ہیں۔" اس کے انداز میں اکتاہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" عائشہ نے ایک جانچتی نگاہ اس پر ڈالی۔ اسے یک دم وہ حد درجہ الجھی اور پریشان سی دکھائی دی۔

"پتا نہیں یار! دل کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ اس راستے پر چلنے کی ضد کرتا ہے جس میں خواری ہی خواری ہے۔" ماہم کے انداز میں ہلکی سی جھنجلاہٹ در آئی۔

"مثلاً" کون سے راستے پر۔؟" عائشہ نے اپنے بے قابو ہوتے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"بتاؤں گی بہت جلد، ابھی تو مجھے اپنے تیر آزمانے دو، اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔" عائشہ خوف زدہ نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی بے تحاشا حسین لڑکی کو دیکھا۔ اس کے حسن سے اسے پہلی دفعہ خوف محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن بری طرح گرنے کے بعد سکینہ کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو آئی سی یو کی بہت سی مشینوں کے درمیان پایا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اسے اپنی ہڈیوں میں جان لیوا درد محسوس ہوا۔ اسے آنکھ کھولتے دیکھ کر جمیلہ مائی کا حواس باختہ چہرہ کچھ پرسکون ہوا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی اگلے چوبیس گھنٹے اس نے ادویات کی وجہ سے غنودگی میں گزار دیے تھے۔

"اماں میری شکل کتنی بے سری سی ہو گئی ہے نا۔" آئی سی یو سے کمرے میں منتقل ہونے کے بعد جیسے ہی اس کی نظر آئینے پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو خود بھی ڈر گئی۔ نچلا ہونٹ اور دائیں آنکھ ابھی تک سوجی ہوئی اور ماتھے پر تین ٹانکوں کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ درد کش ادویات

کے باوجود انگ انگ دکھتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ سکینہ کے لیے وہ بڑے اذیت والے لمحات تھے۔

"پتر! شکر کر کہ تیری جان بچ گئی' ورنہ اس دن تو مجھے لگا کہ بس میری دمڑی اب گئی۔" جمیلہ مائی ان کرب انگیز لمحات کو یاد کر کے رنجیدہ ہوئیں۔

"اماں! پتا نہیں ایک لمحے میں کیا ہوا' زمین میرے قدموں سے نکل گئی اور مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔" سکینہ نے ایک دفعہ پھر سامنے لگے شیشے سے نظریں چرائیں۔ دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"پتر! قدموں سے زمین اور جسم سے جان نکلنے میں بس تھوڑا ہی ٹیم لگتا ہے۔ بندہ منٹوں میں چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔" جمیلہ مائی نے انتہائی محبت سے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ اس واقعے کے بعد وہ بہت ڈر گئی تھی۔

"اماں! شکل تو میری پہلے بھی بے سوادی تھی اوپر سے یہ نیا چن (چاند) بھی میرے متھے پر بن گیا ہے۔" سکینہ کی روہانسی آواز پر جمیلہ مائی کے دل کو کچھ ہوا۔

"دیکھ سکینہ! اگر تو نے منٹ منٹ بعد اپنی صورت شیشے میں دیکھ کر رولا ڈالنا ہے تو بتا دے۔ میں ابھی یہ شیشہ دیوار سے اتار کر رکھ دوں گی۔" جمیلہ مائی نے اپنی آنکھوں کو ململ کے دوپٹے سے صاف کیا۔ آج کل ان کی آنکھیں نہ جانے کیوں بار بار نم ہو جاتی تھیں۔

"اماں! دیوار سے شیشہ اتار دینے سے کون سا حقیقت بدل جائے گی۔ اسے لگا رہنے دے' اچھا ہے نا' سکینہ کو اپنی اوقات یاد رہے گی۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش محسوس کر کے جمیلہ مائی کا دل پھٹنے لگا۔

"دیکھ پتر! شکل سے کچھ نہیں ہوتا جو لوگ ہمیں چنگے لگتے ہیں۔ وہ ہمیں ہر حالت میں سوہنے لگتے ہیں۔ جو پیار محبت شکل دیکھ کر کی جائے وہ سچی نہیں ہوتی۔" جمیلہ مائی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"دیکھ ناں اماں! اللہ نے نہ مجھے اچھی شکل دی' نہ عقل دی' نہ پیسہ دیا اور نہ ہی صحت دی۔ کوئی ایک چیز تو دے دیتا۔" سکینہ نے باقاعدہ انگلیوں پر گن کر بتایا تو جمیلہ مائی کو غصہ آگیا۔

"چودہ سال تو فصلوں' کھلیانوں اور پنڈ میں دوڑتے لگاتی پھرتی تھی۔ تو نے اس وقت کون سا اللہ کا شکر کر کے زبان گھسا دی تھی۔" جمیلہ مائی نے اسے نہ چاہتے ہوئے بھی آئینہ دکھایا۔

"اماں! ہر وقت مولوی صاحب کی بیگم کی طرح لیکچر نہ دیا کرو' ویسے ہی میرا دل بہت اداس ہے۔" سکینہ کی آواز میں پہلے کی طرح دم خم نہیں تھا۔

سکینہ نے ایک دفعہ پھر سامنے لگے آئینے میں اپنے گردن پر پڑا نیل دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسی لمحے ڈاکٹر خاور نے کمرے میں قدم رکھا تھا سکینہ نے بے ساختہ بازو کی پشت سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

"سکینہ۔!" ڈاکٹر خاور نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ زبردستی مسکرا دی۔ "بہت بری بات ہے یہ۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"آپ کو پتا ہے سکینہ! میری میڈیکل لائف میں آپ کے گرنے والا واقعہ ایک ایسا سانحہ تھا کہ مجھے حقیقتاً "اپنے پیروں سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔" اس واقعے کے بعد انہوں نے پہلی دفعہ سکینہ سے یوں فرصت میں بات کی تھی۔

سکینہ نے بے یقینی سے ان کا سادہ سا چہرہ دیکھا۔

"لیکن یہ حادثہ ایسا تھا جس نے مجھے بے پناہ خوشی کا احساس بھی دیا اور کرب ناک اذیت سے بھی روشناس کیا۔" وہ بلا تکلف اپنے احساسات بیان کر رہے تھے۔

"میری زندگی کی یہ ایک بڑی خواہش تھی کہ آپ کو اپنے قدموں پر چلتا دیکھوں۔" انہوں نے اضافہ کیا۔

سکینہ کا دل بے قابو ہوا۔

"اور وہ لمحہ بہت اذیت ناک تھا' جب میں نے آپ کو زمین پر بری طرح گرتے دیکھا۔" ان کے لہجے میں دکھ کا ایک جہان آباد تھا۔ "مجھے لگا کہ ایک تیز رفتار ٹرین میرے پرخچے اڑاتی ہوئی گزر گئی ہے۔"

"کیا کیوں۔۔؟" سکینہ بولی نہیں تھی' لیکن اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر یہ سوال کر رہی تھیں۔

"مجھے زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ آپ کے ساتھ میرا صرف ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ نہیں۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر سکینہ سانس لینا بھول گئی۔

"میں نے تجربہ کیا ہے کہ بعض دفعہ احساس اور خلوص کا رشتہ تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اور آپ کے ساتھ میرا تعلق ان ہی دو جذبوں پر مشتمل ہے۔" مسکرا کر سکینہ کے دل کی دنیا میں ایک طوفان برپا کر گئے۔ وہ اپنی سوچی ہوئی آنکھ کے ساتھ سامنے بیٹھے ڈاکٹر خاور کو بے یقینی سے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔

اسے پہلی دفعہ شیشے میں اپنی سوجی ہوئی شکل بری نہیں لگی۔

✡ ✡ ✡

"اف۔۔! میری تو کمر ٹوٹ گئی۔" نابیہ نے بھاری بھر کم بیگ باقاعدہ زمین پر پٹخ کر ثنائلہ کو دیکھا جو ایک لوہے کا ٹرنک بمشکل گھسیٹتی لا رہی تھی۔

"میرا اپنا برا حال ہو گیا ہے۔ سانس ہی بحال نہیں ہو پا رہا۔" بے ربط سانسوں کے ساتھ ثنائلہ بولی۔

"بھائی نے کہا بھی تھا کہ سارا سامان پیک کر دو' میں مزدور بلا کر لے آتا ہوں' لیکن تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دیا۔" نابیہ دھم سے چارپائی پر لیٹ گئی۔

"حد کرتی ہو تم بھی' بڑا بڑا سامان تو وہ ہی اٹھائیں گے' لیکن اب الماریوں سے کپڑے' برتن وغیرہ تو ہمیں ہی سمیٹنے تھے نا۔" ثنائلہ نے پانی والے کولر سے گلاس بھر کر منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گئی۔

"ہائے! ٹانگیں' کمر ہر چیز دہائی دے رہی ہے۔" نابیہ اپنی ٹانگیں دباتے ہوئے بولی تو ثنائلہ ایک دم ڈھیروں خفت کا شکار ہوئی۔

"سوری یار! میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔" ثنائلہ نے اسٹیل کے گلاس میں پانی اس کی طرف بڑھایا۔

"اب زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں' میں نے یہ سب تمہارے لیے نہیں' خالہ کے لیے کیا ہے۔ شکر ہے کہ ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دیکھنے کو ملی ہے۔" نابیہ نے پانی پی کر گلاس چارپائی کے نیچے رکھا اور پھر بے تکلفی سے لیٹ گئی۔

"امی کو تو لگتا ہے کہ نئی زندگی مل گئی ہے۔ اب تو بھاگ بھاگ کر سارے کام کرنے لگی ہیں اور محلے میں بھی نکلنا شروع کر دیا ہے۔" ثنائلہ بھی اس کے پاس ہی آن بیٹھی۔

"ویسے یار! یہ تمہارے ماموں اچانک کہاں سے دریافت ہو گئے اور اتنا بھاری بھر کم چیک بھی بھجوا دیا۔" نابیہ تجسس کے مارے ایک دفعہ پھر اٹھ بیٹھی جب کہ اس کی بے تابی پر وہ مسکرا کر بولی۔

"ہزار دفعہ بتا چکی ہوں کہ ماموں نہیں' ان کا وکیل آیا تھا۔ جس نے اپنے فون سے ممانی سے بھی امی کی بات کروائی تھی اور بتایا تھا کہ نانا کا چکوال والا آبائی گھر اور زمینیں جو ماموں نے بیچی تھیں۔ اس کا حصہ بھجوایا ہے۔"

"لیکن وہ خود کیوں نہیں آئے اور رابطہ کیوں نہیں رکھا۔" نابیہ کی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"ممانی نے بتایا تھا کہ ہمارا پی ٹی سی ایل نمبر جو ان کے پاس تھا' وہ بند ہونے کی وجہ سے رابطہ نہیں ہو پایا۔" اس نے دیوار سے اپنے گھر کے صحن میں جھانکا جہاں سیمنٹ' بجری اور اینٹوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ کل سے گھر کی مرمت ہونے کا کام شروع ہو رہا تھا۔

"تمہارے ماموں سے بات نہیں ہوئی خالہ کی۔؟"

"نہیں' وہ ملک سے باہر تھے' ممانی کہہ رہی تھیں کہ وہ تفصیل سے پاکستان آکر بات کریں گے۔" ثنائلہ کی اطلاع پر نابیہ نے بھی موضوع بدلا۔

"ویسے تم نے یہ اچھا کیا کہ ساون کی بارشوں سے پہلے ہی گھر کی مرمت کا کام شروع کروا دیا۔ ورنہ یاد ہے نا کہ پچھلے سال کتنا مسئلہ ہوا تھا۔" نابیہ اب واش بیسن کے آگے کھڑی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔

"سچ پوچھو تو مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا، شہیر سے تو ہمیں کوئی بھلائی کی امید ہی نہیں تھی۔" ثنائلہ کے لہجے میں بے یقینی کا عنصر محسوس کرکے نابیہ ہنس پڑی۔

"دفع کرو اسے تم، ذرا سوچو کہ پورے گھر میں ٹائلیں لگ کر کتنا خوب صورت لگے گا نا۔" نابیہ نے اس کے پاس آتے ہوئے دانستہ موضوع تبدیل کیا اور وہ واقعی بڑے پرجوش انداز میں گویا ہوئی۔

"گھر کی تعمیر ثنائلہ کا ایک ایسا سپنا تھا جس کے پورا ہونے کی امید اس نے بالکل ختم کردی تھی، لیکن یہ خواب اتنی آسانی سے پورا ہوجائے گا اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ بے یقینی کا شکار تھی۔

"اللہ بہت بے نیاز ہے۔ بس ہم لوگ عجلت کا مظاہرہ کرجاتے ہیں، ورنہ وہ تو اپنے کسی بندے کو تنہا نہیں چھوڑتا۔" نابیہ نے فضا میں موجود مروا کی دلفریب خوشبو کو اندر اتارتے ہوئے کہا تو وہ مسکرادی۔

"اور سناؤ سکندر شاہ کو تم نے بتادیا کہ تمہیں اب جاب کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔" نابیہ نے اچانک ہی اس سے پوچھا تو وہ چونک گئی۔

"وہ تو! میں تو اس افراتفری میں بھول ہی گئی۔ حالانکہ اپائنٹمنٹ لیٹر ملے بھی کافی دن ہوگئے، کیا سوچتا ہوگا وہ کہ پہلے تو کتنی اتاؤلی ہورہی تھی اور اب اس کے نخرے ہی ختم نہیں ہورہے۔"

"چلو کل اس کے دفتر فون کرکے بتادینا۔" نابیہ نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے تسلی دی تو اس نے فوراً کہا۔

"نہیں بیا! اچھا نہیں لگتا، میں کل خود اس کے آفس جاکر بتاؤں گی۔" وہ معصومیت سے بولی تو اس نے کندھے اچکاکر شرارت سے کہا۔

"تم بھی اس سے ملاقات کے بہانے ڈھونڈتی ہو۔"

"نہیں یار۔" وہ ایک دم شرمندہ ہوئی۔ "سچ پوچھو تو عشق کا سارا بھوت ناک کے ذریعے باہر نکل گیا ہے۔ ماہم منصور بالکل ٹھیک کہتی تھی کہ آپ کا مضبوط تخیل آپ کو گمراہ کررہا ہے۔"

"تھینکس گاڈ! تمہیں یہ بات سمجھ میں آگئی۔" نابیہ نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں منہ پر پھیرتے ہوئے بلند آواز میں کہا تو وہ خفیف سی ہوگئی۔

"مجھے لگتا ہے کہ اب سکندر شاہ کو تم سے محبت ہوجائے گی۔" نابیہ کے شریر انداز پر وہ چونکی۔

"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں۔ اس شخص کی آنکھوں میں اتنی اجنبیت اور لہجے میں اتنا روکھا پن ہوتا ہے کہ میری محبت بے چاری آخر کب تک اس کے پیچھے خوار ہوسکتی تھی۔" اس نے خود ہی اپنا مذاق اڑایا تھا جو نابیہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

"اب ایسا بھی کوئی پرنس نہیں۔ پتا نہیں خود کو سمجھتا کیا ہے۔" وہ چڑی۔

"جو بھی سمجھتا ہے۔ بالکل ٹھیک سمجھتا ہے۔" ثنائلہ نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" نابیہ نے بھنویں اچکائیں۔

"بھئی نخرہ تو اسے سوٹ کرتا ہے نا۔" ثنائلہ کی بات پر وہ ہکا بکا انداز سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم آج بھی وہیں کھڑی ہو جہاں آج سے کچھ ماہ پہلے تھی۔ اس لیے خود کو یہ کہہ کر دھوکا مت دو کہ تمہیں سکندر شاہ سے محبت نہیں رہی۔" نابیہ کی دل دکھاتی صاف گوئی پر اس کا دل رنج سے دوچار ہوا اور وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

رامس اور ماہم موسم کی دلفریبی کا لطف اٹھانے ابھی ابھی مارگلہ کی پہاڑیوں کی طرف آئے تھے۔

وہ آج رامس کے بھرپور اصرار پر اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ رامس کچھ عرصے سے اپنے بزنس میں بری طرح مصروف تھا۔

"آج کی شام بہت دلکش ہے۔ لیکن اس کی دل فریبی مجھے اس لیے زیادہ محسوس ہورہی ہے کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔" رامس نے ریسٹورنٹ کے باہر رکھی چارپائی پر بیٹھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی۔

"مجھے یہ جگہ ہمیشہ فیسی نیٹ کرتی ہے۔" وہ اس کے سامنے والی چارپائی پر بڑے شاہانہ انداز سے بیٹھی کوئی مغلیہ شہزادی لگ رہی تھی۔

"اور مجھے ہر وہ جگہ سحر انگیز لگتی ہے جہاں تم میرے ساتھ ہوتی ہو۔" بارش کی ننھی ننھی بوندوں نے ماحول کی خوب صورتی کو دوبالا کیا۔

"تم اتنے زیادہ رومانوی طبیعت کے حامل ہوگے۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔" ماہم نے بڑی ادا سے اسے دیکھا جس کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ماہم کی بات پر اس نے بڑے دل سے قہقہہ لگایا۔

"تم جتنی خوب صورت ہو کہیں بھی چلی جاؤ، وہاں کا ماحول خود بخود دلکش ہوجاتا ہے۔" رامس کے انداز پر وہ مسکرائی۔

"موسم گرما میں بے وقت کی بارش کتنی دل فریب اور رومانی لگتی ہے نا۔" رامس نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو ہر موسم کی بارش ایسی ہی لگتی ہے۔" ماہم نے گھنگھرو کی طرح بجتی ہوا کی آواز سن کر کہا۔

"پتا ہے ماہم! کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ میں تمہیں چاندنی رات کو چاند کے بالکل سامنے بٹھاکر دیکھوں۔"

"تم نے کیا لیدر گارمنٹس کے ساتھ ساتھ مکھن لگانے والی فیکٹری بھی لگالی ہے۔" ماہم کی ہنسی نے اس کے دل کے تاروں کا چھوا۔ بارش میں تیزی آنے کی وجہ سے وہ دونوں اندر والی سائیڈ پر چل دیے۔

"میں مذاق نہیں کررہا ہوں ماہم!" وہ چلتے چلتے رکا اور رامس اس کے گلابی چہرے کو وارفتگی سے دیکھنے لگا۔ "میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاپا کی ڈیتھ کے بعد جب میں مایوسی کی دلدل سے نکلوں گا تو ایک خوب صورت موڑ میرا منتظر ہوگا۔"

"رامس! تم جادوگر ہو۔ تمہاری گفتگو سحر طاری کردیتی ہے۔" وہ مندر کے سامنے بنے برآمدے کے ستون کے پاس آکر رکی۔ بارش کی بوچھاڑ نے دونوں کو بھگو دیا۔ وہ دونوں بازو سینے سے باندھے اسے دیکھ رہا تھا جو اپنی ہتھیلیوں پر پانی کے قطرے جمع کررہی تھی۔

"ہر جگہ بارش کا رنگ جدا ہوتا ہے۔ اتنی خوب صورت بارش میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"

"میں تمہیں دنیا کی ساری بارشوں کے رنگ دکھاؤں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" مدھم گمبھیر لہجہ بارش کی آواز سے ہم آہنگ ہونے لگا۔ مست ہوا نے ماہم کے سارے بال بکھیر دیے تھے۔ بارش کے قطرے اس کے چہرے پر موتیوں کی طرح ٹکے ہوئے تھے۔ وہ بڑی بے خودی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا جس کا پورا وجود کسی اجلی کرن کی طرح تھا۔ وہ اب برآمدے کے کونے میں بیٹھے فقیر کے پاس بیٹھ گئی۔ جس نے اپنے ستار پر کوئی خوب صورت دھن چھیڑ دی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔

"یہ میرا گھر ہے۔ جو شدت سے تمہارا منتظر ہے۔" واپسی پر رامس نے ایف سیون سیکٹر کے ایک خوب صورت بنگلے کے باہر گاڑی روکی۔

"اٹس بیوٹی فل۔" ماہم کی توصیفی نگاہیں بڑے آرٹسٹک انداز میں بنے اس وسیع و عریض گھر پر جم گئیں۔

"پھر تم کب آرہی ہو اس گھر میں مستقل رہنے کے لیے۔" رامس نے اب براہ راست انداز سے پوچھ لیا۔ وہ جو شام سے اس کی معنی خیز گفتگو کو بڑی مہارت اور خوب صورتی سے نظر انداز کرتی آئی تھی۔ اس کی بات پر سٹپٹا سی گئی۔

"تم بھی لے جاؤں، گھر میں صرف ماما اور بھائی ہی ہوں گے۔"

"پاگل تو نہیں ہوگئے ہو، یہ کوئی وقت ہے بھلا۔" اس کی شرارت پر وہ بوکھلا کر بولی۔

"کیا ہوا؟ صرف رات کے ساڑھے دس ہی تو بجے ہیں۔" اس کا انداز بھرپور شوخی لیے ہوئے تھا۔

"شرافت سے مجھے گھر چھوڑ کر آؤ سمجھے۔" ماہم نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"ایک شرط پر؟" وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھا۔ ماہم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "بھئی تمہارے والدین اور تم کتنا وقت لوگے سوچنے کے لیے؟"

"تم ہتھیلی پر سرسوں کیوں جمانا چاہتے ہو؟" ماہم نے بھی دوٹوک انداز سے اسے کہا۔

"پچھلے چھ ماہ سے تمہارا اور میرا ساتھ ہے۔ اب اس سے زیادہ اور کتنا وقت لوگی تم پرکھنے کے لیے؟"

"میں کوئی بھی فیصلہ عجلت میں نہیں کرتی۔" ماہم نے اپنی مجبوری بیان کی تو وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا اور پھر کچھ سنبھل کر گویا ہوا۔ "اوکے' لیکن تم مزید کتنا ٹائم لوگی۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" اس نے کندھے اچکا کر اسے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

"تم جتنے سال مرضی سوچنے کے لیے لے لو' لیکن مجھ سے وعدہ کرو کہ جب بھی فیصلہ کروگی تو وہ میرے حق میں ہوگا۔" گاڑی کا موڑ بڑی مہارت سے کاٹتے ہوئے اس نے بڑی عجیب سی فرمائش کی' جسے سنتے ہی وہ بدک اٹھی۔

"تو یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔؟" اس نے برا سا منہ بنایا تو اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ کر ایک دم اسپیڈ بڑھا دی۔

"رامس! گاڑی آہستہ چلاؤ' ورنہ میں چلتی گاڑی سے اتر جاؤں گی۔" اس کی دھمکی کا فوری اثر ہوا۔

"تم مجھے کیوں اتنا بے بس کر دیتی ہو۔" اس نے اپنے تنتے ہوئے اعصاب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"گاڑی دھیان سے چلاؤ۔" ماہم نے اسے ٹوکا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں کوئی روبوٹ ہوں' جس کا ریموٹ کنٹرول تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جیسا کہتی ہو میں ویسا ہی کرنے لگتا ہوں۔" وہ تقریباً" جھلا سا گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ٹھیک دو منٹ کے بعد وہ گاڑی اس کے گیٹ کے آگے روک چکا تھا۔

"فرض کرو رامس! جیسا تم چاہتے ہو' ویسا نہ ہوا تو تم کیا کروگے؟" ماہم نے بڑا سفاک قسم کا سوال بڑے عام سے لہجے میں کیا تو وہ بھونچکا سا اس کی شکل دیکھنے لگا جیسے سننے میں مغالطہ ہو گیا ہو۔

"بتاؤ نا۔۔۔" ماہم گاڑی سے نکل کر اب کھڑکی پہ جھکی بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گاڑی کی سیٹ سے پشت لگا کر آنکھیں بند کیں اور گہرا سانس لیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ گویا ہوا۔

"پھر شاید میں زندہ نہ رہ سکوں۔" بڑی پست سی آواز میں جواب دے کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ ضبط کی کوشش میں نڈھال سرخ آنکھوں میں اذیت کا ایک جہاں آباد دیکھ کر ماہم حق دق سی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"نسخہ ہائے وفا" عائشہ نے فیض احمد فیض کی کتاب پڑھ کر سائیڈ میز پر رکھی۔ ایک طویل جمائی لے کر وہ ننگے پاؤں کارپٹ پر کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگایا اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی دیوار پر لگے کیلنڈر کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

اس شخص سے دوبارہ ملاقات ہوئے پورے اٹھائیس دن ہو چکے تھے۔ پہلے وہ کہیں نہ کہیں اس سے ٹکرا جاتا تھا اور ہر ملاقات عائشہ کو بڑا خوش گوار سا احساس بخشتی تھی لیکن جب سے وہ اس کے دل کی سرزمین پر داخل ہوا تھا' تب سے منظر عام سے ہی غائب ہو گیا۔ یہ صورت حال عائشہ کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ بار بار ان جگہوں پر جا رہی تھی' جہاں اس سے ملنے کے مدھم سے بھی امکانات ہوتے لیکن نتیجہ ہنوز صفر تھا۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے۔۔۔؟" وہ جھنجلا کر اپنا سیل فون اٹھائے ننگے پاؤں ہی اپنے اسٹوڈیو کی طرف نکل آئی۔ رات کے دو بجے پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اسٹوڈیو کی تمام لائٹیں جلا کر وہ کینوس پر لگی اس تصویر کے سامنے آن کھڑی ہوئی جو اس نے علی کی خصوصی فرمائش پر آئل پینٹنگ کا ایک منفرد تجربہ کرکے بنائی تھی۔

ایک خوب صورت دیہاتی لڑکی صحن میں پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ اس کے پاس دو سفید کبوتر کھیل رہے تھے۔ گھر کے کھلے دروازے پر لگی اس کی آنکھیں کسی کی منتظر تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے انتظار اس کی آنکھوں میں منجمد ہو گیا ہو۔

عائشہ کو لگا کہ جیسے اس کا وجود اس لڑکی میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اس نے کرب سے آنکھیں اس پینٹنگ پر نکادیں جس کا مالک دنیا کے میلے میں کہیں کھو گیا تھا۔ وہ کارپٹ پر رکھے فلور کشن پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آخری ملاقات میں دونوں کے درمیان نمبروں کا تبادلہ بھی ہوا تھا اور اس کے بعد وقفے وقفے سے اس کے مختصر ایس ایم ایس بھی آتے رہے تھے۔

"مجھے خود فون کرکے اس کی خیریت پوچھ لینی چاہیے۔" اس کے دل نے سرگوشی کی۔

"میں کیوں اس کو فون کروں' اس نے وعدہ کیا تھا کہ آرٹ گیلری میں ہونے والی اگلی نمائش اکٹھی دیکھیں گے۔" دماغ نے بروقت ایک یاددہانی کروائی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہو' مصروف بھی تو بہت رہتا ہے۔" دل کی دلیل پر اس نے فون بک سے اس کا نمبر نکالا۔

"ایسی بھی کیا مصروفیت کہ بندہ ایک منٹ کی کال بھی نہ کر سکے۔" انا اس کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"کتنی بے وقوف ہو تم عائشہ! ایک اجنبی شخص کی باتوں پر ایمان لے آئیں۔ اتنی آسانی سے اسے دل کا دروازہ کھولنے کی اجازت دے دی۔ اسے شاید یاد بھی نہ ہو کہ کوئی اس کا انتظار کرتا ہے۔" دماغ نے ٹھیک ٹھاک اس کی کلاس لی۔

"محبت بھلا ان منطقوں کو کہاں سمجھتی ہے۔ اس میں بھلا انا کی گنجائش ہی کہاں۔" دل نے ایک دفعہ پھر اسے دور خلایا۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے۔" اس نے بے بسی سے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

"عائشہ۔۔۔" کسی نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور ہراساں نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا' جہاں موحد سخت حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا کمرا اسٹوڈیو کے بالکل سامنے تھا۔

"مائی گاڈ! تم اتنی رات گئے تک کام کر رہی ہو۔۔۔" وہ اپنی وہیل چیئر آہستہ آہستہ گھسیٹتا ہوا اس کے پاس لے آیا اور کھوجتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا جو قدرے رخ موڑے اپنے آنسو چھپانے کی بھرپور کوشش کرنے لگی تھی۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔۔۔؟"

"میں کچن میں جانے کے لیے نکلا تو تمہارے اسٹوڈیو کی لائٹ جلتی دیکھ کر یہاں آگیا۔" اس نے سادگی سے وضاحت دی تو عائشہ سر جھٹک کر اس کے پاس آگئی۔

"چلیں' باہر چلتے ہیں۔" وہ اس کی وہیل چیئر کی پشت پر آکر اسے دھکیلنے لگی۔ جب کہ موحد اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر الجھ گیا۔

تازہ ہوا کا جھونکا ان دونوں کو طمانیت کا احساس بخش گیا۔

"میں تو ایک عرصے سے رت جگوں کا عادی ہوں۔ مگر تم کیوں جاگ رہی تھیں اتنی رات تک۔" لان کی طرف جاتی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے وہ اس کی بات پر چونک گئی۔

"بس یونہی طبیعت بے زار سی ہو رہی تھی سوچا کہ کچھ کام نبٹالوں۔"

"عائشہ میری طرف دیکھو ذرا۔۔۔" اس کے محبت بھرے انداز پر وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم ٹھیک ہو نا' کوئی مسئلہ تو نہیں۔۔۔" موحد کے لہجے میں ہزاروں اندیشے تھے۔ عائشہ کو بے اختیار اپنے بھائی پر پیار آگیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔

"میں ایک بہادر فوجی آفیسر باپ کی بیٹی اور دلیر فوجی کی بہن ہوں۔ مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔" اس نے دانستہ خوش گوار انداز سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ موحد نے انتہائی محبت سے اس کے بالوں کو سہلایا۔

"میں تمہارا بھائی ہی نہیں بہت اچھا دوست بھی رہا ہوں عائشہ۔" موحد کے جتلاتے لہجے پر اس نے

فوراً" تردید کی۔

"آپ میرے اب بھی بہت اچھے دوست ہیں۔"

"پھر اچھے دوستوں سے دل کی بات نہیں چھپاتے۔" موحد کی بات پر اس کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"آپ سے بھلا میں کوئی بات چھپا سکتی ہوں۔" اس نے لاجواب کیا۔

"میرے دو ہی تو دوست ہیں' ایک آپ اور دوسری ماہم۔" ماہم کے نام پر ایک تاریک سایہ موحد کے چہرے پر پھیلا۔

"کیا حال ہے تمہاری دوست کا۔؟"

"وہ آپ کی بھی تو دوست ہے۔" عائشہ نے فوراً جتلایا تو وہ لاتعلق انداز سے ہنسا۔

"میری اور اس کی دوستی اسی دن ختم ہو گئی تھی جب میں زندگی کی دوڑ میں اس کے ساتھ چلنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اب تو ایک لولا لنگڑا اور پھیکا سا تعلق ہے۔ جو شاید تمہاری وجہ سے مجبوری کی ڈور سے بندھا ہوا ہے۔"

"اور وہ محبت کیا ہوئی۔؟" عائشہ کی بات پر تلخی کا دھواں اس کے چہرے پر پھیلا۔

"جب محبت کی عمارت میں خود غرضی' لالچ اور جھوٹ کی اینٹیں لگنے لگیں تو ایسی عمارت کتنی دیر تک اپنی بنیادوں پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ اسے دیمک لگ جاتی ہے اور کسی دن وہ خود اپنے قدموں میں آن گرتی ہے۔ میں بھی اسی عمارت کے ملبے پر بیٹھا محبت کی موت کا سوگ مناتے ہوئے اپنی عدت پوری کر رہا ہوں۔"

موحد کی بات پر وہ ہلنا ہی بھول گئی۔ اس نے اپنے عزیز جان بھائی کی آنکھوں کی نمی کو اپنے دل میں اترتا محسوس کیا تھا۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بھی پھسلنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"الف اللہ چنبے دی بوٹی میں مرشد لائی ہو۔"

سکینہ کی سوز میں ڈوبی سحر انگیز آواز پورے کوریڈور میں گونج رہی تھی۔ ساون کی بے وقت کی بارش کے بعد اب فضا میں چونکہ خاموشی تھی۔ اس لیے آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔ ویسے بھی چھٹی کے بعد اسپیشل وارڈ میں سناٹا ہی چھایا رہتا۔ اس وقت مختلف وارڈز کی تین چار نرسیں سسٹر ماریہ کی دعوت پر سکینہ کے کمرے میں ڈیرہ لگائے ہوئے تھیں اور گانوں کا فرمائشی پروگرام عروج پر تھا۔ اماں قریبی بازار میں کچھ ضروری چیزیں لینے گئیں تو سسٹر ماریہ بھاگ کر اپنی دوستوں کو اکٹھا کر لائی جن کے سامنے انہوں نے سکینہ کی آواز کی خوب تعریفیں کر رکھی تھیں۔ اس لیے اس وقت اماں کی غیر موجودگی کا بھرپور فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔ سکینہ کو چونکہ بھرپور اہمیت مل رہی تھی اس لیے اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

کدی آمل سانول یار وے۔

میری لوں لوں چیخ پکار وے۔

میری جند ڑی ہوئی اداس وے۔

میرا سانول آس نہ پاس وے۔

آنکھیں بند کیے انتہائی محویت کے عالم میں وہ کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس نے جیسے گانا ختم کر کے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں ڈاکٹر خاور اور ڈاکٹر زوبیا کے ساتھ سر جھکائے شرمندہ کھڑی نرسوں کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔

"بہت خوب سکینہ! میں تو بہت عرصے سے کہہ رہا ہوں کہ آپ موسیقی کی دنیا میں تہلکہ مچا سکتی ہیں۔" ڈاکٹر خاور کے توصیفی لہجے پر اس کے چہرے کی رنگت بحال ہوئی۔

"لیکن ڈاکٹر خاور! بہتر ہے کہ یہ اپنا شوق گھر جا کر ہی پورا کریں۔" ڈاکٹر زوبیا کے کٹ دار لہجے پر ڈاکٹر خاور نے چونک کر دیکھا۔

"یہ اسپتال ہے اور اس طرح شور مچانے سے باقی مریض ڈسٹرب ہو سکتے ہیں۔" اب سسٹر ماریہ نے کوفت سے پہلو بدلا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! یہ دائیں بائیں والے دونوں کمرے بالکل خالی ہیں اور ویسے بھی پرائیویٹ وارڈ میں آج

بالکل رش نہیں۔" اس کی وضاحت پر ڈاکٹر زوبیا جھنجلاہٹ کا شکار ہوئیں۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ کس وارڈ میں کس مریض کی کیا پوزیشن ہے۔ آپ لوگ بھی محفل موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنے اپنے وارڈ میں ڈیوٹی کریں تو بہتر ہے۔" ڈاکٹر زوبیا کی جھاڑ پر سب نرسوں کے چہرے پر اتر گئے۔

"زوبیا! کیا ہو گیا ہے بھئی۔ اتنا اچھا موسم ہے' انجوائے کرنے دیں سب کو' کبھی کبھی تو ایسا موقع ملتا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے نرمی سے سب کو جانے سے روکا تو زوبیا کے چہرے سے برہمی جھلکنے لگی' لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

"سکینہ! وہ سنائیں نا' میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں۔" ڈاکٹر خاور کی فرمائش پر زوبیا کے علاوہ سب لوگ بے ساختہ مسکرا دیے جب کہ سکینہ نے گھبرا کر کن انکھیوں سے ڈاکٹر زوبیا کو دیکھا جو بے زاری سے کھڑی پہلو پہ پہلو بدل رہی تھیں۔

"سنائیں نا۔" ڈاکٹر خاور نے اصرار بھرے انداز سے کہہ کر کرسی سنبھالی۔

"بھئی زوبیا! بیٹھ جائیں نا' اتنی تلف روٹین میں کبھی کبھی تو انجوائے کرنے کا موقع ملتا ہے۔" ان کے اصرار پر وہ بادل نخواستہ بیٹھ گئیں۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے لگتا ہے کہ میں اچھی طرح گا نہیں پاؤں گی۔" سکینہ نے ڈاکٹر زوبیا کی آنکھوں سے نکلتے شعلوں سے گھبرا کر کہا۔

"اب تو سکینہ بڑے سنگرز کی طرح نخروں پر اتر آئی ہے ورنہ تھوڑی دیر پہلے تو آواز پارکنگ تک جا رہی تھی' سنتے ہی خاور مجھے زبردستی یہاں لے آئے۔" ڈاکٹر زوبیا کے لہجے میں طنز کی آمیزش محسوس کر کے سسٹر ماریہ نے برابر والی کو کہنی ماری۔

"سارا غصہ ہی اسی بات کا ہے۔" دوسری نرس کے کان میں سرگوشی کی۔

"سکینہ! جلدی کرو نا' پھر اماں جی آ جائیں گی۔" سسٹر ماریہ نے یاد دلایا تو سکینہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں بند کیں۔ ڈاکٹر خاور کی پرشوق نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں۔" اس نے بڑے جذب بھرے انداز سے تان اٹھائی۔

"وے میں پیر مناون چلی آں۔

پیراں ہو پیراں۔"

کمرے میں بالکل ہی سناٹا چھا گیا۔ ایک لمحے کو تو زوبیا بھی متاثر ہو گئیں۔ وہ ہراساں نظروں سے ڈاکٹر خاور کو دیکھ رہی تھیں' جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے انتہائی محبت اور عقیدت سے سکینہ کا زخمی چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے کسی اور ہی دنیا کے مکیں لگ رہے تھے۔

"سکینہ! تمہاری آواز کے جادو سے بچنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے؟" اس کے گانے کے اختتام پر ڈاکٹر خاور کا جملہ ڈاکٹر زوبیا کو دانت پیسنے پر مجبور کر گیا۔

"خاور! چلیں یا پھر آج یہاں شام غزل منانے کا ارادہ ہے۔" ڈاکٹر زوبیا نے الفاظ چباتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑے۔

"دل تو نہیں کر رہا' لیکن آپ کہتی ہیں تو چلے چلتے ہیں۔"

"دل تو نہیں کر رہا۔" سکینہ نے ان کی گفتگو سے اپنے مطلب کا فقرہ پلو سے باندھا اور وہ ساری رات اس نے خوب صورت وادی میں کسی تتلی کی طرح دھنک رنگوں میں بھیگتے ہوئے گزاری۔ وہ سوتے ہوئے اتنا مسکرا رہی تھی کہ جمیلہ مائی کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جاب نہ کرنے کا مکمل فیصلہ کر لیا ہے؟"

سکندر شاہ کا چہرہ سپاٹ جب کہ لہجے میں سخت بے یقینی تھی۔ شائلہ اس کے اس انداز پر گڑبڑا سی گئی۔ وہ دائیں ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ اپنی بائیں ہتھیلی پر ہلکے ہلکے انداز سے مارتے ہوئے اسے بہت مضطرب لگا تھا۔

"جی میرا اب کسی بھی قسم کی جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔" ثنائلہ نے سنبھل کر وضاحت دی۔

"ایک دفعہ پھر سوچ لیں' اتنی اچھی آفر آپ کو شاید دوبارہ نہ ملے۔"

"جاب سے دلچسپی تو مجھے کبھی بھی نہیں رہی۔ میں تو اپنے گھر کے حالات کی وجہ سے ایسا کرنا چاہ رہی تھی۔" وہ اپنے اوپر جمی اس کی سخت نظروں سے گھبرا کر بولی۔

"پھر ایک دم کیا کوئی جادو کی چھڑی ہاتھ لگ گئی یا آپ کی لاٹری نکل آئی ہے۔" اس کا طنز ثنائلہ کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

"لاٹری ہی سمجھ لیں۔" اس نے سپاٹ سے انداز میں کہا اور کلائی پر بندھی گھڑی پر ٹائم دیکھنے لگی۔ اسے اٹھنے کے لیے پر تولتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"اگر کوئی سیلری کا ایشو ہے تو اس میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔"

"میں نے ایسا کب کہا۔" ثنائلہ کا چہرہ سرخ ہوا تو وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"پھر آپ مجھے جاب نہ کرنے کی اصل وجہ بتائیں۔"

"اصل وجہ۔۔۔؟"

اسے ایک دم ہی غصہ آیا اور اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"ظاہر ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "ابھی پندرہ دن پہلے آپ کو اس جاب کی شدید ضرورت تھی اور آپ ہر حال میں اسے حاصل کرنا چاہتی تھیں' لیکن پندرہ دن میں ایسا کیا ہو گیا جو آپ انکاری ہو گئیں۔"

"بتایا تو ہے کہ میری لاٹری نکل آئی ہے۔" وہ چڑ کر کھڑی ہوئی۔

"دیکھیں! آپ مجھے اصل وجہ بتائے بغیر نہیں جاسکتیں۔" اس کے انداز میں موجود اصرار پر وہ کوفت کا شکار ہوئی۔

"زبردستی ہے کیا؟"

"ہاں ایسا ہی سمجھ لیں۔" وہ بہت عرصے کے بعد کھل کر مسکرایا۔

"میری والدہ کو اپنے بھائی کی طرف سے آبائی زمین میں سے حصہ مل گیا ہے۔ اس لیے مجھے نوکری کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے اصل بات بتا دی تو وہ زیر لب مسکرا دیا۔

"یہ ماموں جی پہلے گمشدہ تھے یا اب ان کا ضمیر جاگ اٹھا ہے۔" اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ ثنائلہ نے گلہ آمیز نگاہوں سے دیکھا اور خاموش رہی۔

"ایم سوری۔" اسے فوراً ہی احساس ہوا۔ "اور وہ جو آپ کا دوسرا مسئلہ تھا؟"

"کون سا۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ہی جو آپ کسی سکندر شاہ کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں' اس کا کیا ہوا؟" اس کے غیر سنجیدہ انداز پر ثنائلہ کو دھچکا سا لگا۔ وہ اس لمحے کو کوسنے لگی جب بے تابی اور عجلت میں وہ اس سے پوچھ بیٹھی تھی۔

"وہ تو میری کہانی کا ایک کردار تھا۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ بری طرح پچھتائی۔ اس کے سامنے مہاگنی لکڑی سے بنے میز کے پیچھے بیٹھا شخص بری طرح چونکا۔

"آپ کہانیاں لکھتی ہیں؟" وہ اب بغور اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ رہا تھا۔

"جی۔" اس نے یوں سر جھکایا جیسے اپنی کسی بڑی غلطی کا اعتراف کر رہی ہو۔

"اچھا تو سکندر شاہ آپ کی کہانی کا ایک کردار تھا' کہاں گیا وہ۔۔۔؟" وہ اب بہت زیادہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

"پھر۔۔۔؟" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"اس ایکسیڈنٹ میں اس کی ٹانگیں ضائع ہو گئیں۔" ثنائلہ کی بات پر اس شخص کو دھچکا لگا اور وہ ششدر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا' جو اس وقت خود بھی کسی کہانی کا ایک اداس سا کردار لگی تھی۔ اس کی بات پر سکندر شاہ کا سارا وجود ہل گیا۔

"کیسا تھا وہ۔۔۔؟" وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بولا۔

"بہت اچھا' خواتین کا احترام کرنے والا' انسانیت سے پیار کرنے والا۔۔۔" اس کے لہجے میں احترام اور عقیدت کے رنگ واضح تھے۔

"حقیقی دنیا میں سکندر شاہ آپ کو کیسا لگا؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"بالکل برعکس۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"آپ کی طرح مغرور نہیں تھا وہ' آپ تو کسی کے گرنے پر گاڑی سے اتر کر دیکھنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔" اسے ایک دم ہی وہ واقعہ یاد آیا تو بڑی صاف گوئی سے کہہ بھی دیا۔

"کیا میں آپ کو مغرور لگتا ہوں؟" اس کی آواز پست اور آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ کنپٹی کے پاس پھڑکتی رگ اس کے اندرونی خلفشار کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔

"جی ہاں۔" ثنائلہ نے بھی آج بہادری کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

"میں مغرور نہیں' معذور ہوں۔"

اس کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی سیکڑوں کرچیاں تھیں جو ثنائلہ کے دل پر پوری قوت سے کھبیں۔ وہ سخت حیرت' بے یقینی اور صدمے سے بڑی میز کے پیچھے چھپے بیٹھے شخص کو دیکھتے ہوئے دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگوں سے ایک دم ہی جان نکلی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ شاید کبھی بھی اس شخص کے سامنے سے نہ اٹھ پائے۔

☼ ☼ ☼

قطار اندر قطار سفیدے کے درختوں میں گھری اس روش کے ایک کونے پر وہ کینوس جمائے بڑی انہماک سے اس تصویر کو مکمل کرنے میں مگن تھی جو اس نے ماہم کی خصوصی فرمائش پر شروع کر رکھی تھی۔ صبح سویرے آج پارک میں لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ رمضان المبارک کے آغاز کے ساتھ ہی مارننگ واک کرنے والے لوگوں کی تعداد میں کمی آگئی تھی۔ اس وقت بھی آسمان پر بادلوں کی وجہ سے ہلکا ہلکا سا اجالا بڑی سستی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔

"مجھے علم تھا کہ یہیں درختوں کے جھنڈ میں پھولوں کی باڑ کے پاس ہوا کی سرگوشیاں سنتے ہوئے آپ اپنے کام میں مگن ہوں گی۔" گمبھیر سا لہجہ عائشہ کو اپنی سماعتوں کا دھوکا محسوس ہوا تھا اس لیے وہ مڑے بغیر اپنے کام میں مصروف رہی' ویسے بھی آج کل دل کی آوازوں نے اسے حد درجہ بے زار کر رکھا تھا۔

"محترمہ! میں آپ سے مخاطب ہوں۔" سفید ٹریک سوٹ میں وہ بالکل اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تو عائشہ کو لگا جیسے اب بصارت بھی اس کے ساتھ دھوکا کر رہی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے کوئی ہزاروں دفعہ اسے سوچا تھا اور لوگوں کے ہجوم میں کھوجا تھا۔

"آپ مجھ سے خفا ہیں کیا؟" وہ قدرے بلند آواز میں بولا تو وہ حقیقت کی دنیا میں آئی۔ وہ اب سخت تحیر آمیز نگاہوں سے اپنے سامنے موجود اس دشمن جاں کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا اتنے غصے سے کیوں گھور رہی ہیں؟" وہ ہنس کر بولا تو عائشہ کو اپنی پچھلے دنوں کی ساری اذیت یاد آگئی اور وہ دانستہ سنجیدگی سے اپنی پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کیسی ہیں آپ۔۔۔؟ پوچھیں گی نہیں کہ میں پچھلے دنوں کہاں غائب تھا؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے مڑے بغیر سپاٹ انداز میں کہا تو وہ تھوڑا سا مایوس ہوا۔

"ہوں۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کہ آپ مجھ سے سخت خفا ہوں گی۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے آپ سے خفا ہونے کی۔" وہ اپنے برش کو کپڑے سے صاف کرنے لگی۔

"ادھر دیکھیں میری طرف۔۔۔" اس نے کینوس اٹھا کر سائیڈ پر کیا اور اس کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔ عائشہ کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ ناراض ہیں مجھ سے اور یہ

آپ کا حق ہے۔"

اس کے گمبھیر لہجے پر عائشہ نے بمشکل اپنے حواس سنبھالے۔

"اصل میں گھر تبدیل کیا تھا۔ اوپر سے کچھ خاندانی جائیداد کے معاملات تھے' ان کو دیکھنا تھا پھر میری جو جاب ہے اس میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کوئی وقت نہیں نکلتا۔" وہ بڑے نرم لفظوں میں اسے ساری تفصیل بتا رہا تھا' عائشہ بالکل خاموش رہی۔

"سوری! مجھے آپ کے ساتھ آرٹ گیلری میں نمائش دیکھنے بھی جانا تھا' مگر ان دنوں میں ایک سیمینار میں مصروف تھا۔" اسے اچانک ایک اور بات یاد آئی۔ وہ اب سامنے بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر بڑے اشتیاق سے عائشہ کو دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پر لکھی خفگی دور ہی سے پڑھی جا رہی تھی۔

"بہت برے ہیں آپ۔" وہ اس کے بالکل سامنے نصب سنگ مرمر کے بینچ پر بیٹھ گئی۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" اس نے گردن کو خم دے کر تسلیم کیا۔

"لیکن آپ پارک کے اسی سنسان سے کونے میں کیوں کام کرتی ہیں۔ درختوں کے جھنڈ سے کوئی جانور نکل آئے تو۔" اس کی فکر مندی عائشہ کو اچھی لگی۔

"انسانوں سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتے جانور۔" اس نے ہنس کر مذاق اڑایا۔

"پھر بھی یہ بہتر نہیں ہے۔ ایک تو آپ صبح سویرے یہاں آجاتی ہیں دوسرے رمضان کی وجہ سے یہاں لوگ بھی کم کم آرہے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں یہاں درختوں کے جھنڈ میں کام کرنے کی۔" اس کا حق جتاتا انداز عائشہ کو طمانیت کا گہرا احساس بخش رہا تھا۔

"میرے ساتھ ڈرائیور ہوتا ہے۔" اس کی ہنسی میں بڑی نرالی سی کھنک آگئی۔

"ہاں وہ ڈرائیور جو پارکنگ میں گاڑی کھڑی کیے سیٹ ریلیکس کرکے خراٹے لے رہا ہے۔ ابھی دیکھ کر آیا ہوں اسے۔" اس نے منہ بنایا تو عائشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"مجھے اس جگہ کام کرنے میں مزا آتا ہے۔"

"ہاں پتا ہے کتنا مزا آتا ہے۔ سارے جہاں کی بے زاری چہرے پر سجائے زبردستی اس فضول سی تصویر پر اسٹروک مار رہی تھیں۔" اس نے چڑایا۔

"یہ فضول سی تصویر ہے؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر حیرت کا اظہار کیا۔

"ایک دم فضول۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"کلر اسکیم آپ نے اتنی ڈارک کردی ہے کہ تصویر میں مصنوعی پن سا آگیا ہے۔ پتا نہیں آپ کا دھیان کہاں تھا۔" وہ ایک سفاک تنقید کار بھی تھا اس کا اندازہ ابھی ابھی عائشہ کو ہوا۔ اس نے خود بھی پینٹنگ کو تنقیدی نظروں سے دیکھا تو اس کی طبیعت کا بوجھل پن ایک نظر میں ہی سامنے آگیا۔

"کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہے ہیں۔" اس کے خفت زدہ انداز پر وہ کھل کر مسکرایا۔

"پس ثابت ہوا کہ جو چیز آپ میرے لیے تخلیق کرتی ہیں' اس میں شامل محبت کے رنگ اسے شاہکار بنادیتے ہیں۔" اس کی شرارت پر عائشہ کا دل دھڑکا۔

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"آج کل کام کا موڈ نہیں بن رہا تھا نا۔" اس کے معصومانہ انداز پر وہ مسکرایا۔

"یہ تو ماہم کے لیے زبردستی بنا رہی تھی۔" اس نے وضاحت دی۔

"ماہم کے لیے۔" وہ چونکا۔

"ان کے لیے تو یہ ایک دم پرفیکٹ ہے' کوئی ضرورت نہیں زیادہ محنت کرنے کی۔" اس کے شوخ انداز پر عائشہ نے اپنی ہنسی کو بمشکل ضبط کیا۔

"میری معصوم سی دوست نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو ایسے کہہ رہے ہیں۔" اس نے مصنوعی خفگی سے دیکھا تو اس نے فوراً" بات قطع کی۔

"معاف کیجیے گا آپ کی دوست معصوم تو ہرگز نہیں۔ ایسے گھورتی ہیں جیسے سالم ہی نگل جائیں گی۔" وہ ہاتھ میں پکڑا پتھر سڑک پر اچھال کر بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" عائشہ کو اچھا نہیں لگا۔

"وہ بہت اچھی لڑکی اور بہت زبردست سائیکو جسٹ ہے۔" اس کی بات پر وہ حیران ہوا۔

"سائیکولوجسٹ۔" وہ حیران ہوا۔

"کیوں آپ کو کیا سائیکولوجسٹ اچھے نہیں لگتے؟"

"مجھے تو بس آپ اچھی لگتی ہیں۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ عائشہ کی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ پرشوق نگاہوں سے اسے ہی تک رہا تھا۔ عائشہ کو اپنا دل بغاوت پر اترتا محسوس ہوا۔

"آپ نے مجھے مس کیا تھا نا۔" اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ عائشہ چاہنے کے باوجود اپنا سر نفی میں نہیں ہلا سکی۔ ماحول میں ایک بھید بھری سی خاموشی نے بڑی تیزی سے احاطہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ ماں' بیٹا کون سے پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔" بڑی عجلت میں لاؤنج کی سیڑھیاں اترتے ہوئے عائشہ نے ماما اور موحد کو چھیڑا۔ جو سر جوڑے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔

"اتنی مشکل سے تو یہ موحد میرے ہاتھ لگا ہے۔ بزنس نے اسے دن رات کا ہوش بھلا رکھا ہے۔" ماما نے شکوہ کیا۔ لیکن ان کے لہجے میں جھلکتا سکون عائشہ نے فوراً" ہی محسوس کیا۔ موحد کے رویے میں تبدیلی کا کم از کم ماما پر بہت خوش گوار اثر پڑا تھا۔ خود موحد بھی اسے بہت بدلا بدلا سا دکھائی دیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" انہوں نے اسے آج کچھ بہتر حلیے میں باہر جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"بیت المال والے بے سہارا بچوں کے لیے ایک فنکشن ارینج کر رہے ہیں۔ میرے ذمے بھی کچھ کام ہیں۔ وہ ہی نپٹانے۔" خلاف توقع عائشہ کی بات پر ماما کا مزاج برہم نہیں ہوا اور وہ قدرے رازدارانہ انداز میں بولیں۔

"تمہاری ماہم سے کوئی ملاقات ہوئی۔"

"کل کرتی ہیں ماما۔" وہ ہنسی "ماہم سے آتے جاتے ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے' کوئی خاص بات؟" اس نے پہلی دفعہ موحد اور ماما کے چہرے پر موجود غیر معمولی سنجیدگی کو محسوس کیا۔

"تمہیں اس نے ثمن کے بارے میں کچھ بتایا؟"

"ثمن آپی کے؟" وہ زبردست انداز میں چونکی۔

"نہیں' کیا؟"

"صبح صبح تمہاری خالہ آئی تھیں۔" انہوں نے اپنی بہن کا ذکر کیا جو ثمن کی ساس تھیں۔

"خیریت ماما!" عائشہ بھی وہیں صوفے پر ان کے پاس آن بیٹھی۔

"بے چاری بہت پریشان تھیں۔ ثمن نے کسی چینل پر مارننگ شو شروع کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے اور انصر کے تعلقات میں ایسی قدر کشیدگی آگئی ہے کہ ثمن گھر چھوڑ کر میکے آن بیٹھی ہے۔" ماما کے انکشاف پر وہ ایک دم پریشان ہوئی۔

"اوہ اٹس سو سیڈ۔" وہ حیران ہوئی۔ "میں نے تو بہت پہلے ہی ماہم کو کہا تھا کہ خالہ کے گھر کا ماحول بالکل ایسا نہیں ہے۔ اس لیے ثمن آپی کو احتیاط کرنی چاہیے۔"

"پھر۔" انہوں نے بے صبری سے پوچھا۔

"آپ کو پتا تو ہے کہ انکل منصور اور آنٹی نے اپنی دونوں بیٹیوں کی ہر بات مان مان کر انہیں خاصا ضدی بنا رکھا ہے۔" ماہم نے صاف گوئی سے کہا۔ "ماہم کو ہی میرا مشورہ پسند نہیں آیا تھا تو ثمن آپی تو اس سے بھی دو قدم آگے ہیں۔"

"اللہ ہدایت دے سب بیٹیوں کو۔" ماما بڑبڑائیں۔

"ثمن چند روز سے میکے آئی ہوئی ہے تم سے کوئی ذکر نہیں کیا ماہم نے؟"

"نہیں۔ پرسوں ہی تو گئی تھی اس کی طرف۔" عائشہ کو یاد آیا۔ "میں نے تو احیان کو بھی نہیں دیکھا وہاں' ورنہ وہ تو خاصا اودھم مچائے رکھتا ہے گھر میں۔"

"احیان کو تو وہ سسرال میں ہی چھوڑ گئی ہے کہ آپ کی اولاد ہے' خود سنبھالیں۔" ماما کی اطلاع پر عائشہ کو

سخت افسوس ہوا ہے۔ وہ بے یقینی سے ماما کا رنج میں ڈوبا چہرہ دیکھنے لگی۔ یہ رشتہ ماما نے ہی کروایا تھا۔ اس لیے عائشہ کو ان کی حد درجہ پریشانی سمجھ میں آتی تھی۔

"ماما! آپ کیوں ٹینس ہو رہی ہیں۔ اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں۔" موحد کا لہجہ پرسکون اور انداز تسلی دلاتا ہوا تھا۔ عائشہ نے چونک کر اس کا فریش فریش سا چہرہ دیکھا۔

"تم بات کرنا نا' ماہم اور ثمن سے۔" ماما کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں میں اپنے کام سے فارغ ہو کر سیدھی ماہم کی طرف ہی جاؤں گی۔" عائشہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو وہ کھوجتی نگاہوں سے عائشہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے اچانک بولیں۔

"ویسے تم بتاؤ کہ یہ انسانوں والی جون میں کیسے آتی جا رہی ہو۔" انہوں نے سفید اور فیروزی کلر کے سوٹ میں اچھی طرح تیار عائشہ کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

"کیوں ماما! کیا کچھ اور لگ رہی ہوں۔" اسے نئی فکر نے گھیر لیا۔

"ہرگز نہیں۔" انہوں نے بے ساختہ اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ "اب کچھ انسانوں والے کام کرنا شروع کیے ہیں تم دونوں نے۔" وہ کچھ دیر پہلے والی پریشانی بھولے اب انتہائی محبت سے دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ موحد کے سیل فون پر کوئی کال آگئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے وہیل چیئر دوسری جانب چلا گیا۔

"ماما! بھائی کی حرکتیں مجھے کچھ مشکوک سی لگ رہی ہیں۔" عائشہ کے شرارتی انداز پر وہ کھل کر مسکرائیں اور فوراً" تائید میں سر ہلایا۔

"آپ کو بھی لگا نا؟" وہ پرجوش ہوئی تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "جب سے موحد نے اپنا ڈاکٹر تبدیل کیا ہے اس میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔"

"بھائی موحد اب ملٹری اسپتال نہیں جا رہے کیا؟" عائشہ اس اطلاع پر تعجب کا شکار ہوئی۔

"نہیں' کوئی اسپانئل سرجن ہے ڈاکٹر خاور' کسی پرائیوٹ اسپتال میں ایک گھنٹے کے لیے آتا ہے۔ مجھے مسز علوی نے بتایا تھا اور میں نے فوراً" موحد کو وہاں بھجوایا تو دیکھو میرے بیٹے میں کتنی مثبت تبدیلی آرہی ہے۔" ماما کا پرسکون چہرہ عائشہ کو بہت اچھا لگا۔

"بہت ینگ سا ڈاکٹر ہے۔ موحد بہت تعریف کرتا ہے اس کی۔" ماما بھی لگتا تھا کہ اس سے کافی متاثر ہو چکی تھیں۔

"لیکن ماما! مجھے تو یہ کوئی اور ہی تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔" عائشہ نے موحد کو غور سے دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تو ماما فوراً" ہنسیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ موحد کی کسی لڑکی سے بات ہوتی ہے۔" ماما نے تھوڑا سا جھک کر سرگوشی کے انداز میں بتایا۔

اس کے چہرے پر کسی دلفریب خیال کا سایہ لہرایا۔

"خدا خدا کر کے تو میں نے اپنے بیٹے میں کوئی مثبت تبدیلی دیکھی ہے۔ مصروفیات نے اس پر اچھا اثر ڈالا ہے۔ تمہارے بابا بھی شکر ادا کر رہے تھے۔" ماما نے تفصیلاً" بتایا تو عائشہ شرارت سے فوراً" اٹھ کر موحد کے بالکل پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

"بھائی! میری بات کروائیں نا۔" وہ بالکل اس کے کان کے پاس آکر شوخی سے بولی۔ موحد نے گڑبڑا کر سیل فون آف کیا۔

"عاشو! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میری فیکٹری سے فون تھا۔" اس نے خفت سے خوامخواہ صفائی دی۔ اس کی آنکھیں اس جھوٹ کا بالکل ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

"میں نے کب کہا کہ فیکٹری سے فون نہیں تھا۔" وہ شریر ہوئی اور اپنے مخصوص انداز میں گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کر موحد کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ نہ جانے کیوں بلش ہوا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ سامنے کچن کی طرف دیکھنے لگا جہاں ابھی ابھی ماما اٹھ کر گئی تھیں۔

"سچی' پکا وعدہ' ماما کو نہیں بتاؤں گی۔" عائشہ نے لالچ دیا تو وہ مسکرا دیا۔

"کیوں اہلقی کی طرح چپک گئی ہو۔"

"چھا۔" عائشہ نے مصنوعی تعجب سے دیکھا۔

"ورنہ جو آپ کے ساتھ زبردستی گوند کی طرح چپکنے کی کوشش کر رہی ہے اس کو کچھ نہیں کہتے۔"

"اس کو بھی بہت سنائی تھیں' لیکن وہ ڈھٹائی میں تم سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔"

موحد کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ عائشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ موحد نے سر اپنا تھام لیا تھا۔

☼ ☼ ☼
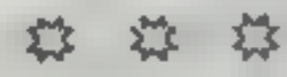
"نہیں نہیں پتر! میری دھی کو بھلا کس نے پھولوں کا گلدستہ بھجوانا ہے۔ تمہیں غلطی ہوئی ہے۔" جمیلہ مائی نے سرخ کیپ پہنے اس نوعمر لڑکے کو بڑی سنجیدگی سے کہا جو ٹی سی ایس کوریئر آفس سے سکینہ کے لیے بکے لے کر اسپتال آیا تھا۔

"ماں جی! آپ کی بیٹی کا نام سکینہ اللہ دتا نہیں ہے کیا۔" اس لڑکے نے جھلا کر سوال کیا۔

"نام تو میری دھی کا یہی ہے۔"

"یہ پرائیوٹ وارڈ کا کمرا نمبر آٹھ نہیں ہے کیا؟" وہ لڑکا تھوڑا سا ہٹ کر اب دروازے پر لگی نیم پلیٹ دوبارہ دیکھنے لگا۔

"یہی ہے۔" جمیلہ مائی نے کوفت زدہ انداز سے اس کوریئر والے لڑکے کو دیکھا جو ڈھٹائی سے سرخ پھولوں کا گلدستہ لیے کھڑا تھا۔

"پھر اسی ایڈریس پر یہ بکے بھجوایا گیا ہے۔" اس لڑکے نے اطمینان سے کہا۔

"لیکن ہمیں کس نے یہ بھجوانا ہے۔" جمیلہ مائی نے ناک پر انگلی رکھ کر سخت تعجب کا اظہار کیا۔ اس احمقانہ سوال پر وہ لڑکا بری طرح جھنجلایا۔

"مجھے کیا پتا خالہ! جس نے بھجوانا ہے۔ میں اپنی طرف سے تھوڑی لے کر آیا ہوں۔" اس کی آواز میں جھنجلاہٹ کے ساتھ کوفت کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔

"آپ یہ وصول کر کے اس رسید پر دستخط کر دیں۔" اس نے رسید بک آگے بڑھائی تو جمیلہ مائی کو جیسے کرنٹ لگا۔

"نہ پتر نہ۔ ہم نے نہیں لینے یہ پھول شول۔" انہوں نے صاف انکار کیا تو اس لڑکے کو بھی غصہ آگیا۔

"دیکھیں اب یہ میں واپس تو نہیں لے کر جا سکتا' آپ وصول کر کے میری طرف سے بے شک پھینک دیں۔ مجھے مزید ڈاک بھی ڈلیور کرنے جانا ہے۔"

"اماں! تو اس سے پوچھ کہ جس نے بھیجا ہے اس کا کیا نام ہے؟" سکینہ نے بے زاری سے جمیلہ مائی کو کہا تو وہ لڑکا فوراً" بولا۔

"کوئی موحد عبدالرحیم ہیں۔ انہوں نے بھیجا ہے۔ ڈی ایچ اے سے۔"

"موحد عبدالرحیم۔" دونوں ماں بیٹی یہ نام سن کر سخت حیران ہوئیں۔

"اس بکے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کارڈ بھی ہے۔" اس لڑکے نے تیزی سے گلدستہ جمیلہ مائی کی طرف بڑھایا۔

جمیلہ مائی نے گلدستہ تھامنے کے بجائے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اس لڑکے کو اندر آنے کا اشارہ کیا تو وہ سرعت سے کمرے میں داخل ہوا۔

"پہلے سائن کر دیں۔" اس نے رسید بک سکینہ کے آگے کی تو اس نے دستخط کر کے وہ گلدستہ پکڑا۔ کوریئر والے نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور چلتا بنا۔

"پیاری لڑکی! تمہارے زخمی ہونے کا پتا چلا' بہت دکھ ہوا۔ اللہ تمہیں صحت اور زندگی دے۔"

"کون ہے یہ موحد؟" ان کی جواب طلب نگاہ سکینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے اماں! یہ وہی لڑکا ہے جو اس دن مقابلہ نعت خوانی میں ملا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بہن بھی تھی' جو مجھے تسلی دے رہی تھی۔" سکینہ نے اماں کو یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

"وہ جو خود بھی وہیل چیئر پر تھا۔" جمیلہ مائی کو فوراً" یاد آیا تو سکینہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن اسے کس نے بتایا کہ تو یہاں داخل ہے؟" سکینہ نے پراسرار سا منہ بنایا۔

"تیرا کیا خیال ہے کہ میں بتا کر آئی تھی۔" سکینہ نے تپ کر کہا۔

"کارڈ پر کیا لکھا ہے۔" جمیلہ مائی نے بے صبری سے پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں! صرف نام لکھا ہے۔" سکینہ نے نظریں چراتے ہوئے جھوٹ بولا۔ جمیلہ مائی بلند آواز میں بڑبڑائیں۔ "آخر اس کو کیسے پتا چلا کہ تو اس اسپتال میں داخل ہے اور اس نے یہ گلدستہ کیوں بھجوایا۔"

"مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اسے میرے گرنے اور زخمی ہونے کا کس نے بتایا؟" سکینہ چاہتے ہوئے بھی اماں کو یہ بات نہیں کہہ سکی۔ ماں بیٹی اس خوشبو کی وجہ سے بوکھلائی ہوئی ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

عائشہ دارالامان میں مقیم اسّی سالہ بابا تاج محمد کو ایمرجنسی میں لے کر پہنچی تو اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ ہر چند روز کے بعد اس دارالامان میں چکر لگاتی تھی اور کچھ وقت ان بزرگوں کے ساتھ گزارتی تھی جنہیں ان کے گھر والے بوجھ سمجھ کر یہاں پھینک گئے تھے۔ اس دن وہ وہاں آئی تو بابا تاج کی طبیعت خاصی خراب تھی۔

وہ انہیں لے کر قریبی اسپتال کی ایمرجنسی میں فوراً" پہنچی۔ ان کی طبیعت سنبھلنے تک وہ اس پرائیوٹ اسپتال میں رہی اور پھر اپنے ساتھ آئے ادارے کے بندے کو ان کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے وہ گھر کے لیے نکلی تو اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔

وہ ایمرجنسی سے نکل کر قریبی کینٹین کی تلاش میں نکلی۔ اسپتال کے اندر بنے میڈیکل کالج کی کینٹین اس وقت بند ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ مین کیفے ٹیریا کی طرف چل نکلی۔ اسلام آباد کے اس مہنگے پرائیوٹ اسپتال میں ہر وقت ہی رش کی کیفیت رہتی تھی۔ وہ بڑی فرصت سے کاریڈور میں چل رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر دائیں کاریڈور سے نکل کر۔ گائنی وارڈ کی طرف جاتے جوڑے کی طرف پڑی۔ وہ بری طرح ٹھٹک کر رکی۔ اس نے بے یقین نظروں سے اپنے کافی فاصلے پر دوسری طرف جاتے علی کو دیکھا۔

"مائی گاڈ!" اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکلی۔

"یہ تو علی تھا۔" وہ سخت خوف زدہ نظروں سے اس خوش باش جوڑے کو دیکھ رہی تھی، جس کی پشت اب اس کی طرف تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے کرتے گائنی وارڈ میں داخل ہو گئے تھے۔

"یہ میرا وہم تو نہیں۔" عائشہ اپنی زندگی کے اس بدترین تجربے سے سنبھلنے کے لیے خود کو تسلی دے رہی تھی۔

وہ پاگلوں کی طرح ان کے تعاقب میں اسی وارڈ کی طرف بھاگی۔ وہ دونوں اس سے کچھ فاصلے پر تھے۔ عائشہ کے چہرے پر بڑی ٹوٹی سی کیفیت تھی۔ اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص اسٹائل کی مسکراہٹ کے ساتھ استقبالیہ پر موجود لڑکی سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس کی بائیں سائیڈ پر سرخ رنگ کے لان کے سوٹ میں ملبوس اسٹائلش سی لڑکی کھڑی تھی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر وہ پہلی دفعہ زندگی میں حسد کے جذبے سے روشناس ہوئی۔ وہ گلاس وال کے پاس رکھے صوفے پر دھم سے بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگوں میں ایک قدم بھی چلنے کی سکت نہیں رہی۔ وہ دونوں اس کی موجودگی سے بے خبر ایک ڈاکٹر کے روم میں چلے گئے تھے۔

"مجھے اس کو کال کرنی چاہیے۔" عائشہ نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے بیگ سے سیل نکالا۔ بیل جا رہی تھی اور عائشہ کو اپنی دھڑکنیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہیں۔

"ٹوں ٹوں ٹوں۔" دوسری جانب سے اس نے کال کاٹ دی۔ عائشہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ اس نے پاگلوں کی طرح دوبارہ اس کا نمبر ملایا۔ اب کہ چوتھی بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو۔" عائشہ کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

"میں تھوڑا سا بزی ہوں۔ آپ کو کچھ دیر میں کال بیک کرتا ہوں۔" عائشہ کو اس کے تحمل بھرے انداز میں عجلت کا عنصر محسوس ہوا۔

"کوئی ضرورت نہیں مجھ سے بات کرنے۔"

اس نے حلق میں اٹکے آنسوؤں کو بمشکل نگلتے ہوئے تلخی سے کہا اور فون اپنے بیگ میں پھینک کر تیزی سے وارڈ سے نکل گئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی اور چہرہ سخت تناؤ کا شکار لگ رہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے کاریڈور میں چل رہی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے اپنی گیلی ہوتی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا۔ دل پر ایک بوجھ آن پڑا تھا۔ جس نے ایک ایک نس میں انتشار برپا کر دیا تھا۔ اسپتال کی پارکنگ تک جاتے ہوئے وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے مسلسل بجتے فون کی آواز سنائی دی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے بیگ کھول کر سیل نکالا تو اس کی تقریباً" آٹھ کالز آ چکی تھیں۔ عائشہ نے فیصلہ کن انداز سے فون اٹھایا اور پاور آف کر دیا۔

وہ اب اسٹیئرنگ پر سر رکھے بالکل بچوں کی طرح سے ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اسے اپنے پورے جسم میں ناقابل برداشت درد محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے وجود کے ریشے ریشے کر رہا ہو۔

وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

✡ ✡ ✡

سرخ ڈینم اسکنی جینز کے ساتھ سفید ٹی شرٹ میں ماہم بڑی اسٹائلش لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ گہری نیلی جینز کے ساتھ گلابی شرٹ میں ثمن آپی بھی کسی سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ اور ثمن پچھلے دو دن سے بھوربن مری میں تھیں۔ اس کی آمد کا سن کر رامس بھی فوراً" ہوٹل پہنچ گیا۔ کیونکہ ماہم نے اسے ارجنٹ کال پر وہاں بلوایا تھا۔ ایک تو بھوربن کا موسم خاصا آفت تھا اور سے رش بھی نہ ہونے کے برابر ورنہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہاں لوگوں کا ہجوم بعض دفعہ بڑی کوفت کا باعث بنتا۔

"بہت ہینڈسم بندہ ہے ماہم! اسے مس مت کرو۔" ثمن آپی نے پہلی ہی ملاقات میں ماہم سے کہا۔ وہ رامس کی وجاہت سے سخت متاثر نظر آ رہی تھیں۔

"بس ایسے ہی کچھ الجھن کا شکار ہو رہی ہوں کہ کہیں عجلت میں آپ کی طرح کوئی غلط فیصلہ نہ کر لوں۔" ماہم نے اورنج جوس کا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔ اس وقت وہ ریسٹورنٹ میں بوفے لنچ کے لیے موجود تھیں۔ خوب صورت رنگوں کی پوشش والی کرسیوں اور خوابناک سے ماحول میں بڑے دھیمے سروں سے بجتا میوزک ریسٹورنٹ کا ماحول بڑا متاثر کن بنا رہا تھا۔

"نصر سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔"

"آپ کو ماما نے کتنا سمجھایا تھا کہ ان کی فیملی بہت دقیانوسی ہے۔ لیکن اس وقت آپ پر محبت کا بھوت سوار تھا۔" ماہم نے منہ پھٹ انداز سے کہتے ہوئے اپنی پلیٹ میں چکن میکرونی سلاد ڈالا۔

"اسی لیے تو اب پچھتا رہی ہوں۔"

"ویسے آپ نے احیان کو وہاں چھوڑ کر بالکل بھی اچھا نہیں کیا، مجھے آپ کا یہ فیصلہ بالکل بھی پسند نہیں آیا۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ احیان کی وجہ سے مجھے کتنے مسائل ہو سکتے تھے۔ اچھا ہے نا اس کے باپ کو بھی پتا چلے کہ ہاں اگر شوز میں تھی تو بچے کو تو پراپر ٹائم مل رہا تھا نا۔" ثمن آپی کا غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

"احیان بہت ڈسٹرب ہے آپی!" ماہم نے ان کے سامنے والی کرسی سنبھالی تو وہ چونک گئیں۔

"تمہیں کس نے کہا۔۔۔؟"

"انفر بھائی کی مدر کی رات میرے سیل پر کال آئی تھی۔" وہ بڑی مہارت سے کانٹے اور چھری کا استعمال کرتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی ان سے بات کرنے کی۔" وہ خفا ہوئیں۔

"اب ان کی کال آئی تھی اور مجھ سے اٹینڈ بھی ہو گئی تو یہ غیر مناسب لگتا تھا کہ میں ان سے بات کرنے سے انکار کر دوں، ویسے بھی جھگڑا تو آپ دونوں میاں بیوی کا ہے۔" ماہم نے بڑے تحمل سے ان کا کوفت زدہ چہرہ دیکھا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہونہہ۔" وہ سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"جھگڑا میرا نہیں، انفر کا ہے۔ اسے میرا شو بز میں کام کرنا، میری ڈریسنگ اور میرے سارے حلقہ احباب سے خوامخواہ چڑ ہو گئی ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ مجھے کسی پنجرے میں قید کر کے رکھ لے۔" انہوں نے اپنی ستواں ناک چڑھا کر بے زاری سے کہا تو ماہم نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"وہ تمہارا مجنوں نظر نہیں آ رہا۔" انہوں نے یونہی بات بدلنے کے لیے رامس کا پوچھا جو اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔

"سوئمنگ کر رہا ہے۔" ماہم نے بتایا۔

"فیملی بیک گراؤنڈ کیسا ہے؟" ثمن آپی کو سخت تجسس ہوا۔

"اچھی پڑھی لکھی اور ویل اسٹیبلش فیملی ہے۔ ننھیال تو سارا برٹش نیشنلٹی ہولڈر ہے۔ باپ کا بھی کروڑوں کا بزنس تھا۔ ان کی ڈیتھ کے بعد اب رامس ہی اسے سنبھالنے کو نکلا ہے۔ صرف دو بھائی اور ایک والدہ ہیں۔" ماہم نے مختصراً اتنا ہی بتایا جتنا وہ جانتی تھی۔

"والدہ اس کی خاصی حسین خاتون ہیں۔ کشمیری لگتی ہیں۔" ماہم کے توصیفی لہجے پر وہ مسکرائیں۔

"بظاہر تو ساری چیزیں اچھی لگ رہی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ فیملی چھوٹی ہے۔ میری طرح پورے جنجال پورے میں نہیں جانا پڑے گا۔ میرے گھر میں تو نندوں کے لنچ ڈنر ہی ختم ہونے کو نہیں آتے۔" ثمن آپی کی ہر بات کی تان اپنی سسرال پر ہی آ کر ٹوٹتی تھی۔

"ہاں تو آپ کون سا روایتی بہو کی طرح ان کے آگے پیچھے پھرتی تھیں۔ سب کو اپنے ٹھکانے پر رکھا ہوا تھا آپ نے۔" ماہم نے دانستہ ان کا مزاج بہتر کرنے کے لیے چھیڑا تو وہ ہنس پڑیں۔

"ہاں یہ تو ہے۔ انفر کی چاروں بہنیں مجھ سے سخت خار کھاتی ہیں۔" ان کے فخریہ لہجے پر ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔

"اور ہاں موحد کا دماغ کچھ ٹھکانے پر آیا۔" انہیں اچانک یاد آیا۔

"ہاں سنا ہے کہ کوئی بزنس وغیرہ اسٹارٹ کیا ہے اس نے اور مصنوعی ٹانگیں لگوانے باہر بھی جائے گا۔"

"شکر ہے کہ تم نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ میری طرح محبت کے چکر میں اس کے پیچھے خوار نہیں ہوئیں۔"

"توبہ کریں۔" ماہم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میرا اتنا اسٹیمنا نہیں۔" وہ تلخی کی حد تک صاف گو تھی۔

"میرا تو خیال ہے کہ ان محبت وحبت کے چکروں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں، بس ہر لحاظ سے اپنا فائدہ دیکھنا چاہیے۔" ثمن آپی کی فلاسفی پر وہ مسکرائی۔ وہ ان سے بالکل متفق تھی، لیکن پھر بھی دل کے کسی نہ کسی کونے سے ایک خواہش سر اٹھاتی محسوس ہوئی تھی۔

"تم رامس کو جوائن کرو گی اب؟" انہوں نے لنچ سے فارغ ہوتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں ذرا ہائکنگ ٹریک تک ہو کر آتی ہوں۔" وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر آئیں۔

مین لابی میں کھڑی کچھ نوعمر لڑکیاں بڑے اشتیاق سے ان کی طرف بڑھیں۔

"آپ مارننگ شو والی ثمن ہیں نا؟؟" ماہم نے مسکراتے ہوئے آپی کو اپنی فینز کے

گھیرے میں دیکھا اور سوئمنگ پول کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں نیلے رنگ کے سحر انگیز پانی میں کچھ بچے اور بڑے پانی کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے میں مگن تھے۔ اسے وہاں آتے دیکھ کر رامس نے بڑے جوش سے ہاتھ ہلایا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"ہائے۔" تولیے سے اپنے گیلے بال صاف کرتا وہ ماہم کے پاس پہنچا۔ سفید شارٹس اور بنیان میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ ماہم سوئمنگ پول کے کنارے رکھی نیلے اور سفید رنگ کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

"مجھے سوئمنگ کا بچپن سے کریز ہے۔" وہ اس کے بالکل سامنے رکھی خالی کرسی پر بیٹھا۔

"تمہیں سوئمنگ آتی ہے؟"

"ہاں بہت اچھی۔" ماہم نے اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں سے نظریں چرائیں۔ وہ کل سے بے تحاشا خوش تھا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ تم نے مجھے کال کر کے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔" وہ کل سے ایک ہی بات بار بار دہرا رہا تھا اور ماہم ہر دفعہ مسکرا دیتی۔ وہ اب کافی مطمئن ہو چکی تھی۔ کچھ ثمن آپی نے اس کی اچھی خاصی برین واشنگ کی تھی کہ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ اس لیے اس کا ارادہ تھا کہ آج شام کی چائے پر وہ اسے مثبت جواب دے ہی دے گی اور وہ ڈائمنڈ رنگ پہن لے گی جو وہ بطور خاص اس کے لیے دبئی سے لایا تھا۔

"آج شام کی ہائی ٹی تمہاری میری طرف سے کارڈن کیفے میں۔" ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ماہم نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔

"کیا آج کی شام کوئی خاص شام ہے۔" رامس نے اسے اپنی گہری آنکھوں کے حصار میں لیا۔

"ہاں بہت خاص۔" اس نے بڑی قاتل نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا جو دل و جاں سے اس پر فدا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں خاص اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر آؤں۔" ماہم کے چہرے پر پھیلی دھنک رامس کے دل میں کئی پھول کھلا گئی۔

"ظاہر ہے اب اسی شارٹس اور بنیان میں تو آنے سے رہے۔" ماہم نے شرارت سے اسے اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ ہراساں نظروں سے رامس کی پنڈلیوں سے اوپر پھل بہری کے سفید گول دائروں میں بنے داغ دیکھنے لگی۔

"رامس! کیا تمہیں برص ہے۔" وہ بہت عجیب نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ اپنی دھن میں مگن ہنسا۔ "ہاں یار! لیکن بس ٹانگوں کے اس تھوڑے سے حصے میں ہی کچھ داغ ہیں اور بہت سالوں سے ہیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"یہ مرض تو وقت کے ساتھ بڑھتا ہے نا۔" نگاہوں کے ساتھ اب اس کا لہجہ بھی کچھ عجیب ہوا۔ وہ عجیب نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ رہی تھی جس نے اتنی بڑی بیماری کو اس سے چھپا رکھا تھا۔ اس کی پیشانی پر بل آنے لگے۔

"اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں۔ یہ داغ تو بہت بچپن سے میری ٹانگوں پر ہیں اور ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔" وہ بڑے مطمئن انداز سے اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جب کہ ماہم کا موڈ بالکل خراب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اندر اٹھتی ناگوار لہروں کو دباتے ہوئے یہ سوچنے میں مگن تھی کہ اس کو شام کی دعوت کیسے کینسل کرنی ہے۔ وہ اب حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے انتہائی خوش و خرم اور مطمئن انداز سے سیل پر گفتگو میں مگن رامس کو دیکھا۔ جس کا نام اس نے ایک دم ہی اپنی زندگی کی کتاب سے کاٹ دیا تھا۔ اب وہ بے زاری اور کوفت سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نظیر فاطمہ

اوائل جنوری کی انتہائی سرد شام تھی۔ سر شام ہی دھند نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس قصبے نما گاؤں کے کچے پکے گھر دھند میں بمشکل اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے تھے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہر گھر میں شام کے کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ بھی گاجر کا حلوہ بنانے کے لیے دیسی گھی میں گاجریں بھون رہی تھی۔ گاجریں بھننے کی اشتہا انگیز خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گاجروں میں دودھ ڈال کر انہیں مزید بھونا' پھر اس میں کھویا اور بادام ڈال کر کڑاہی چولہے سے اتار لی۔ پھر اس نے پڑچھتی سے دو پلیٹیں اتاریں۔ ایک پلیٹ میں حلوہ نکال کر دوسری کو الٹا کر اسے ڈھک دیا۔ دونوں پلیٹوں کو احتیاط سے پکڑے وہ باورچی خانے سے نکلی۔ باہر دھند کو دیکھ کر اس نے لمبا سانس کھینچا جیسے اس ٹھنڈک کو اپنے اندر اتارنا چاہتی ہو۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اماں' ابا کے کمرے کی طرف منہ کرکے آواز لگائی۔

"ابا! میں دینو چاچا کے گھر حلوہ دینے جا رہی ہوں۔ ابھی آتی ہوں۔" وہ اپنے گھر کے دروازے سے نکل کر ساتھ والے گھر کے دروازے پر دستک دینے لگی۔

"ارے آرہا ہوں بابا! کون ہے بھئی؟" اندر سے دینو چاچا کی آواز آئی اور کنڈی کرنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

"سلام چاچا!" وہ سلام کرکے اندر داخل ہو گئی۔

"وعلیکم السلام رضیہ پتر! آ اندر آجا شاباش' آج تو بہت ہی ٹھنڈ ہے۔" وہ دینو چاچا کے پیچھے پیچھے برآمدے میں چلی آگئی۔

"چاچا! میں نے حلوہ بنایا تھا۔ یہ تمہارے لیے لائی ہوں۔" اس نے پلیٹیں دینو کی طرف بڑھائیں۔

"جیتی رہ پتر! تیری وجہ سے مجھے بھی یہ سوغاتیں کھانا نصیب ہو جاتی ہیں۔ میرے گھر میں بھلا کون ہے جو ایسے کام کرے۔" دینو چاچا نے اوپر والی پلیٹ ہٹا کر تھوڑا سا حلوہ چکھا۔

"چاچا! سکندر پاء جی کدھر ہے؟" رضیہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتر! وہ کھاد لینے شہر گیا ہوا ہے۔" چاچا نے انگلیوں کی مدد سے حلوہ کھاتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے چاچا! میں اب چلتی ہوں۔ برتن صبح آکر لے جاؤں گی۔" وہ اپنی چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر باہر نکل گئی۔

گھر پہنچ کر اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور باورچی خانے میں چلی آئی۔ اس نے اماں' ابا اور اپنے لیے پلیٹوں میں حلوہ نکالا اور باورچی خانے کا کواڑ بند کرکے کمرے میں چلی آئی۔

"اماں' ابا! جلدی جلدی حلوہ کھالو۔ ٹھنڈا ہو گیا تو بالکل مزا نہیں آئے گا۔" اس نے انگیٹھی کے گرد بیٹھے ہوئے اماں' ابا کے سامنے پلیٹیں رکھیں اور خود بھی ان کے پاس بیٹھ کر حلوہ کھانے لگی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے اماں' ابا کو دودھ میں پتی ڈال کر

دیا اور اپنی رضائی میں گھس گئی۔

"رضیہ دھی! تو ہماری عادتیں اتنی خراب نہ کر۔ چند مہینوں کی مہمان ہے تو ہمارے پاس۔ اپنے گھر چلی جائے گی تو ہمارے یہ ناز نخرے کون اٹھائے گا؟" ابا نے اسے مخاطب کیا۔

"ابا! کتنی دفعہ کہا ہے کہ ایسے اداس مت ہوا کر۔ تب کی تب دیکھی جائے گی۔" اس نے رضائی سے منہ نکال کر کہا۔

رضیہ کمال دین اور مختاراں بی بی کی بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والی اکلوتی اولاد تھی۔ کمال دین کی اس قصبے کے مین بازار میں پرچون کی دکان تھی۔ اس دکان سے ہونے والی ——— آمدنی اتنی

تھی کہ ان تینوں کا ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا تھا۔ دونوں میاں' بیوی ساتھ ساتھ تھوڑی بہت بچت کر کے رضیہ کی شادی کے لیے پیسے بھی جمع کر رہے تھے۔ پچھلے سال رضیہ کی منگنی کمل دین کے دور پار کے رشتہ داروں میں ہوئی تھی۔ لڑکا نچلے درجے کا سرکاری ملازم تھا۔ اس سال اپریل تک وہ لوگ شادی کرنے کا کہہ رہے تھے۔ ان کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ لہٰذا یہ لوگ تیاریوں میں مصروف تھے۔

کمل دین کے بھائی ساہیوال سے کچھ دور ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھے اور اس کی چاروں بہنیں سیالکوٹ اور نارووال میں بیاہی ہوئی تھی اور وہ خود تقریباً" پچھلے بیس سال سے ساہیوال کے اس قصبہ نما گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔ کمل دین کے اپنے محلے داروں سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ خاص طور پر دین محمد کے ساتھ۔ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار سانجھی تھی۔ دین محمد کے پانچ بیٹے ہی تھے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی اور بیٹی کے حوالے سے اپنے سارے شوق اور چاؤ چونچلے اس نے رضیہ سے لاڈ پیار کی صورت پورے کیے تھے۔ اس کے چار بیٹے اچھے روزگار اور بچوں کی اچھی تعلیم کے لیے مختلف شہروں میں جا بسے تھے۔ پیچھے صرف دین محمد اور اس کا سب سے چھوٹا بیٹا سکندر رہ گئے تھے۔ اس قصبے سے تھوڑے فاصلے پر دین محمد کی کافی زمینیں تھیں۔ جو اللہ کے فضل اور سکندر کی محنت سے بڑی اچھی پیداوار دیتی تھیں۔

اپنے بھائیوں کے برعکس سکندر کو اپنی زمینوں سے بہت پیار تھا۔ اس لیے وہ ان پر بڑی محنت کرتا تھا۔ اس کا یہی ارادہ تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی یہیں رہے گا۔ اب تو ان کے قصبے کے گردو نواح میں بھی بہت سی سہولیات آگئی تھیں۔ دین محمد کے گھر میں کوئی عورت تو تھی نہیں۔ اس لیے یا تو وہ خود کھانا بنا لیتا یا کبھی سکندر بازار سے کھانا لے آتا۔ رضیہ کے ہاں جب بھی کوئی اچھی چیز بنتی' وہ دونوں باپ' بیٹے کا حصہ نکال کر دے آتی۔ دوسرے تیسرے روز ان کی طرف جا کر صفائی ستھرائی کر آتی اور اگر کبھی موڈ ہوتا تو وہ' چار سالن بھی بنا کر دے آتی۔ جب واشنگ مشین لگائی تو ان کے کپڑے بھی دھو دیتی۔

☼ ☼ ☼

"دینو چاچا! دینو چاچا!" وہ آوازیں دیتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہوئی۔ آج بہت دنوں بعد سورج نکلا تھا اور جیسے ہر طرف زندگی جاگ اٹھی تھی۔ وہ اپنے گھر کے کام نپٹا کر دینو چاچا کی طرف چلی آئی۔ تاکہ یہاں بھی صفائی کر لے۔ پچھلے پانچ' چھ روز میں ٹھنڈ ہی اتنی شدید تھی کہ کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہو پایا تھا۔ سب سے پہلے اس نے کمروں میں بچھی ہوئی چارپائیوں کی چادریں بدلیں۔ پھر کمروں اور برآمدوں کی صفائی کر کے صحن میں چلی آئی۔ دینو چاچا صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ کر دھوپ کے مزے لے رہا تھا۔ اسے صحن کی صفائی کرتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"رضیہ پتر!"

"ہوں چاچا!" اس نے مصروفیت کے عالم میں جواب دیا۔

"پتر! تو اپنے گھر چلی جائے گی تو مجھے بہت یاد آئے گی۔ دیکھیے تیرے بغیر کون میرا اتنا خیال رکھے گا۔"

"کیا چاچا! تجھے اور ابا کو ہر وقت ایسی باتیں سوجھتی ہیں۔" وہ جھلا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ دینو "جھلی نہ ہو تو" کہہ کے دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

"کمالے یار! رضیہ دھی کی شادی کی تاریخ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" دین محمد کمالے کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔

"پاء دین محمد! رضیہ کے سسرال والوں سے کل ہی میری بات ہوئی ہے۔ وہ لوگ اپریل کا دوسرا ہفتہ کہتے ہیں۔" کمل دین نے اسے چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔

"کمالے! تجھے پتا ہے ناکہ رضیہ میری بھی دھی ہے۔ تجھے اس کی شادی پر کسی چیز یا پیسوں کی ضرورت ہو تو بالکل نہ سوچنا۔ بس اک اشارہ کر دینا' میں سمجھ جاؤں گا۔" اس نے بڑے خلوص سے کہا۔

"ارے پاء دین محمد! تیرا بہت بہت شکریہ۔ اللہ پاک دا بڑا کرم اے۔ رضیہ پتر کے جہیز اور باراتیوں کے کھانے تک ہر چیز کا بندوبست ہو جائے گا۔ تسی بس دعا کرو کہ اللہ میری دھی کے نصیب چنگے کرے۔"

کمل دین کی آنکھوں میں رضیہ کی جدائی کے تصور سے نمی سی تیرنے لگی۔ رضیہ کی شادی کی باقاعدہ تاریخ طے ہو گئی تو دونوں طرف شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ اس کے اماں' ابا نے اپنی بساط کے مطابق اس کے لیے ہر چیز بنائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"رضیہ دھی! آج تو میرے ساتھ بازار چل کے اپنے لیے کچھ کپڑے اور جوتے خرید لے۔ شادی کے دن پہننے والا جوڑا تو پاء دین محمد کی بہو نے آرڈر پر بننے کے لیے شہر میں ہی دیا ہوا ہے۔ پچھلی دفعہ وہ آئی تھی تو میں نے تیرا ناپ بھی دے دیا تھا۔ وہ تیرا جوڑا سلوا کر لائے گی۔ تجھے پتا ہے ناکہ وہ کتنے اچھے کپڑے پہنتی ہے اور اس سے کہو تو وہ بنوا کر بھی لا دیتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ تیرا جوڑا بڑا اچھا سا بنوائے۔"

اماں نے رضیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ مالٹوں کو نمک لگا لگا کر کھا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں! اور تو حمیداں تائی کو ساتھ لے چلنا۔ وہ بھاؤ تاؤ خوب کر لیتی ہے۔" اس نے رضامندی کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔

"اماں! میں ایسا فرنیچر بنواؤں گی۔" رضیہ نے اپنے قریب بیٹھی اماں کو ٹی وی کی طرف متوجہ کیا۔ جو اس کے دوپٹے پر بیل ٹانک رہی تھیں۔ اماں نے نظریں اٹھا کر ٹی وی کی طرف دیکھا۔ جہاں کسی لگژری ڈرائنگ روم کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔

"کُسیے! اپنی خواہشوں کو بے لگام نہ کر۔ تو جانتی ہے کہ ایسا فرنیچر ہم جیسے لوگ صرف ٹی وی پر دیکھ سکتے ہیں۔ خرید نہیں سکتے۔ تیرے ابا نے تیرے لیے بڑا اچھا فرنیچر بننے کا آرڈر دیا ہوا ہے۔" اماں نے قدرے رکھائی سے کہا۔

"ارے اماں! ناراض تو نہ ہو۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تجھے لگتا ہے کہ میں کوئی ایسی خواہش کروں گی جسے پورا کرنا تم لوگوں کے بس میں نہ ہو۔" اس نے اماں کے گرد بازو لپیٹ کر سر ان کے کندھے پر رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

اسی طرح تیاریاں کرتے ہوئے وقت کیسے گزرا پتا ہی نہ چلا اور رضیہ کی شادی میں دو ہفتے رہ گئے۔ اس کا شادی کے دن پہننے والا جوڑا بھی سل کر آگیا۔ بہت خوب صورت جوڑا تھا۔ اپنی طرف سے ان کی تمام تیاری مکمل ہو چکی تھی۔

"بھلیے لوکے! ایک گلاس پانی تو پلا۔" کمل دین' رضیہ کی اماں سے کہہ کر ڈھیلے ڈھالے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا انداز بہت تھکا ہوا اور چہرے پر سنجیدگی تھی۔ رضیہ باورچی خانے میں شام کے لیے سالن بنا رہی تھی۔

"کیا بات ہے رضیہ کے ابا؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" اماں نے پانی کا گلاس پکڑایا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ کمل دین نے پانی پیا اور ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب بتا بھی دے۔ مجھے بھی پریشانی ہونے لگی ہے۔"

"رضیہ کا سسر آیا تھا آج میری دکان پر۔" کمل دین رکا تو اماں نے اپنی رکی ہوئی سانسیں بحال کیں۔

"تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ انہیں جہیز میں بڑے سائز کا فریج بھی چاہیے۔" کمل دین نے اپنی بات مکمل کی۔

"کیا؟ وہ فریج خود مانگ کر گیا ہے؟ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ کوئی طریقہ ہے یہ۔ تم کہتے ناکہ ہم سے جو ہو سکا ہے ہم نے بنایا ہے۔ فریج تو ان کے گھر میں موجود ہے۔ پھر کیوں مانگ رہا ہے؟ نہیں۔"

کمال دین نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی۔ "بس اب بات کو زیادہ بڑھاوا نہ دے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ پھر یہ بھی تو سوچ کہ آخر استعمال تو ہماری بیٹی ہی کرے گی نا۔"

"لیکن تو جانتا ہے کہ شادی میں دو ہفتے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔ سب خرچوں کے بعد صرف بارات اور ہماری طرف کے مہمانوں کے کھانے کے پیسے ہی بچے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کسی سے قرض نہیں لینا پڑا۔ اب کیا کرو گے؟" اماں نے پریشانی سے پوچھا۔

"دیکھتا ہوں کچھ۔ بس تو کسی کو یہ بات نہ بتانا کہ انہوں نے خود منہ پھاڑ کر فریج مانگا ہے۔ ہم یہی کہیں گے کہ ہمیں خود ہی خیال آگیا کہ یہ بھی جہیز میں شامل ہونا چاہیے۔"

گھر سے باہر نکل کر اس نے دین محمد کے دروازے پر دستک دی۔ دین محمد دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

"آ کمالے!" وہ اسے اپنے ساتھ برآمدے میں لے آیا اور اسے موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے خود بھی دوسرے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ دونوں کا "تقریباً" بیس سالوں کا ساتھ تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی پریشانی میں ہے۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ کمال دین خود بات شروع کرے۔

"پاء دین محمد! تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ جھجکا۔

"تو کرنا یار! اتنا سوچ کیوں رہا ہے؟" دین محمد نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

"پاء! بات یہ ہے کہ رضیہ کے سسرال والوں نے بڑے فریج کا مطالبہ کیا ہے۔ فی الحال میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں فریج خرید سکوں اور اپنے بہن، بھائیوں کو میں یہ بات بتانا نہیں چاہتا۔ اس لیے اگر۔۔۔" وہ بے ربط ہوا اور بات مکمل کیے بغیر ہی رک گیا۔

"کمالے! کوئی بات نہیں۔ رضیہ میری بھی دھی ہے۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ کل سویرے تجھے پیسے مل جائیں گے۔" دین محمد نے کمال دین کو سوال کرنے کی زحمت سے بچایا۔

"پاء! میں تیرا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا اور ایک بات اور، یہ بات کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے۔ بات ہماری عزت کی ہے۔" اس نے جیسے منت کی تھی۔

"اوئے! تو بالکل پریشان نہ ہو۔ جا بے فکر ہو کے گھر جا اور روٹی شوٹی کھا کے آرام نال سو جا۔" دین محمد نے مسکرا کر اس کا کندھا تھپکا۔

کمال دین تو چلا گیا۔ لیکن اس کے دل میں رضیہ کی سسرال کو لے کر عجیب عجیب خیال آنے لگے۔ "کیسے لالچی لوگ ہیں۔ ورنہ عین وقت پر اس طرح کا مطالبہ نہ کرتے۔" وہ ان خیالات کو جھٹک کر اپنا حقہ تازہ کرنے کی نیت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

رضیہ کی مایوں کا دن آن پہنچا۔ اس کی مایوں اور مہندی کی رسمیں رات گئے تک ہوتی رہیں۔ جس میں رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ محلے والوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ رات گئے تک خوب رونق لگی رہی۔

"اماں!" رات کو جب سب سو گئے تو رضیہ نے سوئی ہوئی اماں کو ہلایا۔ "ہوں" اماں نے اس کی طرف کروٹ لی اور اسے روتے ہوئے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟ دھیے کیوں رو رہی ہے؟" وہ اسے اس طرح روتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تو اس کے رونے میں اور شدت آگئی۔ اماں کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔ دونوں کافی دیر ایک دوسرے سے لپٹی رہیں۔ پھر اماں نے اسے خود سے الگ کرکے اس کے آنسو صاف کیے اور اس کے چہرے پر سے بال ہٹائے۔

"چل چپ کر جا پگلی! کیوں رو رہی ہے؟" اماں نے اسے تسلی دی۔

"اماں! میرے دل کو پتا نہیں کیا ہو رہا ہے؟ مجھے نیند نہیں آرہی۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"چل ادھر آکر میرے ساتھ لیٹ جا میری دھی۔" اماں نے اسے اپنے بالکل قریب لٹا کر اس کا سر سہلانا شروع کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں، لیکن اس کا دل ابھی تک عجیب سی پریشانی سے بھرا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

رضیہ پر دلہن بن کر بہت روپ آیا تھا۔ ساری رشتہ دار خواتین نے اس کی بلائیں لیں اور اس کی سہیلیاں اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگیں۔ سب کی باتوں پر بظاہر مسکراتی ہوئی رضیہ کے دل کو گویا پنکھے لگے ہوئے تھے۔ جانے کیسا پریشان کن احساس تھا جو کسی طور ختم ہی نہ ہو رہا تھا۔

محلے کے تین، چار گھر چھوڑ کر ایک خالی پلاٹ تھا جہاں اکثر محلے والے شامیانے لگا کر شادیاں اور دیگر تقریبات بھگتا لیتے تھے۔ رضیہ کی بارات کے بیٹھنے اور کھانے کا انتظام بھی اسی پلاٹ میں کیا گیا تھا۔ بارات آچکی تھی اور شامیانوں میں بیٹھ چکی تھی۔ سکندر سمیت محلے کے سارے لڑکے انتظام و انصرام میں مصروف تھے۔

"السلام علیکم رشید بھرا! کیا حال چال ہے آپ کا؟" کمال دین نے دولہے کے باپ سے سلام دعا کی۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک جی! آپ سناؤ۔" آج تو اس کے انداز ہی نرالے تھے۔ بارات کو شربت وغیرہ پلایا جا رہا تھا۔

دین محمد نکاح پڑھوانے کے لیے مولوی صاحب کو لینے گیا ہوا تھا۔ وہ مولوی صاحب کو لے کر آیا تو شامیانوں میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور اونچا اونچا بولنے کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ وہ کسی انہونی کے خدشے کے پیش نظر بھاگتا ہوا شامیانے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کمال دین، رشید کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ وہ "فوراً" آگے بڑھا۔

"کمالے! کیا ہوا؟ یہ تو اس طرح کیوں کھڑا ہے؟" کمالے کے دونوں بھائی اس کی طرف سے بول رہے تھے۔ ادھر سے رشید، اس کی بیوی اور سب سے بڑھ کر دولہا صاحب خود مقابلے پر تھے۔ ان کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہوا کہ انہوں نے کمالے سے نئی موٹر سائیکل مانگی ہے اور موٹر سائیکل نہ ملنے پر بارات واپس لے جانے کی دھمکی دی ہے۔ کمال دین کا رنگ متوقع رسوائی کے خوف سے بالکل زرد ہو گیا اور اس کی بیوی باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی۔ اس کے لیے کچھ بھی بولنا محال ہو رہا تھا۔

"دیکھو جی! آپ لوگ مل کر فیصلہ کرلو، ہمارا وقت بڑا قیمتی ہے۔" دولہا نے تکبر سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

"تہاڈی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس وقت یہ جھگڑا کھڑا نہ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک مہینے کے اندر اندر موٹر سائیکل کا بندوبست کردوں گا۔" کمال دین منت پر اتر آیا۔

"تو پھر ہم آپ کی بیٹی کو بھی ایک مہینے بعد لے جائیں گے۔" دولہا کی ماں نے اس "کار خیر" میں مزید حصہ ڈالا۔

"اس تو تو میں میں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کمالے! تو ادھر آکر میری بات سن ذرا۔" دین محمد اسے بازو سے پکڑ کر سائیڈ پر لے گیا۔ پھر وہ دولہا والوں سے مخاطب ہوا۔

"تسی تھوڑا انتظار کرو۔ اور باقی لوگ آرام سے کرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر تماشا دیکھتے مہمانوں سے کہا۔

دین محمد، کمالے، اس کی بیوی اور بھائیوں کو لے کر اس کے گھر آیا۔ رضیہ کو بھی کسی نے سارے معاملے کی خبر دے دی تھی اور وہ رسوائی اور بے عزتی کے خوف سے باقاعدہ کانپ رہی تھی اور بے آواز آنسو تواتر سے اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ یہ سب لوگ اس کے پاس آئے تو وہ بھاگ کر ماں کے گلے سے جا لگی۔ کمالے میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اسے تسلی ہی دے دیتا۔ دین محمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر

کراسے تسلی دی۔ پھران سب لوگوں نے بند کمرے میں ایک میٹنگ کی۔

"ہوئے بلے! ذرا سکندر کو میرے کول بھیج۔" دین محمد نے باہر نکل کر محلے کے ایک لڑکے کو آواز دی۔

سکندر آیا تو اسے بھی میٹنگ میں شامل کرلیا گیا۔ تقریباً" آدھے گھنٹے بعد سب مطمئن چہروں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلے۔ اماں رضیہ کو مسکراتے ہوئے تسلی دینے لگیں اور دین محمد سکندر کے موبائل سے اپنے بیٹوں اور بہوؤں سے بات کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

یہ گروپ واپس شامیانوں میں پہنچا تو سب لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے۔

"ہاں جی! پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟" رشید نے بے صبرے پن سے پوچھا۔

"ہاں جی! فیصلہ ہو گیا ہے۔" کمالے کے بھائی نے جواب دیا۔ دولہا کے باپ نے فخر سے پھول کر اپنے بیٹے کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی جنگ فتح کرلی ہو۔

"ایک بات اور موٹر سائیکل ہنڈا ہونی چاہیے۔" رشید مزید پھیلا۔

"ہنڈا نہ کوئی اور، ہم نے موٹر سائیکل نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔" کمال دین کے دوسرے بھائی نے رشید کے سر پر بم پھوڑا۔

"تسی شاید بھول رہے ہو کہ موٹر سائیکل نہ ملی تو ہم بارات واپس لے جائیں گے۔" رشید نے کمال دین کے پرسکون چہرے کو دیکھ کر الجھتے ہوئے کہا۔

"آپ شوق نال بارات واپس لے جاؤ۔" کمبے کے دین محمد گویا ہوا۔ "تسی چپ کرو ہمیں گھر والوں سے بات کرنے دو۔" اسے دین محمد کی دخل اندازی ناگوار گزری۔

"چلو آپی گھر والوں سے بات کرلو۔" دین محمد نے مسکرا کر ہاتھ جھاڑے۔

"یار دین محمد ٹھیک کہہ رہا ہے۔" کمالے نے لب کشائی کی۔

"کمال دین! تو پاگل ہو گیا اے۔ بارات واپس چلی گئی تو سوچ تیری کتنی بے عزتی ہوگی اور تیری دھی کے بارے میں کتنی باتیں بنیں گی۔ کون ویاہ کرے گا ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی بارات بوہے سے واپس گئی ہو۔ لوگ تجھے کتنا ذلیل کریں گے۔" رشید نے سفاکی کی انتہا کردی۔

"رشید بھرا! کس کی مجال ہے کہ کسی نوں عزت یا ذلت دے سکے۔ یہ تو رب سوہنے کے کام ہیں۔ وہ جسے چاہے عزت دے، دے اور جسے چاہے ذلیل و رسوا کردے۔" کمال دین نے جواب دیا۔

سارا پنڈال ایک تماشا گاہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بات بنتی نہ دیکھ کر رشید نے آواز لگائی۔

"او منڈیو! چلو سب نوں جمع کرو واپس چلو۔"

"او ئے سلطان! چل تو دی اترا اسٹیج توں میں ویکھا ہوں یہ آج اپنی دھی کو کیسے رخصت کرتا ہے؟" رشید نے بازو پکڑ کر دولہا کو نیچے اتارا۔

اس کا خیال تھا ابھی یہ لوگ اس کے پیر پکڑ کر منت کریں گے۔ لیکن سب کے سب بے پروا کھڑے تھے۔ سارا محلہ اس صورت حال سے پریشان تھا کہ بارات واپس چلی گئی تو کیا ہوگا؟

"یہ دیکھنے کے لیے کہ آج کمالا چاچا اپنی بیٹی کو کیسے رخصت کرے گا۔ آپ کو کچھ دیر یہاں رکنا پڑے گا۔" سکندر نے پہلی بار لب کھولے۔

رشید کون سا واپس جا رہا تھا۔ وہ تو صرف دھمکی دے رہا تھا۔ اس لیے سب کو اکٹھا کرنے کے باوجود پنڈال سے باہر نہ نکلا۔

"مولوی صاحب! بسم اللہ کرو۔" دین محمد نے مولوی صاحب اور سکندر دونوں کو اسٹیج پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ سکندر کو کپڑے تک بدلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مولوی صاحب نے نکاح پڑھانے کی کارروائی شروع کردی۔ رشید سارے باراتیوں میں گھرا حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔

"اوئے تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ اپنی دھی کا نکاح کسی اور کے ساتھ پڑھا رہے ہو۔ بارات تو ہم لے کر آئے تھے۔ یہ تو ہماری بے عزتی ہے۔" رشید کی بیوی آگے بڑھی۔

مہمانوں میں سے کوئی بھی ان کی طرف داری میں نہ بولا۔ کیونکہ سب ہی ان کا گھٹیا پن دیکھ چکے تھے۔ باراتیوں میں سے بھی صرف دو، چار لوگ ہی ان کی حمایت میں بول رہے تھے۔ انہوں نے بہت واویلا کیا۔ لیکن بات نہ بنی۔ اسی دوران نکاح کی کارروائی مکمل ہوگئی۔ لڑکے والوں نے اپنی چال خود پر الٹتے دیکھی تو ایک اور وار کیا۔

"آپ سب لوگ دیکھ لو کہ ان کی لڑکی کا اس لڑکے کے ساتھ ضرور کوئی چکر تھا اور اس نے ضرور کوئی ایسی حرکت کی ہے کہ اس کے باپ نے بوہے چڑھی بارات کو چھوڑ کر اس کا نکاح اس لڑکے سے کروا دیا ہے۔" دولہا کی ماں نے سکندر کی طرف اشارہ کیا۔ رشید بھی بڑھ چڑھ کر اپنی بیوی کا ساتھ دینے لگا۔

"بس او منڈیا! یہ ہمارے قصبے کی عزت کا معاملہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے نا اس میں کمال دین یا کسی اور کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سب تم لوگوں کی بدنیتی اور لالچ کا جواب ہے۔ اب چپ چاپ یہاں سے کھسک لو ورنہ میرے ایک فون پر پولیس تم لوگوں کو اٹھا کر لے جائے گی۔ تم لوگ شاید جانتے نہیں ہو کہ میرا بھانجا ایس ایچ او ہے اور یہ علاقہ بھی اسی کے انڈر آتا ہے۔"

علاقے کا سابقہ کونسلر ملک سلطان عباسی اس جھگڑے کی اطلاع ملنے پر بھاگا آیا تھا اور آتے ہی اس نے رشید اور اس کے حامیوں کی بولتی بند کروائی تھی۔

"ایسے لوگ جو دوسروں کی بیٹیوں کی عزت اور مستقبل کا کوئی خیال نہیں کرتے اور اپنے بیٹوں کو اس لیے بیاہتے ہیں کہ وہ لڑکی والوں سے مال بٹور سکیں تو ایسے کم ظرف لوگوں کو ایسے ہی سبق سکھانا چاہیے۔ چلو منڈیو! لڑکے والوں کو "عزت و احترام" کے ساتھ گاڑیوں تک چھوڑ کے آؤ۔" ملک صاحب نے وہاں موجود لڑکوں کو آواز دی۔

"دین محمد! میرے دل میں تیری عزت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تو نے یہ فیصلہ لے کر رضیہ دھی کو عمر بھر کی تکلیف سے بچالیا ہے۔ اللہ تجھے اس بات کا اجر دے گا۔" بارات کے واپس جانے کے بعد ملک صاحب نے دین محمد کی اس سمجھ داری اور اس دلیرانہ عمل کو سراہا تھا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں ملک صاحب!" دین محمد نے عاجزی سے کہا۔

"چلو کمالے! کھانا کھلوا دیتے ہیں۔ لوگ بے چارے کب سے انتظار کر رہے ہیں۔"

دین محمد نے مہمانوں کی طرف توجہ دلائی تو سب مطمئن چہروں اور دلوں کے ساتھ مہمانوں کی تواضع کا انتظام کرنے لگے۔

☼

صائمہ بشیر

شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ سورج جلتے تانبے کے تھال کی مانند دکھ رہا تھا اور سمندر کی جانب یوں بڑھ رہا تھا کہ جیسے پانی میں ڈوب کر جلد از جلد اپنی سرخی سے نجات پانا چاہ رہا ہو۔ ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ زندگی اپنی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ آج سمندر کے کنارے معمول سے ذرا کم رش تھا مگر جو اکا دکا لوگ ریت پر چہل قدمی کررہے تھے انہوں نے ایک نوجوان کو بہت عجلت میں ٹیکسی سے اترتے دیکھا۔ وہ ایک اونچا لمبا چوڑی چھاتی اور بھرے بھرے جسم کا حامل نوجوان تھا۔ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو ٹیکسی سے اتر کر اسے متوجہ کرنا پڑا کہ وہ کرایہ دینا بھول گیا ہے۔

عجلت میں جتنے نوٹ اس کے ہاتھ لگے اس نے بٹوے سے نکال کے ڈرائیور کو تھما دیے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا بیگ بھی تھا اس کا رخ سمندر کی لہروں کی جانب تھا۔ بہت سے لوگ اس کے تیور دیکھ کر مشکوک ہوچکے تھے اور ادھر ادھر ہٹنا شروع ہوگئے تھے۔ چند ایک تجسس میں اس کے قریب آرہے تھے۔ دور بھاگنے والے لوگ اس کے بیگ کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ شاید اس میں بم ہے اور اس کے قریب جانے والے لوگ وہ تھے جن کا قیاس تھا کہ یہ نوجوان اپنے آپ کو سمندر

مکمل ناول
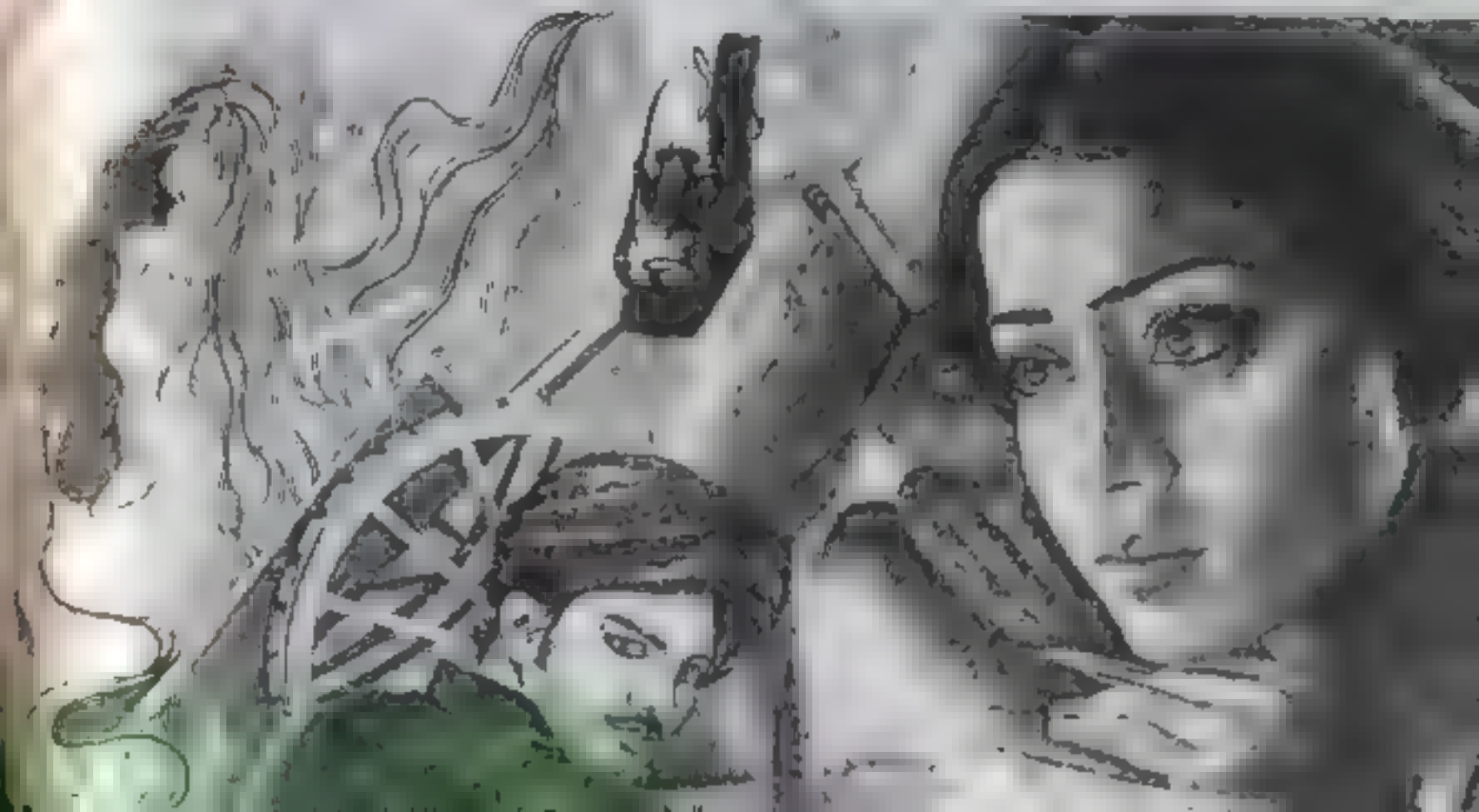
کے حوالے کرنے والا ہے۔ اس نوجوان کی آنکھیں شام میں بھی بہت چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہاں موجود لوگوں نے شاید اس سے پہلے اتنی روشن اور چمک دار آنکھیں نہ دیکھی ہوں۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی اخذ کرنا مشکل تھا۔ سب منتظر تھے کہ یہ نوجوان کیا کرنے والا ہے۔ ایک جی دار شخص تو محتاط انداز میں اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا تاکہ بروقت اسے بچا لے۔

نوجوان اب اتنا آگے جا چکا تھا کہ پانی اس کے گھٹنوں تک آنے لگا تھا۔ آس پاس کے لوگ شدید اضطراب میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بم کے ڈر سے دور بھاگ جانے والے لوگ بھی اب اس نوجوان کی طرف بڑھ رہے تھے تاکہ اسے خودکشی جیسے گناہ سے بچا سکیں۔ کچھ لوگوں نے تو چلا کر اسے متوجہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس کو کسی کی پروا نہیں تھی یا شاید کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔

سورج جلد از جلد ڈوب جانا چاہتا تھا اور شاید وہ نوجوان بھی۔ وہ بہت غور سے اپنے بیگ کو دیکھ رہا تھا' پھر کچھ لوگوں نے اس کے کندھے ہلتے دیکھے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ یونہی روتے ہوئے اس نے آسمان کی جانب دیکھا شاید خودکشی سے پہلے اللہ سے گلے شکوے کر رہا ہے۔

"ہوگا کوئی ناکام عاشق یا بے روزگار۔"

سب نے یہی سوچا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ پہلا شخص اسے پیچھے سے جا کر جکڑ لیتا نوجوان نے اپنے سر کو نفی میں ہلانا شروع کر دیا اور پھر ایکدم اس کالے بیگ کو ہوا میں اچھال دیا' جس نے سمندر کی لہروں کو چھونے کے بعد اچھا خاصا ارتعاش پیدا کر دیا تھا' لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔ اس کے بعد پھر ویسا ہی سکون ہو گیا تھا' پھر اس نوجوان نے ہاتھ جھاڑے اور واپسی کے لیے مڑا۔ اس کے چہرے پر بھی سمندر جیسا سکون تھا۔ وہ اپنے آس پاس لوگوں کا ہجوم دیکھ کر قدرے حیران ہوا پھر بے نیازی سے سر جھٹکتا ہوا یوں چلنے لگا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ کھسیانے ہو گئے۔ جب تک لوگوں کی کھسیاہٹ ختم ہوئی وہ نوجوان ایک ٹیکسی روک کر بیٹھ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ساون! پلیز میرا بھی ہوم ورک کر دو۔ ہسٹری مجھے سخت بری لگتی ہے۔" سارہ نے اپنی کاپی ساون کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ غلط بات ہے سارہ! تم روز ہسٹری کا کام مجھ سے کرواتی ہو' ایگزامز میں کیا کرو گی؟" ساون نے سارہ کو تنبیہہ کرتے ہوئے کاپی تھام لی۔

"اچھا آج کر دو نا۔ کل سے خود کروں گی۔" سارہ نے ان سنی کرتے ہوئے کاپی ساون کو تھمادی اور خود ٹی وی پر کارٹون لگا کر بیٹھ گئی۔

ساون جانتا تھا کہ سارہ کا کل کبھی نہیں آئے گا۔ سارہ کو شروع سے ہی تاریخ اور معاشرتی علوم جیسے خشک مضامین سے چڑ تھی حالانکہ ایسے مضامین سے لڑکوں کو چڑ ہوتی ہے لیکن یہاں الٹا معاملہ تھا۔ ساون کو ایسے مضامین پڑھنے میں کبھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ میتھس سے اس کی جان جاتی تھی اور جہاں تک سارہ کا تعلق تھا تو اس کی پڑھنے سے ہی جان جاتی تھی اگر ماما' بابا کا ڈر نہ ہوتا تو وہ کبھی خود سے پڑھنے نہ بیٹھتی تھی۔ ٹیوٹر کو بھی اس نے آگے لگایا ہوا تھا جبکہ ساون میتھس میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود ہر کلاس میں پہلی تین پوزیشنز میں سے لیتا تھا اور سارہ کا تو پاس ہو جانا بھی ایک معجزہ ہوتا تھا لیکن مزاجوں کے اس فرق کے باوجود ان دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا ممکن نہ تھا۔ سارہ کی تمام دلچسپی کھیل کود میں ہوتی تھی اور ساون کتابی کیڑا ہونے کے باوجود اس کے ہر تماشے میں شامل رہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

شایان شاہ اور احسان شاہ سگے بھائی تھے۔ احسان شاہ بڑے تھے اور شایان شاہ چھوٹے۔ دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی۔ ان کے والد عثمان شاہ صاحب نے اپنے آخری وقت میں وصیت کی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو کاروبار کا بٹوارہ نہ ہو اور دونوں بھائیوں نے کبھی اس بات کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی تھی۔ احسان شاہ ایک اچھے بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہمدرد' متحمل مزاج اور جہاں دیدہ انسان تھے۔ ان کا بیٹا ساون شاہ ان کی کاپی تھا۔ ساون کی پیدائش کے دوران ان کی محبوب بیوی عائشہ احسان وفات پا گئی تھیں۔ احسان صاحب نے دوسری شادی کرنے کے بجائے اپنے بیٹے ساون کو اپنی بھرپور توجہ اور پیار دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساون اکلوتا ہونے اور سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے کے باوجود بہت سلجھا ہوا تھا۔

شایان شاہ احسان صاحب سے چھوٹے تھے۔ وہ مخصوص کاروباری سوچ رکھنے کے باوجود بڑے بھائی کا بہت احترام اور محبت کرتے تھے۔ آج تک کسی کاروباری معاملے میں انہوں نے احسان صاحب سے اختلاف نہ کیا تھا۔ بلکہ احسان شاہ کی بات کو ہی حرف آخر مانا جاتا تھا۔

شایان شاہ کی بیگم عظمیٰ احمد ایک بیوروکریٹ کی بیٹی تھیں۔ اس لیے ناز نخرا اور غرور ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ سارہ شاہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی جو کہ ساون سے سال بھر چھوٹی تھی۔ عظمیٰ بیگم نے اپنی کلاس کی تمام اچھی بری خصوصیات سارہ میں ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی تھیں۔ جب ہی تو سارہ کے نزدیک دنیا میں کسی ایسی بات کا تصور نہ تھا' جو پوری نہ ہو سکتی ہو۔ اس ملکہ کی طرح جو روٹی نہ ملنے پر کیک کھانے کا مشورہ دیتی ہو۔ شایان شاہ بھی اپنی بیٹی کو ٹوٹ کر پیار کرتے تھے اور اس کو بگاڑنے میں اپنی بیگم کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔

اگر سارہ اپنے گھر کی لاڈلی تھی تو احسان صاحب کی آنکھوں کا بھی تارا تھی۔ سو اتنی محبتیں کو وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ساون احسان صاحب کی سارہ کے لیے محبت سے خائف ہوتا یا حسد کرتا لیکن ساون تو خود بھی سب سے بڑھ کر سارہ کی فرمائشیں پوری کرتا۔ اس کے لیے اس پوری دنیا میں سارہ ہی ایسی ہستی تھی جس سے وہ اپنی ہر بات شیئر کر لیتا تھا۔ اپنی ہر چھوٹی بڑی خوشی کو اسی کے ساتھ مناتا۔ ان دونوں کے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں کے والدین کے پاس وقت کی کمی تھی۔ دونوں بھائیوں کی محنت اور توجہ سے کاروبار بہت زیادہ وسیع ہو چکا تھا اور اسی لحاظ سے ان کی مصروفیات بھی زیادہ ہو چکی تھیں۔ "چین آف شاہ اینڈ سنز" پورے پاکستان میں پھیل چکی تھی۔

ساون اے لیول اور سارہ او لیول میں تھی۔ ایسے میں ساون کے شوق اور عادات دیکھ کر احسان شاہ کو

تشویش لاحق ہو چکی تھی۔ ساون کو بزنس میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے نوٹ کیا تھا کہ جب وہ اس کے سامنے اپنا کوئی بزنس کا مسئلہ ڈسکس کرنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ منہ بنا کر اٹھ جاتا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہ اس کی کم عمری کو وجہ بنا کر اپنے آپ کو تسلی دیتے تھے۔ لیکن جب ساون نے کھلم کھلا لٹریچر پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور بزنس ایڈمنسٹریشن کرنے سے صاف انکار کر دیا تو احسان صاحب شدید صدمے کا شکار ہو گئے۔ ان کی اگلی نسل میں صرف ساون ہی تھا جس سے ان کی اور شایان شاہ کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔

سارہ کی پیدائش کے بعد دونوں بھائیوں کو لگتا تھا کہ سب کچھ خود بخود ہی طے پا گیا ہے۔ ساون اور سارہ کی نسبت تو خیر طے نہیں کی گئی تھی کیونکہ ان کا تعلق کسی دقیانوسی خاندان سے نہیں تھا لیکن واضح طور پر دونوں طرف ہی یہ بات سمجھ لی گئی تھی کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح سے جائیداد کی تقسیم بھی نہیں ہوگی اور ویسے بھی دونوں خاندانوں کے لیے اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے؟

لیکن جیسے جیسے ساون کا مزاج عمر کے ساتھ واضح ہونا شروع ہوا' احسان شاہ کو ہول اٹھنے لگے۔ اتنے نرم مزاج اور لطیف جذبات والا لڑکا اور بزنس؟ کاروباری پیچیدگیوں کے لیے تو ان کے بیٹے کو اپنے باپ کے ساتھ ساتھ چچا کی بھی تمام خصوصیات لینی چاہیے تھیں کیونکہ ایسا کوئی مسئلہ جو احسان صاحب ہینڈل نہیں کر پاتے تھے وہ شایان شاہ کا تیز اور شاطر دماغ انجام دے لیتا تھا۔ جب سے ساون نے اے لیول میں داخلہ لیا تھا' احسان صاحب اکثر اسے پاس بٹھا کر لمبے لمبے لیکچر دیتے۔ بزنس کے اسرار و رموز سمجھاتے مگر ساون کی شکل دیکھ کر انہیں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کی بات کا کتنا اثر ہوا ہے۔

☼ ☼ ☼

"شاہ اینڈ سنز" کے ہیڈ آفس میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ چل رہی تھی۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی تمام ڈپارٹمنٹس کے ڈائریکٹرز آفس سے نکل گئے۔ صرف شایان شاہ احسان صاحب کے ساتھ رہ گئے۔ احسان صاحب نے تھکے تھکے انداز میں انٹرنیشنل پروجیکٹ کے لیے ممکنہ آپشنز پہ نظر ڈالی اور مایوسی سے سر ہلایا۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب! کیا کوئی بھی آپشن قابل غور نہیں؟" شایان شاہ حیرت سے بولے۔

"بہت خدشات ہیں اس میں۔ وہی پرانے خیالات اور یہ سب بھی کیا کریں' ہماری طرح بڑھاپے کی طرف مائل ہیں۔ ہماری انڈسٹری کو اس وقت نئے خون کی ضرورت ہے۔ فریش ذہنوں کی' جو زمانے کے ساتھ چل سکیں۔" احسان صاحب نے فائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ان پرانے لوگوں کا تجربہ بھی تو بہت قیمتی ہے۔" شایان شاہ نے ہلکا سا اختلاف کیا۔

"ہاں! تجربے کی اپنی جگہ اہمیت ہے اور میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تجربہ کاروں کو نکال کر نا تجربہ کاروں کو رکھا جائے۔ دونوں کا تناسب برابر رکھنا ہوگا۔ اب ہمارا وقت نہیں رہا' تم ایسا کرو عابد سے کہہ کر تین' چار فریش ایم بی اے لڑکوں کے لیے تمام اخبارات میں ایڈ دے دو۔" احسان صاحب نے پرسوچ انداز میں شایان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی صاحب! لیکن ابھی جو اسلام آباد والی فیکٹری کے مسائل ہیں ان کو کیسے ہینڈل کرنا ہے؟ مجھے تو شاید اگلے ہفتے عظمیٰ کے ساتھ انگلینڈ جانا پڑے۔" شایان شاہ نے پریشانی سے بتایا۔

"تم پریشان نہ ہو اور آرام سے انگلینڈ جاؤ' میں دیکھ لوں گا۔ میں آج کل ایک بات پہ غور کر رہا ہوں' اگر ویسا ہو جائے تو۔" احسان شاہ گہری سوچ میں گم ہو کر بولے۔ "ہمیں ابھی سے کچھ پلان کرنا ہوگا۔"

"کیسا پلان؟" شایان شاہ چونکے۔

"ہوں... کچھ نہیں... وقت آنے پر بتاؤں گا۔ کاش! ساون اپنی ماں سے وراثت میں یہ ادبی لٹریچر کا

شوق نہ لیتا تو میں اتنا فکرمند نہ ہوتا۔ لیکن خیر۔" احسان صاحب مسکرائے اور یہ مسکراہٹ کسی نتیجے پر پہنچ جانے کی وجہ سے تھی۔ شایان شاہ انہیں خدا حافظ کہہ کر آفس سے نکل گئے تو انہوں نے سیکریٹری کو انٹرکام کیا۔

"جی سر!" سیکریٹری نے مؤدبانہ پوچھا۔

"ایسا کرو فنانس ڈپارٹمنٹ سے احمد حسن کو میرے آفس میں بھیجو۔" احسان شاہ ابھی تک اس گیارہ سالہ لڑکے کو نہیں بھولے تھے' جو آج سے چار سال پہلے احمد حسن کے ساتھ فیکٹری دیکھنے کے شوق میں آیا تھا۔ احسان صاحب اس لڑکے کی آنکھیں ابھی نہیں بھلا پائے تھے۔ ذہانت انہوں نے بہت لوگوں میں دیکھی تھی اور ذہانت انہیں متاثر بھی بہت کرتی تھی مگر کسی کی آنکھوں میں ذہانت کی اتنی چمک اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ احمد حسن نے بتایا تھا کہ یہ ان کا یتیم بھتیجا ہے۔ بھائی' بھاوج کی وفات کے بعد اس کی ذمہ داری ان پر آ پڑی ہے۔ جس طرح انہوں نے تعارف کروایا تھا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے بھتیجے سے بہت زیادہ محبت ہے۔

ان دنوں احسان صاحب کی مرکزی فیکٹری میں مزدوروں نے کام کا دورانیہ کم کرنے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ احمد حسن جو کہ فنانس ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ مینیجر کی پوسٹ پر تھے' فنانس کے حوالے سے احسان صاحب سے بات کر رہے تھے۔ اس دوران وہ بچہ علی حسن آفس کے چاروں اطراف بہت غور و خوض سے جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ہی آئس کریم سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"سر! اگر میں ایک بات کہوں تو؟" علی حسن نے اچانک ہی گفتگو میں حصہ لیا۔ احسان صاحب چونکے اور اس کے سر کہہ کر مخاطب کرنے پر مسکرائے۔

"ہاں بولو۔"

"سر! آپ کا آفس بہت اچھا ہے۔ ایسے آفس میں کام کرنے میں بہت مزا آتا ہے نا۔" علی حسن نے ستائشی انداز میں کہا۔ احمد حسن نے آنکھوں سے تنبیہہ کی کہ چپ کر کے بیٹھو۔ جبکہ احسان صاحب کے چہرے پر اس "بچکانہ" مداخلت پر تھوڑی سی ناگواری آئی' جو انہوں نے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ بچہ واقعی ان کے آفس کی آرائش و زیبائش سے شدید متاثر لگ رہا تھا' تب ہی اس نے اتنا معصومانہ سوال کیا تھا۔ احسان صاحب دوبارہ احمد حسن کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے احمد؟"

"سر! میرا خیال ہے کہ..." احمد حسن کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ علی حسن نے پھر انہیں متوجہ کیا تھا۔

"سر! آپ میری بات شاید سمجھے نہیں۔" احسان صاحب نے اب اپنی ناگواری چھپانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ احمد حسن نے علی کو اشارے سے آفس سے باہر جانے کو کہا۔ "اگر آپ اپنے ورکرز کو بھی ایسا آفس دے دیں تو وہ دیر تک کام کریں گے۔" علی حسن نے سانس لیے بغیر کہا اور جلدی سے کرسی سے اتر کر باہر کی طرف جانے لگا۔ جس پر احمد حسن نے شکر کا سانس خارج کیا۔ بے شک اس کے باس بامروت انسان تھے جنہوں نے ان کے بھتیجے کی اتنی صاف گوئی بلکہ بدتمیزی کو برداشت کر لیا تھا۔

"رکو بیٹا! واپس آؤ۔" علی حسن آفس کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ جب احسان صاحب کی آواز آئی۔ احمد حسن نے تشویش بھری نظروں سے اپنے باس کو دیکھا۔ انہیں آج اپنے اس ذہین و فطین بھتیجے کی وجہ سے اپنی نوکری خطرے میں لگ رہی تھی۔

"ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟" احسان صاحب نے اسے واپس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ علی حسن مطمئن انداز میں کرسی پر بیٹھ چکا تھا جبکہ احمد حسن کا سارا اطمینان غارت ہو چکا تھا۔

"دیکھیں' جب لکھنے پڑھنے کا کام کرنے والے اے سی میں بیٹھتے ہیں۔ مزدوروں نے تو اپنے ہاتھ پاؤں' اپنا پورا جسم استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اصل پسینہ ان کا بہتا

ہے' زیادہ حق ہے کیونکہ ان مشینوں پر وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر کام کرتے ہیں۔ جون' جولائی کے مہینے میں اگر انہیں اے سی کے ماحول میں کام کرنا ہو تو میرا خیال ہے یہ مزدور رات بھی یہیں ٹھہرنا پسند کریں گے۔"

علی حسن کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ احمد حسن نے یہی بتایا تھا لیکن احسان شاہ کو لگا اس لڑکے نے ان کی چالیس سالہ زندگی کو اپنے گیارہ برسوں سے ضرب دے دی ہے۔

"ہوں۔۔ احمد! تم نے اتنے ذہین بچے کو کہاں چھپا رکھا تھا۔ یہ تو ہمارا بھی استاد ہے۔" احسان صاحب نے خوش گوار انداز میں احمد حسن کی طرف دیکھا' جو کچھ بے یقینی کی کیفیت میں اپنے باس کو دیکھ رہے تھے۔

"سر! آپ نے برا تو نہیں مانا؟ یہ خواہ مخواہ بڑی بڑی باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ ابھی صرف آٹھویں جماعت میں ہے۔ سر! بچہ سمجھ کر معاف کردیں۔ آئندہ میری توبہ! جو میں اسے فیکٹری لے کر آؤں۔" احمد حسن حقیقتاً شرمندہ ہو رہے تھے اور خشمگیں نظروں سے علی کو بھی دیکھ رہے تھے۔

"ارے کیا ہو گیا ہے احمد! تم سوچ نہیں سکتے اس بچے نے بیٹھے بٹھائے میرا کتنا بڑا مسئلہ حل کرا دیا ہے۔ کہنے کو ہماری "شاہ اینڈ سنز" کا کتنا بڑا نام ہے۔ لیکن ہم نے واقعی ان لوگوں کی طرف توجہ نہ دی جن کی وجہ سے ہم یہاں ہیں۔ ان مزدوروں کا حق ان ساری سہولیات پر ہم سے پہلے بنتا ہے۔۔ گڈ' ویری گڈ علی بیٹا!" احسان صاحب نے علی کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا تو وہ کھل کر مسکرانے لگا۔

"سر! جب اس نے پانچویں کلاس میں ٹاپ کیا تھا تو اس کے ہیڈ ماسٹر نے مجھے بلوا کر کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو شہر کے کسی اچھے اسکول میں داخل کرواؤں۔ ورنہ گورنمنٹ اسکول میں اس کی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع نہیں ملے گا۔ میں نے ان ہی کی ہدایت پر اسے شہر کے ایک مہنگے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں میری تو کوئی اولاد نہیں ہے۔ بیوی کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔"

"سر! میں اندر آسکتا ہوں؟" احمد حسن کی آواز نے احسان صاحب کو واپس حال میں بلا لیا۔

"ہاں ہاں احمد! آؤ بیٹھو۔ کیسے ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے سر! آپ نے یاد فرمایا؟" احمد حسن نے انکساری سے جواب دیا۔

"ہاں۔۔ ویسے ہی سوچا تمہارا حال چال دریافت کرلوں' وہ جو تمہارا بھتیجا تھا' جسے تم ایک دفعہ یہاں لائے تھے۔ کیا حال ہے اس کا؟ کیا کر رہا ہے آج کل؟" احسان صاحب نے بے صبری سے پوچھا۔

"جی۔۔ سیکنڈ ایر میں ہے۔ پچھلے سال فرسٹ ایر میں پورے صوبے میں ٹاپ کیا تھا۔"

"وہ اچھا' ویری نائس! اللہ نے تمہیں بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ یقین کرو میں آج تک اس بچے کے ساتھ اپنی ملاقات نہیں بھول پایا۔"

"جی سر! آپ نے یاد فرمایا تھا؟" احمد حسن نے دوبارہ ان سے اپنے یاد کیے جانے کی وجہ پوچھنی چاہی۔

"دیکھو احمد! مجھے وہ بچہ بہت ذہین لگا تھا۔ میں اس کے تعلیمی اخراجات اٹھاؤں گا۔ تم اسے پڑھنے کے لیے باہر بھجوا دو۔ میں چاہتا ہوں وہ بہت اچھی تعلیم حاصل کر کے ہماری فیکٹریز کا کام سنبھالے۔"

احمد حسن اتنی بڑی پیش کش سن کر ہکابکا رہ گئے۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔ انہیں بھی اندازہ تھا کہ ان کا بھتیجا بہت ذہین ہے۔ بہت آگے جا سکتا ہے۔ انہیں یہ پیش کش قبول کرنے میں کیا انکار ہو سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سر! ایک بری خبر ہے۔ فنانس ڈپارٹمنٹ کے احمد حسن صاحب کو کل شام اچانک ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔" احسان صاحب کی سیکریٹری نے انٹرکام پر گھبرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

"تم ذرا تم اسپتال کا نام وغیرہ پتا کرو میں ابھی جاؤں گا۔" احسان شاہ نے جلدی سے سیکریٹری کو ہدایات

دیں اور باہر نکل آئے۔ کار پارکنگ میں ڈرائیور ان کا منتظر تھا۔ وہ عجلت میں اپنی کار میں سوار ہوئے۔ علی ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ انہوں نے فوراً" اسے پہچان لیا تھا۔ ان چار سالوں میں وہ ایک گیارہ سالہ بچے سے پندرہ سالہ لڑکے کے روپ میں آچکا تھا۔ اس کی آنکھیں ویسی ہی چمک دار اور روشن تھیں۔ علی انہیں دیکھ کر پہلے تو جھجکا اور پھر ان کے گلے لگ کر رونے لگا۔ انہوں نے بھی شفقت سے اسے ساتھ لگائے رکھا۔ احمد حسن زرد چہرے کے ساتھ آنکھیں بند کیے دوائیوں کے اثر میں تھے۔ وہ علی کو اپنے ساتھ لگائے قریبی بینچ پر بیٹھ گئے۔ علی آہستہ آہستہ انہیں احمد صاحب کی طبیعت اور رات کو ہونے والے اٹیک کے بارے میں بتانے لگا۔ ابھی انہیں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ احمد حسن کو ہوش آنے لگا۔ علی بے تابی سے ان کے پاس گیا اور ان کا ماتھا سہلانے لگا۔ انہوں نے نیم وا آنکھوں سے علی کو دیکھا۔ احسان شاہ ان کے قریب گئے۔ احمد حسن کی اچانک ان پر نظر پڑی تو جیسے ان کے چہرے پر سکون آگیا۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن ناکام ہو گئے' پھر انہوں نے علی کا ہاتھ اپنے ماتھے سے ہٹا کر احسان صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ احمد حسن نے بمشکل دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ علی غم کی شدت سے ایک ٹک کبھی اپنے باپ اور کبھی احسان صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ احمد حسن نے بہت مضبوطی سے علی کا ہاتھ پکڑ کر احسان صاحب کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ احسان صاحب ان پر جھکتے ہوئے بولے۔

"احمد حسن! تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"نہیں سر! اب اور نہیں میرے۔۔ بیٹے۔۔ کی۔۔ ۔۔تھا۔۔ ۔۔ت۔۔ ۔۔جیے۔۔ گا اور علی! یہ جیسا۔۔ ۔۔ویسا ہی۔۔ کرنا' انہیں تم سے شکایت۔۔ نہ ۔۔اور۔۔"

احمد حسن اچانک بات کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہے تھے لیکن زندگی نے انہیں مہلت نہ دی۔ نرس ڈاکٹر کو بلانے بھاگی تھی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت نے خود ہی فیصلہ کر دیا تھا اور آج وہ علی حسن کو لیے "شاہ ولاز" کی طرف جا رہے تھے۔ آج احمد حسن کا چالیسواں ہو چکا تھا اور علی کافی حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ ان چالیس دنوں میں وہ بلا ناغہ علی کے پاس جاتے رہے تھے۔ احمد حسن کا کوئی بھائی' بہن نہیں تھا۔ بس دور پار کے چند رشتے دار آئے تھے۔ جنہیں احمد حسن کے یتیم بھتیجے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شاہ اینڈ سنز میں بھی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور سب لوگ علی حسن کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے احسان شاہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد علی کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کرتے مگر وہاں سکون اور اطمینان تھا۔

"اس لڑکے کو اپنے اوپر پورا کنٹرول ہے' میں نے اسے ایک دفعہ بھی باپ کی موت پر اونچی آواز میں روتے نہیں دیکھا۔" احسان صاحب نے دل میں سوچا۔ بزنس میں کامیابی کا پہلا اصول اپنے اوپر پورا کنٹرول رکھنا ہی ہے۔ احسان صاحب دل ہی دل میں مسکرائے۔ اس گوہر نایاب کے انتخاب پر خود کو داد دی۔

شایان شاہ اپنی بیگم کے ساتھ دو مہینے کے لیے انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ اس لیے سارہ آج کل انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ ویسے بھی دونوں ولاز کی اندرونی دروازوں کی وجہ سے اندر سے ایک ہی تھے' اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ جس وقت وہ علی کو لیے گھر میں داخل ہوئے تو ساون اور سارہ لان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ اپنی گاڑی سے اترے اور علی کو بھی اترنے کا اشارہ کیا۔ فی الحال انہیں صرف ان دو بچوں کا ہی سامنا کرنا تھا' اس لیے مطمئن تھے۔ علی گاڑی سے اتر کر ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ساون اور سارہ جو پہلے صرف دور سے ہی ہیلو ہائے کرنے کے موڈ

میں تھے۔ اپنے پاپا کے ساتھ ایک اجنبی لڑکے کو دیکھ کر کھیل چھوڑ کر آ گئے۔

"علی بیٹا! یہ میرا بیٹا ساون اور یہ میری بہت ہی پیاری بیٹی سارہ ہے اور بچو! یہ علی ہے۔ علی حسن' اب یہ یہیں تمہارے ساتھ رہے گا۔"

"ہیلو علی! نائس ٹو سی یو۔" ساون نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ علی سے ہاتھ ملایا۔ علی نے بھی جواباً مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"ہائے علی! اٹس ناٹ نائس ٹو سی یو بی کاز آئی ڈونٹ نو ہو یو آر؟" (ہائے علی! مجھے تم سے مل کر خوشی نہیں ہوئی کیونکہ میں تمہیں نہیں جانتی) سارہ نے ہنستے ہوئے علی کو کہا۔

"ویری نالی مائی چائلڈ! چلو اندر چل کر بات کرتے ہیں۔" احسان صاحب تینوں کو لیے اندر آ گئے۔ لاؤنج میں وہ ملازم کو علی کے کمرے کے بارے میں ہدایات دے رہے تھے۔ ساون اور سارہ خاموشی سے علی کا جائزہ لے رہے تھے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ علی اب ہمارے ساتھ ہی رہے گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

ساتھ رہنے والی بات تو ٹھیک تھی لیکن ہمیشہ ہمیشہ والی بات نے دونوں کو چونکا دیا تھا۔ اب انہوں نے زیادہ غور سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکے کا جائزہ لیا' جو ہرگز کسی غریب کا مظلوم بچہ نہیں لگ رہا تھا کیونکہ کہانیوں میں ایسا ہی ہوتا تھا کہ کسی یتیم مظلوم بچے کے رشتے دار اس پر ظلم کر رہے ہوں اور ایک امیر خدا ترس انسان اسے اپنا بیٹا بنا کر گھر لے آئے۔

"علی کے انکل ہماری فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ بہت اچھے اور ایمان دار ملازمین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی زندگی میں بھی میں چاہتا تھا کہ علی کی کفالت میں کروں' کیونکہ میں اس کی ذہانت کو ضائع ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی میں ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا اور انہوں نے اپنی وصیت میں علی کی ذمہ داری مجھے دے دی۔ اس لیے آج سے علی ہمارے بیٹے کی حیثیت سے اس گھر میں رہے گا' بالکل ایسے ہی جیسے تم۔"

احسان صاحب نے ساون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

علی حیرت سے ان کی بات سن رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا یہاں آنا خود احسان شاہ کی بھی خواہش ہے۔ اسے تھوڑا سا اطمینان محسوس ہوا۔ وہ یہاں زبردستی کی ذمہ داری بن کر نہیں آیا تھا۔ اس بات نے اس میں اعتماد بحال کر دیا تھا۔

"ساون بیٹا! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے علی کو اپنا بھائی بنانے میں؟" ساون جو ابھی تک خاموش بیٹھا اس کہانیوں والی صورتحال سے محظوظ ہو رہا تھا' چونکا اور نفی میں سر ہلایا' پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر علی کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"دیکھو یار! مجھے صرف ایک بھائی کی نہیں بلکہ ایک دوست کی بھی ضرورت ہے۔ اصل میں میں اس لڑکی کی دوستی سے تنگ آ چکا ہوں۔" ساون نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بے تکلفی سے علی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ول یو بی مائی فرینڈ؟"

"کیا کہا تم نے؟ تم مجھ سے تنگ آ چکے ہو؟ پاپا! دیکھیں اسے کتنے مزے سے کہہ رہا ہے کہ یہ مجھ سے تنگ آ گیا ہے۔ ویسے ہر وقت سارہ' سارہ کرتا رہتا ہے اور اب فوراً" ہی اس کو اپنا دوست بنایا ہے۔" سارہ نے غصے سے احسان شاہ کو ساون کی شکایت لگائی۔ اسے اس اجنبی لڑکے کی آمد کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی۔ احسان صاحب مسکرائے اور سارہ کو پاس بٹھا کر پیار کرنے لگے۔

"دیکھو سارہ بیٹے! اگر ساون اس سے دوستی نہیں کرے گا تو علی یہاں پر ایزی نہیں فیل کرے گا۔ تم علی سے جیلس ہونے کے بجائے اس سے دوستی کر لو۔ کیا تین لوگ آپس میں اچھے دوست نہیں ہو سکتے؟"

"ہو تو سکتے ہیں لیکن۔۔۔ چلیں! میں سوچ کر بتاؤں گی۔" سارہ نے نخوت سے گردن ہلا کر کہا۔ علی کو اس وقت اپنا آپ انتہائی اضافی محسوس ہو رہا تھا لیکن جو بھی تھا' اسے اب یہیں رہنا تھا۔ اس گھر کا بیٹا بن کر اسے اپنے باپ جیسے چچا کے آخری الفاظ بھولے نہ تھے۔

"انہیں تم سے کوئی شکایت نہ ہو۔"

☆ ☆ ☆

احسان صاحب نے جتنی توجہ اور پیار اپنے بیٹے ساون کو دیا تھا' اس کے بعد انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے بیٹے کی زندگی میں کوئی کمی ہے۔ لیکن وہ کمی چاہے ماں کی تھی یا بہن' بھائی کی' علی کے آنے سے پوری ہو گئی تھی۔ انہیں ساون کی شخصیت میں بہت سی ایسی تبدیلیاں نظر آئی تھیں' جو سارہ کی دوستی اور احسان شاہ کی شفقت نہیں لا سکی تھیں۔ ان کے بیٹے میں کوئی کمی نہ تھی لیکن علی کے آنے سے لگتا تھا وہ مکمل ہو گیا ہے اور یہ بہت خوش آئند بات تھی۔ ورنہ اگر ساون علی کو پسند نہ کرتا تو علی کا یہاں رہنا ممکن نہ ہوتا۔

ایک مہینے میں علی اس گھر کا فرد بن چکا تھا۔ اسے خود بھی یہ لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے یہیں رہتا آیا ہے۔ احسان شاہ میں اسے اپنے باپ کی جھلک نظر آتی تھی اور ساون میں اسے اپنے بہن' بھائیوں کی کمی پوری ہوتی نظر آتی تھی۔ سارہ سے البتہ وہ دور' دور ہی رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ سارہ کو اس کی آمد کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ مگر جلد ہی یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ گاڈ! یہ ڈائیگرام تو میں مر کر بھی نہیں بنا سکتی' پلیز ساون! اس فضول ناول کی جان چھوڑ دو اور میری پرابلم حل کرو۔" سارہ نے ساون کو ناول میں گم دیکھ کر کہا۔

"سارہ! دس منٹ کے بعد۔۔۔ ابھی نہیں۔" ساون نے دوبارہ کتاب میں منہ گھسیڑا۔ علی قریب ہی بیٹھا اپنی نوٹ بکس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا کیمسٹری ٹیسٹ تھا۔

"تم اتنے بڑے ہو گئے ہو اور یہ ناول تم نے اس وقت پڑھا تھا جب تم پریپ ون میں تھے۔ اب دوبارہ پڑھنے سے مطلب؟" سارہ نے کوفت میں مبتلا ہو کر کہا۔

"جب میں پریپ میں تھا تب اسے پڑھ کر میں نے اور مطلب لیا تھا اور اب پڑھوں گا تو مطلب اور ہو گا' کیونکہ انسان ہر چیز کو اپنی سمجھ کے مطابق سمجھتا ہے۔ چیز وہی ہوتی ہے' سمجھنے کا انداز مختلف۔" ساون نے کتاب سے منہ نکال کر فلسفہ بگھارا۔

"واہ! کیا فلاسفی ہے۔ اس کا مطلب ہے مجھے بھی اپنی تمام پچھلی کلاس کی کتابوں کو دوبارہ پڑھنا چاہیے۔ پہلے میں کچھ اور سمجھا تھا۔ اب کچھ اور سمجھوں گا۔" علی نے کچھ اور پر خاص زور دے کر ساون کا مذاق اڑایا تو سارہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے' کچھ اور سمجھنے کے لیے کچھ اور تو پڑھنا ہی پڑے گا۔" سارہ نے بھی علی کی بات کو آگے بڑھایا تو ساون چڑ گیا۔

"یہ تم دونوں میرے خلاف کب متحد ہو گئے اور علی! تم سے مجھے اس غداری کی امید نہیں تھی۔" ساون نے علی کو افسوس بھری نظروں سے دیکھا۔

"اچھا تو جب تم دونوں میرے خلاف اکٹھے ہوئے تب؟" سارہ نے ساون کو چڑایا۔ "اب تم نے یہ بچکانہ ناول ہضم کر ہی لیا ہے تو اس ڈائیگرام کے بارے میں کچھ سوچو۔ یہ مینڈک کا ڈائجسٹو سسٹم مجھ سے نہیں بنتا۔" سارہ نے پھر اپنا رونا رو دیا۔

"یار علی! یہ بتا دو اس نالائق کو پتا نہیں ایگزامز میں پاس کیسے ہو جاتی ہے۔۔۔" ساون نے ڈھیٹ پن سے ناول دوبارہ اپنے آگے کر لیا۔

"جی نہیں۔۔۔ تم بناؤ گے' علی نہیں۔" سارہ نے ضدی لہجے میں اس کے ہاتھ سے ناول چھین لیا۔ اتنی دیر میں علی نے سارہ کی کاپی اٹھا لی تھی' جتنی دیر میں ساون اور سارہ کی نوک جھونک ختم ہوئی' علی اپنا کام مکمل کر کے دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"ان بلیوا ایبل۔۔۔ یہ تم نے بنائی ہے؟ اتنی جلدی اور اتنی صاف؟" سارہ نے بے یقینی سے اپنی نوٹ بک دیکھی۔ ایسی ڈائیگرام تو وہ دو دن لگا کر بھی نہیں بنا سکتی

تھی جیسی علی نے دومنٹ میں بنادی تھی۔
"دیکھا! میں نے کہا تھا نا علی سے بنوالو' میرا یار ہے ہی بڑا ٹیلنٹڈ۔" ساون نے ستائشی نظروں سے علی کو دیکھا تو علی اس تعریف پر مسکرا دیا۔
"کاش! میں اپنی پہلے والی ساری ڈائیگرام علی سے ہی بنواتی۔ تم نے تو ذرا اچھی نہیں بنائی تھیں۔" سارہ نے پچھتاتے ہوئے کہا۔
"چلو شکر ہے۔ میری تو آئندہ کے لیے جان چھوٹی۔ اب تم خیر مناؤ۔" ساون نے علی کو متنبہ کیا تو سارہ ڈھٹائی سے مسکرادی۔
"علی! پرامس کرو تم آئندہ بھی مجھے اسکیچ بنا دیا کرو گے۔" سارہ نے ہاتھ بڑھایا۔
"او کے۔ پرامس بنادیا کروں گا' لیکن کیا ابھی میں اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرسکتا ہوں؟" علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے درخواست کی تو وہ اپنی بے صبری پر ہنس دی۔
پھر اس دن کے بعد سارہ کو علی کبھی برا نہ لگا اور ان کی دوستی ہوگئی۔

☆ ☆ ☆
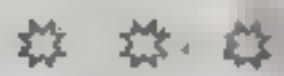
علی اپنے پرانے کالج میں ہی پڑھ رہا تھا۔ احسان شاہ اگرچہ اسے شہر کے بہترین انسٹی ٹیوٹ میں بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ ایک دم سے علی کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں لاکر اسے پریشان بھی نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔ اگرچہ یہ کالج بھی اچھی شہرت رکھتا تھا۔ مگر احسان شاہ اس سے بھی اچھا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ علی کے لیے سب کچھ بہت اچھا چاہتے تھے۔ زندگی روٹین پر آنا شروع ہوئی تھی۔ جب شایان شاہ اپنی بیگم عظمیٰ شاہ کے ساتھ لمبے بزنس ٹور سے واپس آگئے۔ سارہ کا ان کے آنے پر موڈ آف تھا۔ کیونکہ اب اسے واپس اپنے گھر جانا پڑتا' جہاں عظمیٰ شاہ ڈسپلن اور ہائی سوسائٹی کے جیمز کے بخار میں مبتلا رہتی تھیں۔ اسی لیے اس کا زیادہ دل اپنے تایا کے گھر لگتا تھا جہاں پر کھلی آزادی تھی۔ رات کا کھانا آج سب کا احسان شاہ کی طرف تھا۔ علی کو سارہ کے ممی' پاپا بہت مغرور اور روکھے سے لگے تھے۔ عظمیٰ شاہ کو دیکھ کر علی کی سمجھ میں آیا کہ سارہ کس پر گئی ہے۔
"یہ لڑکا کون ہے؟" شایان شاہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سارہ سے پوچھا۔ "ساون کا کوئی دوست آیا ہوا ہے؟"
"نہیں پاپا! ساون نے میرے علاوہ کب کسی کو دوست بنایا تھا۔ یہ تو ایک لمبی کہانی ہے۔" سارہ نے لمبی کو کھینچتے ہوئے سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ علی اپنے بارے میں ایک دفعہ پھر دوہرائی جانے والی کہانی سے خائف ہونے لگا۔
"اونہوں۔ سارہ! آرام سے کھانا کھاؤ' ہم اس پر بعد میں بات کرسکتے ہیں۔" احسان شاہ نے سارہ کو چپ کراتے ہوئے کہا تو شایان شاہ بھی الجھن بھرے تاثرات لیے خاموش ہوگئے۔ پھر ان کے ٹور کے متعلق گفتگو چل نکلی۔
کھانے کے بعد تینوں بچے لاؤنج میں چلے گئے تھے' پھر احسان شاہ نے ساری تفصیل شایان شاہ کے گوش گزار کردی۔ جیسے جیسے وہ علی کے متعلق بتارہے تھے ویسے ویسے عظمیٰ شاہ کے ماتھے کے بل گہرے ہوتے جارہے تھے۔ شایان شاہ کی شکل پر بھی تشویش کے آثار تھے۔ انہیں اپنے بڑے بھائی سے ایسے بچکانہ اور احمقانہ کام کی ہرگز توقع نہیں تھی۔
"آپ یقیناً" مذاق کررہے ہیں۔" شایان شاہ کو ابھی بھی اس بات میں سنجیدگی نظر نہیں آرہی تھی۔
"اگر یہ مذاق ہے تو بھائی صاحب! معاف کیجیے گا' کافی پریکٹیکل جوک ہے۔" عظمیٰ شاہ نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں کہا۔
"اول تو یہ مذاق نہیں ہے۔ میں کسی لڑکے کو محض مذاق میں گھر نہیں لاسکتا اور تم لوگ جو ابھی میرے فیصلے کو یقیناً "ایک احمقانہ قدم" سمجھ رہے ہو۔ آہستہ آہستہ قائل ہوجاؤ گے میری دانش مندی کے۔" احسان شاہ نے دھیمے انداز میں کہا۔
"لیکن بھائی صاحب! ایک غیر لڑکا اور اس پر احمق۔ اور پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ واقعی ہماری امیدوں پر پورا اترے گا۔" شایان شاہ اب کی بار آہستہ آواز میں بولے تھے۔
"ہاں! اور کل کو اگر وہ سب کچھ ہڑپ کرکے چلتا بنا۔ کیا کل کو آپ اسے اپنے بیٹے کے برابر جائیداد بھی دیں گے؟ آخر آپ ساون کو اتنا انڈر اسٹیمیٹ کیوں کررہے ہیں۔ اور پھر یہ سب تو ساون اور سارہ کا ہے۔" عظمیٰ شاہ بھڑک اٹھیں۔
"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے بھی انسانوں کی پرکھ ہے۔ میں اس کی پوری گارنٹی دیتا ہوں اور جہاں تک جائیداد میں حصے کی بات ہے تو یہ بہت آگے کی بات ہے۔ فی الحال میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔ اس لیے اب اس مسئلے پر مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم دونوں کو اسے قبول کرنا ہی پڑے گا۔ کم از کم میری خاطر۔" احسان شاہ نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے بات ختم کی تو شایان شاہ نے گردن جھکالی۔ یہ ان کی رضامندی تھی جبکہ عظمیٰ شاہ نے غصے سے منہ پھیر لیا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھا علی بہت آہستگی سے اٹھ کر اوپر جاچکا تھا۔

☆ ☆ ☆
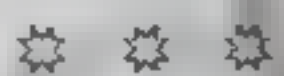
"تو نا ساون! بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔ اب چھوڑ بھی دو اس ہیری پوٹر سیریز کی جان۔ ہر وقت اسی میں گم رہتے ہو۔" سولہ سالہ سارہ نے بالوں کو ہیربینڈ کی قید سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔
"ڈیر کزن! کبھی کھیلنے کے علاوہ بھی کوئی بات کرلیا کرو' اور اس وقت تو بالکل بھی نہیں۔ ناول نے بہت زبردست ٹرن لیا ہے۔" سترہ سالہ ساون نے اپنی نگاہیں ناول پر ہی مرکوز رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"نو' کلاسیک ساون! تم اپنی عمر کے حساب سے ناول کیوں نہیں پڑھتے۔ جب تمہاری ہیری پوٹر پڑھنے کی عمر تھی تب تم خلیل جبران میں گم تھے اور اب تمہاری شیکسپیئر کو پڑھنے کی عمر ہے تو تم ہیری پوٹر میں گم ہو۔ پتا نہیں تمہیں چیزیں دیر میں سمجھ آتی ہیں۔" سارہ نے شرارتی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔
"اس کا جواب میں تمہیں ایک' دو سال پہلے دے چکا ہوں۔" ساون نے کہا۔
"خیر اس بات کو چھوڑو۔ تم ابھی یہ ہرگز نہیں پڑھ سکتے۔ مجھے کھیلنا ہے' سمجھے!" سارہ نے اس کے ہاتھ سے ناول اچکا اور باہر کو دوڑ لگادی۔ ساون اس کے پیچھے احتجاج کرتے ہوئے بھاگا تھا۔ مگر سارہ کسی طرح قابو میں نہیں آرہی تھی۔
"علی! کہاں ہو علی؟ ساون کو پکڑو' پلیز میں یہ ناول گھر لے جارہی ہوں۔" سارہ نے لاؤنج میں بیٹھے اٹھارہ سالہ علی کو آواز دی' جو کہ فیکٹری کی چند ضروری فائلز آگے رکھے بیٹھا تھا۔ علی آواز سنتے ہی باہر نکلا اور ساون کو پیچھے سے دبوچ لیا۔
"او یو! چھوڑو مجھے غدار کہیں کے' چھوڑو۔" ساون اپنے آپ کو علی سے چھڑا رہا تھا اور سارہ اسے ٹھینگا دکھاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔
"میرے خیال میں تم میرے بھائی ہو اور رہتے بھی میرے ساتھ ہو۔ سارہ کے ساتھ نہیں۔ میرا خیال ہے' تمہیں وہیں شفٹ کردینا چاہیے۔" ساون نے مصنوعی غصے سے علی کو گھورا اور علی جس نے سارہ کے باہر نکلتے ہی ساون کو آزاد کردیا تھا۔ ڈھٹائی سے مسکرا دیا۔
"کم آن ساون! میں جانتا ہوں کہ تم خود بھی سارہ کو جیت جانے کا موقع دیتے ہو۔ دیکھا جائے تو میں نے اصل میں تمہاری مدد کی ہے۔" علی نے اپنی آنکھیں ساون کی آنکھوں میں گاڑ کر کہا تو ساون گڑبڑا گیا۔
"کیا مطلب' کیسے ہی موقع دیتا ہوں؟ یہ تو تم غدار بیچ میں آجاتے ہو جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ جیت جاتی ہے۔" ساون صاف مکر گیا۔ مگر سچ یہی تھا سارہ شاہ پوری دنیا میں واحد ایسی ہستی تھی کہ جس کے لیے ساون ہر وہ کام کرنے پر بھی تیار ہوجاتا تھا جو اس کے مزاج کے خلاف ہوتا۔ سارہ کی کوئی بات ٹالنا ساون کے لیے ناممکنات میں سے تھا۔ مگر جب علی اس بات کا احساس دلاتا تو وہ ہرگز نہیں مانتا تھا۔

"آؤ علی! سارہ کے پاس چلتے ہیں۔" سارہ کے جانے کے تقریباً" دس منٹ بعد ساون نے کہا۔

"کیوں؟! ابھی تو تمہاری اس سے لڑائی ہوئی ہے۔" علی کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"لڑائی؟ نہیں یار! وہ کھیلنے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے سوچا بور ہو رہی ہوگی۔ ناول وغیرہ میں تو اسے بالکل ہی دلچسپی نہیں ہے۔ آؤ چلتے ہیں۔" ساون علی کو کھینچتا ہوا سارہ کے گھر کی طرف لے گیا۔ علی وہاں جانے سے ہمیشہ جھجکتا تھا۔

"چلو بھئی! کہاں ہے تمہارا ریکٹ؟ سخت بوریت ہو رہی ہے بیٹھے بیٹھے۔"

سامنے لاؤنج میں ہی وہ صوفے پر آڑی ترچھی بیٹھی بے نیازی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ ساون کی بات پر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ شاید اسے بھی ساون کے آنے کا یقین تھا۔

"تم دونوں ہی کھیل لو۔ اب میرا موڈ نہیں ہے۔" سارہ نے ایک لمبی جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی دس منٹ پہلے تو تم تڑپ رہی تھیں کھیلنے کے لیے۔ اب اچانک کیا ہوا؟" ساون اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ سارہ کی بات پر اسے بھی کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ سارہ کے موڈ یوں ہی پل بھر میں بدلتے تھے۔

"تو دس منٹ پہلے میرا موڈ تھا اب نہیں۔ بیٹھو نا علی! اتنے پریشان سے کیوں ہو؟" سارہ نے جواب دے کر علی کو دیکھا جو بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ سارہ کے ہاں آکر اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ شایان شاہ کی سرد مہری اور عظمیٰ شاہ کی نظر میں حقارت اسے بہت کچھ باور کرا دیتی تھی۔

"دراصل میں بابا صبح مجھے فیکٹری کا کچھ کام دے گئے تھے وہ کرنا ہے۔ تم دونوں گپ شپ لگاؤ میں چلوں۔" علی نے وجہ بیان کی اور چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

علی بی بی اے کر رہا تھا جبکہ ساون بی اے آنرز میں تھا اور سارہ اے لیول کر رہی تھی۔ ساون کو لٹریچر سے جنون کی حد تک شوق تھا۔ احسان صاحب اب اس کے شوق پر زیادہ نہیں بولتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ علی اور ساون کو اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیجیں۔ لیکن دونوں نے انکار کر دیا تھا۔ علی جلد از جلد پریکٹیکل لائف میں آجانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک سال سے احسان صاحب کے ساتھ فیکٹری بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ جس پر احسان صاحب بہت خوش نظر آتے تھے۔ وہ ایک یا دو گھنٹے کے لیے فیکٹری بھی جاتا تو ان کے بہت سے مسئلے دیکھ لیتا تھا اور ایسے ایسے حل پیش کرتا تھا کہ احسان صاحب دنگ رہ جاتے تھے۔ انہیں علی میں موجود صلاحیتیں حیران کرتی جا رہی تھیں۔ یہ یقیناً خداداد صلاحیتیں تھیں۔ فن کو ہمیشہ نکھارنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن علی کو کسی پالش کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے تو شاید ایم بی اے کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ احسان شاہ کو اپنے فیصلے پر مزید اطمینان اور فخر ہونے لگا۔ اب ان کا علی کو ہارورڈ یونیورسٹی بھیجنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ اسے دور کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ ان کے لیے لازم و ملزوم ہو چکا تھا۔ علی نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ بھی بس ایک خانہ پُری کے لیے بطور پروانہ اس کا زیادہ وقت فیکٹری میں گزرتا۔ ساون انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر رہا تھا اور سارہ بی اے آنرز کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"صرف تمہاری محبت میں اس بور جگہ پر آتا ہوں، ورنہ تم تو رات بارہ بجے سے پہلے اپنی شکل نہیں دکھاتے۔" ساون نے آفس میں قدم رکھتے ہوئے شکوہ کیا تو علی مسکرا دیا۔

"آپ ہی کی محبت ہے ورنہ بندہ کس قابل؟" علی نے سر کو خم دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارا فائنل سمسٹر چل رہا ہے، تمہیں اس وقت پڑھنا چاہیے، تاکہ ان فضول فائلوں میں سر کھپانا۔ بابا کو چاہیے کہ تمہیں فیکٹری آنے سے منع کر دیں۔" ساون کو علی پر سخت غصہ آرہا تھا، جو اپنی تعلیم سے بالکل بے پروا ہوتا جا رہا تھا۔

"تم پریشان مت ہو، میں فیل ہو کر تمہارا سر نیچا نہیں ہونے دوں گا۔" علی نے شرارت سے ساون کو چھیڑا۔

"ہاں یہ تو مجھے پتا ہے کہ ہمارا سر نیچا نہیں ہوگا۔ لیکن پھر بھی کتابیں تو کھولنی ہی پڑتی ہیں۔" ساون جانتا تھا کہ شروع سے ہی علی کو عام اسٹوڈنٹس کی طرح زیادہ وقت نہیں لگتا تھا پڑھنے میں لیکن پھر بھی وہ مناسب ٹائم اپنی پڑھائی کو دیتا تھا مگر اب پچھلے چند ماہ سے اس نے علی کو اکثر کالج ٹائم میں بھی فیکٹری ہی جاتے دیکھا تھا۔ سو وہ حقیقتاً" پریشان تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بابا نے بھی اسے کبھی نہیں ٹوکا تھا۔

"تو تم سے کس نے کہا کہ میں کتابیں کھولے بغیر پاس ہو جاتا ہوں۔ وہ تو اصل میں میرے تمام ٹیچرز میرے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس لیے ہر دفعہ مجھے ٹاپ کروا دیتے ہیں۔" علی نے ایک بار پھر بات کو مذاق میں ٹالا۔

"پہلے تو مجھے بھی شک تھا، لیکن اب اس بات کا یقین ہو چکا ہے۔ کیا کھلاتے ہو ٹیچر کو؟" ساون نے بھی سنجیدگی کا لبادہ اتار دیا۔

"بس کچھ زیادہ نہیں، تمہیں بھی کوئی گر چاہیے ہو تو مجھ سے پوچھ لینا، کیا کرو گے اس "شیکسپیئر ان لو" وغیرہ کو۔" علی جو کہ انگریزی ادب میں بالکل کورا تھا۔ ایک فلم کا نام لے کر اسے چھیڑا تو ساون بھی ہنس دیا۔

"اچھا؟ یہ تو بتاؤ کہ یہ "شیکسپیئر ان لو" ہے کیا بلا؟" ساون نے اس کا امتحان لیا۔ اسے یقین تھا کہ علی اسے کوئی ناول یا کتاب سمجھ رہا ہے۔

"ایک رومانٹک فلم ہے۔" علی نے کہا تو ساون حیران رہ گیا۔

"تم نے کب دیکھی؟"

"دیکھی نہیں، اس دن میں فیکٹری آرہا تھا تو سارہ نے کال کی تھی کہ واپسی پر یہ فلم لیتا آؤں۔" علی نے بتایا۔

"لیکن صرف لانے سے تمہیں یہ کیسے پتا چل گیا کہ یہ رومانٹک فلم ہے؟" ساون کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی ٹین ایجر نہیں، ایک میچور بندہ ہوں، اگر یہ فلم دیکھ بھی لوں تو کیا حرج ہے اور دوسری بات یہ ہے میرے پیارے بھائی کہ کوئی اندھا بھی اس کا نام سنے تو اسے پتا چل جائے کہ یہ ایک رومانٹک فلم ہے۔" علی نے ساون کی تفتیش کا بھرپور جواب دیا تو ساون بھی کھسیانا ہو گیا۔

"ویسے میرے فلم دیکھنے کی تمہیں بڑی پریشانی ہے، جس نے منگوائی ہے اس کی کوئی فکر نہیں۔" علی نے معنی خیز انداز میں ساون کو دیکھا۔

"تمہارا مطلب سارہ سے ہے؟" ساون نے گڑبڑا کر کہا۔

"نہیں سارہ کی ممی سے ہے۔" علی نے اپنے بال نوچنے کی ایکٹنگ کی۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں، تمہارے حواس کام نہیں کر رہے کیا؟"

"کم آن یار! اس ایج میں لڑکیاں ایسی موویز نہیں دیکھیں گی تو کیا "ٹوم اینڈ جیری" دیکھیں گی۔" ساون نے علی کی جھنجلاہٹ پر محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یہ تو اچھا شگون ہے۔ لگتا ہے کہ وہاں کی حالت بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ تب ہی تو رومانٹک فلمیں دیکھی جا رہی ہیں۔" علی نے چھیڑا تو ساون شرما سا گیا۔

"باز آجا میرے بھائی! مت مذاق اڑا ہم غریبوں کا، ہم سادہ سے لوگ ہیں، ہمیں تنگ نہ کر۔" ساون خود ہی اپنی کیفیت پر مسکاتے ہوئے بولا۔

"او ہو! لوگ تو بیٹھے بٹھائے "ہم" ہو گئے ہیں اور سادگی تو دیکھیں دونوں کی۔" علی نے دونوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ آج وہ ساون کے دل کی بات اس کی زبان سے اگلوانا چاہتا تھا۔ اشاروں، کنایوں میں تو بات ہوتی رہتی تھی، لیکن ساون نے کبھی کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"دونوں سے کیا مطلب ہے' صرف میری بات کرو۔ وہ کیا سوچتی ہے' کیا چاہتی ہے' میں کچھ نہیں جانتا۔" ساون آہستگی سے بولا۔

"وہ بھی تو نہیں جانتی کہ تم کیا سوچتے ہو اور کیا چاہتے ہو۔" علی نے فائلیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ ہم اتنا ایک دوسرے کو جانتے ہیں کہ ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت کم سے کم پیش آتی ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں اپنی ہر بات سارہ سے شیئر کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے نہیں کرتی' کچھ نہ کچھ کہنے کی ضرورت تو رہتی ہے۔" ساون نے پہلی بار اس معاملے پر کھل کر بات کی تھی۔ علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں کیا کہوں؟ تم نے خود ہی اپنی بات کا جواب دے دیا ہے۔ اب یہی بات کسی دن سارہ سے بھی کہہ دو' لیکن تمہیں بھی کہنے کی کیا ضرورت ہے' بڑے شاید جلد ہی کوئی اسٹیپ لے لیں۔ سو ڈونٹ وری مائی فرینڈ!" علی نے اسے تسلی دی تھی' لیکن اس کی اپنی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"علی! علی! علی! مجھے کالج ڈراپ کردو۔ آج میرا ڈرائیور چھٹی پر ہے۔" سارہ نے گاڑی کا لاک کھولتے علی کو دیکھتے ہی آواز لگائی۔ وہ تیزی سے بالوں میں برش کر رہی تھی اور ایک ہاتھ میں بکس پکڑے پورٹیکو کی طرف آ رہی تھی۔

"تم خود ڈرائیو کرکے چلی جاؤ۔ میں پہلے ہی لیٹ ہو رہا ہوں یا پھر پانچ' دس منٹ انتظار کرو۔ ساون یونیورسٹی جاتے ہوئے تمہیں ڈراپ کردے گا۔" علی نے عجلت میں اپنا بریف کیس گاڑی کی سیٹ پر پھینکا اور بیٹھنے لگا۔

"میں نے لفٹ مانگی ہے' مشورہ نہیں۔" سارہ نے بھنا کر کہا۔

"اور میں مفت مشورہ دے رہا ہوں' لفٹ نہیں۔" علی نے اسی کے انداز میں جواب دیا اور گاڑی کا دروازہ بند کردیا۔

"تم ایسا نہیں کرسکتے' گاڑی روکو' ورنہ میں شور مچانا شروع کردوں گی۔" سارہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو علی نے بے بسی سے گاڑی روک دی۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی سارہ پورے گھر کو اکٹھا کرلے گی۔

"بیٹھیے۔ تشریف رکھیے۔" علی نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر غصے میں کہا۔

"شکریہ۔ اب آپ گاڑی چلا سکتے ہیں۔" سارہ نے بیٹھتے ہی شاہانہ انداز میں کہا اور علی کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہمارا خیال تھا کہ سارہ شاہ اب بڑی ہوگئی ہیں' لیکن سارہ شاہ ہر وقت اپنی حرکتوں سے یہ باور کراتی ہیں کہ انہیں بچہ ہی سمجھا جائے۔" علی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھادی تھی۔

"تم سے یہ کس نے کہا کہ لفٹ مانگنا بچوں والی حرکت ہے؟" سارہ نے تیکھے انداز میں پوچھا تو علی لاجواب ہوگیا۔

"تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

"تم سے بحث کرکے مجھے پھنسنا نہیں ہے۔" علی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ سارہ کا کالج آچکا تھا۔

"یہی تو سارا پرابلم ہے۔" سارہ کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔ علی نے جلدی سے گاڑی فیکٹری کی طرف بڑھادی۔

☼ ☼ ☼

"بھائی صاحب! آپ جانتے ہیں یہ کتنا اہم پروجیکٹ ہے۔ جاپان سے ہماری پارٹی آرہی ہے اور آپ نے تمام ڈیلنگ علی کے ہاتھ میں دے دی۔" شایان شاہ غصے میں پیچ و تاب کھاتے احسان صاحب کے پاس آئے تھے۔

"بالکل جانتا ہوں' اسی لیے علی کے حوالے کی ہے' لیکن تم شاید ابھی تک علی کو جان نہیں پائے۔" احسان شاہ نے بردباری سے جواب دیا۔

"میں کیا جانتا ہوں اور کیا نہیں۔ اس بات کو

چھوڑیں۔ آپ اس لڑکے پر ضرورت سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ ابھی وہ ناتجربہ کار ہے۔ آپ کا اندھا اعتماد ہمیں ایک بڑے کلائنٹ سے محروم بھی کرسکتا ہے۔" شایان شاہ نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ذمہ داری لیتا ہوں' اگر ہم نے یہ پروجیکٹ گنوا دیا تو نقصان میرے ذمے۔ آؤ علی بیٹا!" احسان صاحب نے علی کو دروازے پر آتے دیکھ کر کہا اور شایان شاہ جو شاید کچھ اور بھی کہنا چاہ رہے تھے' چپ کر گئے۔

"علی! تمہیں جاپان والی پارٹی کے لیے جس طرح کی بھی گائیڈنس چاہیے' شایان سے پوچھ لینا۔ اس کی آئی آر مجھ سے بہتر ہے۔" احسان شاہ نے علی کو بتاتے ہوئے ہشاش لہجے میں کہا تو شایان شاہ تلملا کر رہ گئے۔

"جی بابا! میں تو خود شایان انکل کے انڈر ٹریننگ رہنا چاہتا ہوں' جس طرح یہ ڈیلنگ کرتے ہیں' میں اس سے بہت متاثر ہوں۔" علی نے ڈرتے ڈرتے شایان شاہ کی طرف دیکھا تو ان کے تنے ہوئے اعصاب مزید تن گئے۔

"ہاں بھئی شایان! علی تو ہر وقت یہی کہتا رہتا ہے کہ مجھے اب ریٹائرڈ ہوجانا چاہیے' میں بڈھا اب کسی کام کا نہیں رہا۔ شایان انکل کو ہی سب کچھ دیکھنا چاہیے۔" احسان نے ماحول کو خوش گوار کرنے کے لیے شایان شاہ سے کہا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

"ارے نہیں بھائی صاحب! جو آپ ہیں' وہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ میں نے بھی تو سب کچھ آپ سے سیکھا ہے۔" شایان شاہ نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"اچھا اب مجھے زیادہ نہ چڑھاؤ اور علی کے ساتھ مل کر جاپان والی ڈیل کو دیکھ لو۔" احسان شاہ نے شایان شاہ کا موڈ بحال ہوتے ہی دوبارہ اپنے مطلب کی بات کی تو شایان شاہ نے ہمیشہ کی طرح اپنا سر جھکا دیا۔

☼ ☼ ☼

"علی بیٹا! گھر جاتے ہوئے سارہ کو کالج سے لیتے جانا۔ ڈرائیور شایان کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ ابھی سارہ کا فون آیا تھا کہ مجھے پک کرلیں۔"

آج سارہ کے کالج میں کوئی فنکشن تھا۔ اس لیے اسے لیٹ آنا تھا۔ علی نے فیکٹری سے نکل کر جیسے ہی گاڑی روڈ پر ڈالی تھی' احسان صاحب کی کال آگئی۔ اس نے گاڑی کا رخ سارہ کے کالج کی طرف کردیا۔ کالج گیٹ پر پہنچ کر اس نے سارہ کو موبائل پر بیل دی۔ اگلے ہی لمحے سارہ کالج گیٹ سے باہر آگئی۔ انگلش کلرز کے خوب صورت امتزاج میں وہ ہمیشہ کی طرح حسین نظر آرہی تھی۔ علی نے اگلا دروازہ کھولا تو وہ مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"مجھے پتا تھا کہ تم اس وقت آفس سے نکل رہے ہوگے اور بابا نے تمہیں ہی ریکوسٹ کیا ہوگا مجھے پک کرنے کے لیے۔" سارہ نے ایک ادا سے اپنے بال پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شایان انکل نے گاڑی کیوں لے کر دی ہے' میری سمجھ میں نہیں آتا۔" علی نے اس کی بات نظر انداز کرکے حیرت کا اظہار کیا۔

"تم بہت روڈ ہوتے جارہے ہو علی! میرا کالج کوئی آؤٹ آف وے تو نہیں ہے' جو تمہیں مسئلہ ہو رہا ہے۔" سارہ کو حقیقتاً علی کی بے مروتی نے دکھی کردیا تھا۔

"پورا کالج میری تعریفیں کر رہا تھا اور "لیڈی آف دی ایوننگ" کا ایوارڈ بھی مجھے ملا ہے' لیکن مجال ہے جو تم صرف دل رکھنے کو ہی میری تعریف کردو۔"

سارہ نے شکایتاً علی کی طرف دیکھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ علی اس سے کھنچا کھنچا سا کیوں رہنے لگا تھا۔ اس کی کسی بھی بات کا صحیح جواب نہیں دیتا تھا۔ ابھی بھی سارہ کے گلہ کرنے پر علی نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی اور ہٹالی۔ اس نظر میں کچھ نہیں تھا۔

"تمہیں کسی کی تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خوب صورت ہو اور اس میں کوئی شک نہیں۔" علی نے سامنے سڑک پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے جواب

دیا۔

"شک ہے۔ مجھے شک ہے' مجھے یقین نہیں آتا چاہے ساری دنیا مجھے اس کا یقین دلاتی رہے۔ ایک لڑکی کو سب کے یقین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف ایک شخص کے یقین دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک وہ نہ کہے لڑکی کو اپنے حسن پر شک ہی رہتا ہے۔" سارہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس ایک شخص کو لفظوں کی زبان پر یقین نہیں۔" علی نے اب کی بار مدھم لہجے میں زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ سارہ کی طرف دیکھا تو سارہ نے حیرت سے علی کے بدلتے تاثرات دیکھے۔

"اس ایک شخص کو لفظوں کی زبان سیکھ لینی چاہیے کیونکہ اسے خاموشی کی زبان بھی نہیں آتی۔" سارہ نے اسی کے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

"اس ایک شخص کی محبت لفظوں کی محتاج نہیں۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک شخص جانتا نہیں کہ محبت لفظوں کی محتاج ہوتی ہے۔" سارہ کے چہرے پر اب سارے جہان کی چمک تھی۔ اسے اس مکالمے میں مزا آنے لگا۔ علی جیسے کاروباری ذہن رکھنے والے شخص سے ایسی باتوں کی اسے توقع بھی کب تھی۔

"اس ایک شخص کو کسی اچھے وقت کا انتظار ہے۔" علی نے کہا۔

"اس ایک شخص کو پتا ہونا چاہیے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور محبت کے اظہار کے لیے کوئی برا وقت نہیں ہوتا' ہمیشہ اچھا وقت ہی ہوتا ہے۔" سارہ نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے بھرپور جواب دیا۔

"ٹھیک ہے اس ایک شخص تک آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔" علی نے گیٹ سے گاڑی اندر لاتے ہوئے سارہ سے کہا تو سارہ ہنس دی۔

"میرے خیال میں تو اس ایک شخص کو اب دیر نہیں کرنی چاہیے کہہ دینے میں... ابھی اس ایک شخص کو کان سے پکڑ کر تمہارے پاس لاتا ہوں۔" علی نے گاڑی لاک کرتے ہوئے اندر کی طرف اشارہ کیا تو سارہ ایک دم الجھ سی گئی۔

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جو لفظوں کی دنیا میں گم رہ کر بھی خاموش ہے۔" علی نے پھر اندر کی جانب اشارہ کیا۔

"تمہاری لفظوں سے کب سے دوستی ہو گئی؟" سارہ نے اچنبھے سے کہا۔

"بھئی! میں تو ہندسوں کا بندہ ہوں لفظوں کی حرمت نہیں پہچانتا' تب ہی تو بول جاتا ہوں اور جو جانتا ہے وہ خاموش ہے۔" علی نے عام سے لہجے میں کہا۔

"تم ساون کی بات کر رہے تھے؟" سارہ نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔ اور کس کی؟ کیا ہوا؟" علی نے سارہ کے تاثرات نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سارہ تیزی سے اپنے گھر کی جانب دوڑ گئی۔

علی نے گہرا سانس بھرا اور اندر کی جانب چل دیا۔

☼ ☼ ☼

آج تو شاہ ولاز کے لان کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ برقی قمقموں اور اصلی پھولوں کی سجاوٹ نے خوب صورت لان کو مزید خوبصورتی بخش دی تھی شام ہوتے ہی مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور اندرونی حصوں میں بھی معمول سے ہٹ کر چہل پہل تھی۔ کیٹرنگ والے ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ سارہ اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھی۔ آج اس کی سالگرہ تھی اور ہمیشہ کی طرح عظمٰی شاہ کے لیے اپنی بیٹی کی خوب صورتی اور اپنی دولت کی نمائش کا ایک اور موقع۔ سارہ کا آج کا ڈریس وہ پیرس کے مشہور ڈیزائنر سے خرید کر لائی تھیں اور ابھی انہیں یہ بات پارٹی میں سب خواتین کو بتانی تھی۔ باہر لان میں احسان شاہ اور شایان شاہ مہمانوں کو ویلکم کر رہے تھے جبکہ ساون اور علی کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔

"تم چل رہے ہو کہ نہیں؟ کہاں ہے تمہارا بلیک سوٹ جس میں تم بہت ڈیشنگ لگتے ہو۔" ساون نے علی کو جینز اور ٹی شرٹ میں بیٹھا دیکھ کر اس کی وارڈ روب کھولی۔ آج ساون کی تیاری بھی دیکھنے والی تھی۔ نیوی بلیو سوٹ میں سلور فریم کی عینک کے ساتھ وہ بہت ڈیسنٹ لگ رہا تھا اور جب سے علی کے سامنے آیا تھا علی کی معنی خیز نظروں اور باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ مجھے سارہ کے لیے گفٹ لینا یاد نہیں رہا۔ اب اگر میں یوں خالی ہاتھ گیا تو وہ مجھے دس لوگوں کے درمیان بے عزت کر دے گی۔ میں پہلے اس کے لیے گفٹ لے آؤں' پھر آجاؤں گا۔" علی نے بے زاری سے اپنا موبائل سائیڈ پر رکھا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"تمہاری حالت سے تو نہیں لگ رہا کہ تمہارا ابھی باہر جانے کا بھی کوئی ارادہ ہے اور ویسے بھی میں جانتا ہوں۔ تم جانا ہی نہیں چاہ رہے' تم بہت روڈ ہو' سارہ کیا سوچے گی۔" ساون اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔

"میرے نہ جانے سے وہ کچھ نہیں سوچے گی لیکن تمہارے لیٹ جانے پر وہ ضرور سوچے گی' اس لیے مجھ پر ٹائم ضائع کرنے کی بجائے تم جا کر میزبانی کے فرائض انجام دو۔" علی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو ساون شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہی نہیں ہو۔ یہ ہمارے گھر کا فنکشن ہے اور گھر کے لوگ اندر بیٹھے چینل سرچنگ کر رہے ہیں۔ شرم کرو علی! سارہ کو چھوڑو' بابا بھی برا منائیں گے۔"

ساون نے اب کی بار علی کی دکھتی رگ پکڑی تھی مگر اس نے ریموٹ سائیڈ پر پٹخا اور ساون کو خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے وارڈ روب کھولنے لگا جبکہ ساون سائیڈ پر ہو کر اس کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔

"اب کھڑے کیا دیکھ رہے ہو' جاؤ بھائی! آرہا ہوں میں دس منٹ میں۔" علی نے بے چارگی سے کہا اور وہ سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ شایان شاہ کے حوالے سے ہونے والی ہر پارٹی میں اس کو کوئی نہ کوئی بہانہ سوچنا پڑتا تھا۔ سارہ اس بات پر اسے ہمیشہ بے نقط سنا ڈالتی تھی کبھی کبھار ساون اور سارہ کے اصرار پر وہ چلا بھی جاتا تھا لیکن عظمٰی شاہ نے کبھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اسی وجہ سے وہ وہاں جا کر پارٹی کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہ رہا تھا لیکن ساون اسے الگ تھلگ نہیں رہنے دیتا تھا۔ اب بھی اسے مجبور کر گیا تھا اور پھر سارہ بھی تھی جس نے اس کی علیحدہ کلاس لینا تھی سو اس نے بغیر گفٹ کے ہی وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"ساون کے بچے! اب آرہے ہو۔ سب مہمان آچکے ہیں ماما اور پاپا دس ہزار بار تمہارا پوچھ چکے ہیں۔" سارہ جو اس وقت قدرت کا کرشمہ لگ رہی تھی غصے میں بولی۔

"سوری میڈم! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ میں تو یہاں اپنی کزن کی برتھ ڈے پارٹی پر آیا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟" ساون نے سارہ پر توصیفی نظر ڈالتے ہوئے ادھر ادھر نظریں گھمائیں تو سارہ کا میٹر گھوم گیا۔

"ابھی بتاتی ہوں میں تمہیں کہ میں کہاں ہوں۔ تمہیں تو تعریف بھی نہیں کرنی آتی۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ میں آج بہت حسین لگ رہی ہوں۔" سارہ نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا تو ساون ہنس دیا۔

"اچھا تو تم سارہ ہو میں بھی کہوں کہ..." ساون نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہنا چاہا تو سارہ نے ہاتھ سے روک دیا۔

"پلیز ساون! اوور ایکٹنگ مت کرو اور جا کر مہمانوں کو اٹینڈ کرو اور وہ عظیم بزنس مین کہاں ہے۔ پاپا کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں۔"

"آرہا ہے تھوڑی دیر میں' تیار ہو رہا تھا۔" ساون نے اس کی تسلی کرائی اور مہمانوں کی جانب چل دیا۔

"ہیپی برتھ ڈے سارہ!" علی نے سارہ کی پشت پر اسے مخاطب کیا تو وہ یکدم پلٹی۔

"تھینک یو۔ کمال ہے تم نے مجھے پیچھے سے بھی پہچان لیا اور ساون مجھے سامنے سے بھی نہیں پہچان پایا۔" سارہ نے حیرت سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ آج وہ

حد سے زیادہ حسین اور مختلف لگ رہی ہے۔ اسی لیے ہر کسی سے تعریف سننا چاہ رہی تھی۔

"وہ ایکٹنگ کررہا ہوگا ورنہ وہ اور تمہیں نہ پہچانے۔" علی نے مسکرا کر کہا اور سارہ جو اپنی تعریف سننے کے لیے بے تاب تھی علی کی آنکھوں میں اپنے لیے ستائش ڈھونڈنے لگی۔

"تو کیا تمہیں ایکٹنگ نہیں آتی؟" سارہ نے مایوسی سے کہا۔

"شکر ہے یار! تو آگیا ورنہ لڑکیوں کو جواب دے دے کر میرا منہ ٹیڑھا ہوگیا ہے۔" ساون نے جلے بھنے انداز میں علی کو دیکھا۔

"علی نہیں آئے؟ کہاں ہیں علی؟ آئیں گے تو سہی نا؟" ساون نے لڑکیوں کے اسٹائل میں نقل اتاری تو علی کو ہنسی روکنا مشکل ہوگئی جبکہ سارہ کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ سے لڑکیوں کا علی میں دلچسپی لینا کھلتا تھا۔ شاید علی کا لیے دیے رہنے والا بے نیاز انداز ہی ان اپر کلاس کی پریوں کو بے حال کیے رکھتا تھا۔

"تمہارا منہ کیوں بن گیا ہے لیڈی آف دی ایوننگ؟" ساون نے سارہ کے تاثرات دیکھ کر پوچھا۔ "اوہ اچھا۔ علی کے گفٹ نہ لانے پر۔ پلیز اسے کچھ مت کہنا۔ یہ خود اسی ڈر سے آ نہیں رہا تھا کہ سارہ مجھے دس بندوں میں بے عزت کردے گی۔" ساون نے فوراً" نتیجہ اخذ کرکے علی کو بچانے کی کوشش کی جبکہ علی کے چہرے پر ڈرنے والے تاثرات تھے۔

"میں نے اس سے پہلے کیا کبھی تمہیں دس بندوں میں بے عزت کیا ہے' جو تم ایسا کہہ رہے تھے۔" سارہ نے دکھ بھری نظروں سے علی کو دیکھا تو علی نے خوف سے آنکھیں میچ لیں' جس پر سارہ اور بھڑک اٹھی۔

"دیکھا ساون! کیسی ایکٹنگ کررہا ہے مجھ سے ڈرنے کی' جیسے بہت ڈرتا ہے مجھ سے۔" سارہ نے غصے سے علی کی اوور ایکٹنگ ملاحظہ فرمائی جبکہ ساون محظوظ ہورہا تھا۔

"تم خود ہی تو پوچھ رہی تھیں کہ مجھے ایکٹنگ آتی ہے یا نہیں۔ اب کررہا ہوں تو ناراض ہورہی ہو۔" علی نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا تو سارہ تپ گئی۔

"ویسے تم جتنی مرضی ایکٹنگ کرلو۔ میں گفٹ معاف نہیں کروں گی۔"

علی ہمیشہ کی طرح بہت ہینڈسم اور ڈیشنگ لگ رہا تھا اور ساون اسے لڑکیوں کی وجہ سے چھیڑ رہا تھا' جو بہانے بہانے سے اس سے بات کرنے کو بے تاب ہورہی تھیں۔ علی کا رویہ سب لڑکیوں سے ایک جیسا ہوتا تھا۔ وہ نہ ہی زیادہ بے تکلف ہوتا تھا اور نہ ہی بداخلاقی کا مظاہرہ کرتا۔ احسان شاہ علی کو بھی اپنے بیٹے کے طور پر ہر کسی سے متعارف کروا رہے تھے۔

علی دل سے ان کا ممنون ہوتا اور سوچتا کہ دنیا سے ابھی فرشتے ختم نہیں ہوئے۔ سب سے حیران کن بات تو آج یہ ہوئی تھی کہ عظمیٰ آنٹی نے نہ صرف اس سے مسکرا کر ہیلو ہائے کی تھی بلکہ چند خواتین سے بہت فخر سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ شایان انکل کا موڈ تو اس کے ساتھ تب ہی بہت اچھا ہوگیا تھا جب جاپان سے آئی پارٹی نے کانٹریکٹ سائن کرتے ہوئے خاص طور پر علی حسن کی صلاحیتوں کی تعریف کی تھی شاید عظمیٰ آنٹی کا موڈ بھی اس کے بعد ہی بدلا ہوگا۔ بہرحال آج اس کا اچھا دن تھا۔ پارٹی اپنے عروج پر تھی جب وہ ساون کو بتا کر باہر نکل آیا۔ اسے سارہ کے لیے گفٹ خریدنا تھا' گفٹ خرید کر واپس آیا تو تقریباً" سب لوگ جاچکے تھے' لان میں سارہ اور ساون بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ ساون اسے اپنی گفٹ کی ہوئی کتابیں کھول کھول کر دکھا رہا تھا۔ انکل آنٹی اور بابا اندر جاچکے تھے۔

"اتنی دیر لگا کر آئے ہو؟ کیا لندن چلے گئے تھے گفٹ لینے؟" ساون پریشانی سے بولا' علی آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بس یار! کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا لوں ان پرنسس صاحبہ کے لیے۔" علی نے سارہ کی طرف اشارہ کیا۔

"شکر ہے آپ نے بھی آج کے دن میں مجھے کوئی کمپلیمنٹ تو دیا ورنہ ہم تو سننے کو ترس جاتے۔" سارہ نے طنزیہ نظروں سے علی کو کہا۔

"تم نے شاید اس کے لہجے پر غور نہیں کیا۔ اگر کرلو تو پتا چلے کہ یہ کمپلیمنٹ تمہاری تیاری پر نہیں تمہاری حرکتوں پر دیا گیا ہے۔" ساون نے شرارتی انداز میں سارہ تک علی کا مطلب پہنچایا۔

"مجھ سے زیادہ اس کا لہجہ اور کون جانے گا۔ اس کے خیال میں میں بچوں والی حرکتیں کرتی ہوں' کبھی بڑی نہیں ہوسکتی اور ہمیشہ دس بندوں میں اس کی بے عزتی کرتی ہوں۔" سارہ نے پچھلے دنوں کی بھڑاس نکالی تو علی ششدر رہ گیا۔

"میں نے تو مذاق میں کہا تھا اور تم دل پر لے گئیں۔" علی نے صفائی دینی چاہی۔

"میں نے دل پر نہیں لیا۔ تم ہر وقت تو میرا مذاق اڑاتے ہو۔ مجھے سیریس نہیں لیتے۔"

سارہ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہورہا تھا۔ علی اور ساون گھبراگئے' بات سیریس ہوتی جارہی تھی۔

"کم آن سارہ! وہ بے چارہ اتنی چاہ سے تمہارے لیے پارٹی چھوڑ کر گفٹ لے کر آیا ہے اور تم ہو کہ اس کو سنائے جارہی ہو۔ صحیح تو کہتا ہے وہ کہ تم بات بے بات بے عزت کردیتی ہو۔" ساون نے اسے احساس دلایا۔

"لیکن دس بندے تو نہیں ہیں۔ یہاں صرف ہم تم ہی ہیں۔" سارہ نے تیزی سے جواب دیا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

"اب دکھاؤ بھی۔ کیا لائے ہو یا اس کے لیے مجھے ایک اور جنگ کرنی پڑے گی۔" سارہ نے جلدی سے چاروں اردگرد نظریں دوڑائیں مگر مایوسی ہوئی۔

"تم مجھے موقع دو تو میں کچھ بولنے کی جسارت کروں نا۔" علی نے گہرا سانس بھرتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب ٹٹولی اور ایک مخملیں ڈبیہ نکال کر اس کے حوالے کی۔ سارہ نے لرزتے ہاتھوں سے ڈبیہ تھام لی۔

"واؤ! مجھے یہ آئیڈیا کیوں نہیں آیا' میں خواہ مخواہ آدھا بک سینٹر خالی کر آیا ہوں۔" ساون نے ایک خوب صورت لاکٹ نکلتے دیکھ کر کہا۔

"وہ کتابیں تم نے مجھے تھوڑی دی ہیں۔ وہ تم نے خود ہی پڑھنی ہیں' بس نام کو مجھے گفٹ کی ہیں۔ ویسے بھی گفٹ اپنی نہیں' دوسرے کی پسند کے مطابق خریدنا چاہیے۔"

سارہ نے ڈبیہ کھول کر اس میں موجود لاکٹ باہر نکالا۔ اس پر لکھا "SA" سارہ سمیت ساون کو بھی چونکا گیا۔

"اصل میں اگر میں پہلے آرڈر کردیتا تو تمہارا پورا نام لکھواتا لیکن اس لاکٹ میں دو الفابیٹس کی جگہ تھی سو میں نے کہا کہ "SA" کردیں۔ یہ تم دونوں کے نام میں ہی کامن ہے سارہ اور ساون۔"

علی نے سارہ سے نظریں ہٹاتے ہوئے ساون کو بتایا جو اسی بات پر پچھتا رہا تھا کہ اسے بھی کوئی جیولری خریدنی چاہیے تھی۔ علی نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن علی کی وضاحت نے اسے مسکرانے پر مجبور کردیا۔

"ساون بیٹا! کاش تو بھی اپنا دماغ استعمال کرلیا کرے تو تجھے کے ایسے طعنے نہ سننے پڑیں۔ میں ٹھہرا کتابی بندہ اور یہ ٹھہرا حسابی بندہ۔ ہم ادبی لوگ کیا جانیں کہ لڑکیاں لفظوں سے نہیں' پیسے سے خوش ہوتی ہیں۔"

ساون اپنے ماتھے کو آہستہ آہستہ پیٹتے ہوئے بلند آواز میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ سارہ کو دیکھے بغیر جواب مبہم سے تاثرات کے ساتھ لاکٹ کو واپس ڈبیہ میں ڈال کر بند کررہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو چمک اس کے چہرے اور آنکھوں میں تھی وہ معدوم ہوچکی تھی جبکہ علی ساون کے کوسنوں پر مسکراتے ہوئے کن اکھیوں سے سارہ کو بھی دیکھ رہا تھا۔ سارہ نے اپنی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو اس کے کندھوں تک آیا اس کا بندہ اچانک اس کی شرٹ کے گلے پر بنے نفیس کام میں پھنس گیا' جس سے اس کی گردن ایک سائیڈ پر جھک گئی۔ اس کی ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ ساون جو ابھی تک اپنے دھیان میں بیٹھا اپنے اوپر برس رہا تھا' فوراً" اس

کی طرف بڑھا۔

"کس پاگل نے کہا تھا اتنے لمبے ایر رنگز پہننے کو؟ تم نے ضرور یہ فضول فیشن کرنے ہوتے ہیں اور ان ان سب کی تمہیں ضرورت بھی کیا ہے۔"

ساون اس پر جھکا اس کی شرٹ اور بال بندے سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنائیت بھرے لہجے میں بڑبڑا رہا تھا۔ بہت مکمل منظر تھا۔ علی ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اسے وہاں پر اپنا موجود ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اچانک ہی ملازم ساون کا بلاوا لے کر آ گیا۔

"مجھ سے یہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ تمہارے اچھے خاصے بال بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ انہیں کاٹ ڈالو۔" ساون نے جھنجلا کر چھوڑتے ہوئے کہا تو سارہ تڑپ اٹھی۔

"ہرگز نہیں۔ تم پھر کوشش کرو۔" سارہ نے اسی تکلیف دہ پوزیشن میں جواب دیا۔ اس ملازم کی آمد دوبارہ ہوئی تھی۔

"یہ میرے بس کا کام نہیں ہے، بہت الجھے ہوئے ہیں۔ علی یار! ذرا تم ٹرائی کرنا میں اندر جا رہا ہوں۔" ساون نے اپنے گھر کی جانب مڑتے علی کو آواز دی۔ علی کے بڑھتے قدم وہیں پر رک گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا سارہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"علی پلیز!" سارہ نے آہستگی سے کہا تو علی اس کے قریب آ گیا اور آہستگی سے اس کے بال بندے میں سے نکالنے لگا۔ سارہ کے ہاتھ میں ابھی تک وہ لاکٹ والی ڈبیہ تھی۔ علی کو لگا کہ سارہ کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ ہو رہی ہے۔ اس کا چہرہ بھی لو دے رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کی دو انگلیاں سارہ کے گال سے مس ہوئیں تو سارہ نے ایک جھرجھری لی۔ جیسے کوئی برقی رو اس میں سے گزری ہو۔ بہت آرام سے اس کی شرٹ اب الگ ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اسی پوزیشن میں گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ علی نے اس کے سامنے ہاتھ لہرا کر اسے متوجہ کیا تو وہ ایک دم سے ہوش میں آ گئی۔

"تھینک یو علی!" سارہ نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ سوری، تھینکس تم نے کب سے کہنا شروع کیا ہے۔ تم واقعی بڑی ہو گئی ہو۔" علی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور واپس مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

علی نے ایم بی اے میں ٹاپ کیا تھا اور اس کے ڈیڈ والے اسے اسکالر شپ پر باہر پڑھنے کے لیے بھیجنا چاہتے تھے لیکن علی نے انکار کر دیا۔ اب اس نے پورا ٹائم فیکٹری کو دینا شروع کر دیا تھا۔ احسان صاحب خود بخود ہر چیز اس کے حوالے کرنے لگے تھے اور تقریباً "بے فکر ہو چکے تھے۔ شایان شاہ بھی علی کی قابلیت اور صلاحیت سے متاثر ہو چکے تھے اور اب اپنے ضروری کام بھی وہ علی سے ہی کرواتے تھے۔

"بابا! مجھے اب آگے نہیں پڑھنا۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ فیکٹری کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز بابا سے میری سفارش کریں۔ ان کا خیال ہے کہ میں بزنس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" سارہ ہمیشہ کی طرح اپنا مقدمہ لے کر احسان شاہ کے پاس آئی تھی۔ احسان شاہ اس وقت علی کے ساتھ کسی اہم فائل پر ڈسکشن کر رہے تھے۔ جب سارہ دروازہ ناک کر کے اندر آئی۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے کہ ہماری سارہ بے بی اب بزنس میں انٹرسٹ لے رہی ہیں۔" احسان شاہ نے ہمیشہ کی طرح سارہ کو بے بی کہہ کر اس کی بات کی چٹکی کو ختم کرنا چاہا۔

"بابا! میں اب بے بی نہیں ہوں۔ گریجویشن کر چکی ہوں اور مجھے بزنس میں اچھا خاصا انٹرسٹ ہے اور یہ علی بھی تو ہو گا وہاں پہ مجھے سکھا دیا کرے گا۔"

سارہ نے اچانک فائل میں گم علی کی جانب اشارہ کیا تو وہ اچھل پڑا۔ سارہ سے ہر روز ایک نئی بات کی ہی توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اب جب تک وہ فیکٹری میں آنا شروع نہ کر دیتی اس کا شوق قائم رہتا تھا۔ علی جانتا تھا کہ اس صورت میں اس کی شامت

آجائے گی۔ کیونکہ سارہ شاہ کسی کام کو سنجیدگی سے تو کرتی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! ہم ابھی جاکر شایان سے بات کرتے ہیں' وہ کون ہوتا ہے۔ ہماری بے بی کو روکنے والا... چلو ابھی میرے ساتھ۔"

احسان شاہ فوراً" ہی صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سارہ کو کندھے سے تھام کر باہر نکل گئے۔ علی ہاتھ میں پکڑی فائل کو دیکھتا رہ گیا۔

"انہی باتوں نے ان محترمہ کا دماغ خراب کردیا ہے۔ اب فیکٹری میں میری شامت آئے گی۔" علی نے گردن سہلاتے ہوئے سوچا۔

☼ ☼ ☼

شایان شاہ کی کیا مجال تھی جو بیٹی اور احسان صاحب کے سامنے مزاحمت کرسکتے۔ سو فوراً" ہتھیار ڈال دیے اور اگلے ہی دن سے سارہ فیکٹری آنے لگی۔

احسان شاہ ہر جگہ سارہ کو ساتھ رکھتے اور سنجیدگی سے اسے ہر چیز سمجھاتے۔ علی کو ان کے حوصلے اور برداشت پر حیرت ہوتی' کیونکہ سارہ کے کسی انداز سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ان کی بات سمجھ بھی رہی ہے' بس ویسے ہی سرہلاتی رہتی تھی۔ علی کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہر اس منظر سے غائب کردے' جہاں پر سارہ ہو' مگر وہ اسے کہیں نہ کہیں پکڑ ہی لیتی تھی۔

"دیکھو! اگر سنجیدگی سے یہاں کچھ سیکھنا ہے تو بیٹھو ورنہ میرا ٹائم نہ ضائع کرو۔" علی نے سختی سے سارہ کو تنبیہہ کی جو مسلسل پونے گھنٹے سے اسے تنگ کررہی تھی اور احسان صاحب اسے یہاں کچھ سیکھنے کے لیے بٹھا کر گئے تھے۔

"مجھ سے بات کرتے ہوئے تمہارا ٹائم ضائع ہوتا ہے؟" سارہ نے علی کے آگے دھرے لیپ ٹاپ کو غصے سے بند کردیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے' بابا نے تمہیں سر چڑھا رکھا ہے۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیا کرنے آئی ہو یہاں۔" علی نے جھنجلا کر سارہ کو دیکھا تو سارہ معنی خیز انداز میں مسکرادی۔

"رئیلی! تو تم جانتے ہو کہ میں کیوں آئی ہوں یہاں؟" سارہ نے کیوں اور یہاں پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ علی جواب دینے کے بجائے دوبارہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ سارہ اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔

"کیا مسئلہ ہے؟" علی نے مسلسل اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کرکے کہا۔

"تمہاری آنکھوں پر غور کررہی ہوں... لوگ بہت تعریف کرتے ہیں' خاص طور پر لڑکیاں۔"

"اچھا؟" علی نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"لوگوں کا خیال ہے کہ ان میں ذہانت کی چمک ہے' وہی ذہانت جس پر تمہیں بڑا مان ہے' لیکن میرا نہیں خیال کہ یہ ذہانت کی چمک ہے۔ آنکھیں ذہانت سے نہیں چمکتیں۔ پیچھے کوئی جذبہ ہوتا ہے' جس کی چمک آنکھوں میں آجاتی ہے۔ میں اسی وجہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"ہائے گائز! اب تو مجھے اپنی پوری فیملی سے ملنے کے لیے یہاں آنا پڑتا ہے۔ ایک عظمیٰ آنٹی اور میں ہی گھر میں رہ گئے ہیں۔ ہمیں بھی یہیں آجانا چاہیے۔" ساون اچانک آدھمکا۔

"شکر ہے یار! تم آگئے۔ اس مصیبت سے میری جان چھڑاؤ... یقین کرو جب سے یہ آئی ہے۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہوپارہا۔" علی نے ساون کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا اور سارہ کی شکایت کرنے لگا۔ جبکہ سارہ افسوس بھری نظروں سے علی کو گھور رہی تھی۔

"اچھا؟ میرا تو خیال تھا سارہ کے آنے سے یہاں کا ماحول کافی خوش گوار ہوگیا ہوگا۔" ساون نے عام سے لہجے میں کہا تو سارہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"چلو ساون! کہیں باہر چلتے ہیں۔ یہاں کافی گھٹن ہے۔" سارہ نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں' تم بھی چلو نا علی! فریش ہوجاؤ گے۔" ساون نے علی سے کہا۔

"سوری بھئی' مجھے کافی کام ہے' تم لوگ جاؤ۔" علی نے معذرت کرتے ہوئے دوبارہ کام شروع کردیا تو ساون اور سارہ باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

علی بزنس کے سلسلے میں کینیڈا گیا ہوا تھا۔ ساون کے فائنل ایگزامز چل رہے تھے۔ سارہ گریجویشن سے فارغ ہوچکی تھی۔ ایسے میں احسان شاہ اور شایان شاہ نے ان دونوں کی بات باقاعدہ طور پر طے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"شکر ہے بڑے لوگوں کی شکل تو نظر آئی۔" ساون نے ایک مہینے بعد لوٹنے والے علی کو گلے لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"ہم مزدور لوگ ہیں تمہاری طرح قصے کہانیوں میں نہیں گم رہتے' کام کرتے ہیں' کیسے ہوئے پیپرز؟" علی نے اس کو ساتھ لپٹائے ہی پوچھا۔

"بس ٹھیک ہوگئے۔ ہمیں تو پڑھنا پڑتا ہے پاس ہونے کے لیے' تمہاری طرح ٹیچر کو کچھ کھلاتے پلاتے تو ہم بھی ٹاپ کرتے ہوتے۔" ساون نے معصومیت طاری کرتے ہوئے کہا۔

"سر! وہ سارہ بی بی صبح سے کئی دفعہ آپ کا پوچھ چکی ہیں۔ انہیں آپ کے آنے کا بتادوں؟" ملازم نے اندر آکر علی سے پوچھا تو ساون حیران رہ گیا۔ کیونکہ سارہ کافی دنوں سے اس طرف نہیں آئی تھی۔

"ٹھہرو' ابھی مت بتانا۔ خود ہی مل لوں گا۔" علی نے ملازم کو منع کرتے ہوئے کہا تو ساون کی سوالیہ نظریں اس پر تھیں۔

"یار! وہ سارہ نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں اس کے لیے' پوچھ رہی ہوگی۔" علی نے جلدی سے کہا تو ساون نے اس بات میں سرہلادیا۔ اسے خود بھی جلدی ہورہی تھی علی سے بات کرنے کی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا۔ اپنی اور سارہ کی متوقع منگنی کے بارے میں مگر علی فی الحال فریش ہونے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"کمال ہے یار! میں یہاں دن گن گن کر تمہاری واپسی کا انتظار کررہا تھا اور تم ہو کہ آتے ہی نہانے چلے گئے۔ ایسی کون سی مٹی دھول پڑی ہوئی تھی۔" ساون نے علی کے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا کر بلند آواز میں کہا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"یار! جواب تو دے دو کہ زندہ ہو' جس کو دیکھو اپنی ہی ہواؤں میں ہے' میرا کسی کو خیال ہی نہیں۔"

ساون نے اپنے اوپر مصنوعی افسردگی طاری کرتے ہوئے کہا اور صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ آج کل وہ مدہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ پرسوں ہی بابا نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس اتوار کو اس کی اور سارہ کی منگنی کررہے ہیں۔ سارہ سے اس کی کافی دنوں سے ملاقات نہیں ہوپائی تھی۔ وہ خود بھی اس نئے رشتے کا حسن قائم رکھنے کے لیے اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔

علی باتھ روم سے برآمد ہوچکا تھا۔ بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا بیگ کھولا اور مارگریٹ مچل کی کتاب اس کے سامنے اچھالی' ساون ہڑبڑا کر بیٹھ گیا۔

"جیو میرے بھائی! تم ہمیشہ میری پسند کا خیال رکھتے ہو۔ یہ ناول پانچ سال پہلے مجھ سے گم ہوگیا تھا اور مجھے بہت پسند تھا۔" ساون نے خوشی سے اس موٹے ناول کو دیکھا۔

"شکر ہے یہ ناول ہی نکلا' ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ کوئی محکمہ موسمیات سے متعلق کتاب نہ ہو۔" علی نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

"تم بڑی چیز ہو۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ تمہیں اس ناول کا نہ پتا ہو' اس پر تو فلم بھی بن چکی ہے۔" ساون نے گہری نظروں سے علی کو دیکھا' پھر اسے فوراً" ہی اپنی بات یاد آگئی۔

"ہاں... وہ اصل بات تو میں بھول ہی گیا۔ تمہیں ایک زبردست نیوز سنانی تھی۔" ساون نے سسپنس پیدا کیا۔ "گیس واٹ؟"

"تمہاری اور سارہ کی منگنی ہوگئی ہوگی اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ تو ہونا تھا۔ کیا تمہیں یقین نہیں آرہا؟" علی نے بالکل صحیح اندازہ لگا کر ساون کو حیران کردیا۔

"یقین تو تب آئے گا جب منگنی ہو جائے گی۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟" ساون نے بتاتے بتاتے پوچھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ علی کو وہ اس وقت بہت معصوم اور پیارا لگا۔

"تمہارے چہرے اور تمہاری آنکھوں سے۔" علی نے پیار سے اس کا شانہ دبایا۔

"یار! تم واقعی بہت ذہین ہو۔ مان لیا آج میں نے۔ ایسے ہی نہیں ساری دنیا علی حسن کا دم بھرتی اور یہ لڑکیاں، جو تمہاری ان آنکھوں کا وار سہہ نہیں پاتیں ان کا بھی تو کوئی قصور نہیں ہے۔"

ساون نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اسے ہمیشہ اپنے بابا پر مزید پیار آجاتا تھا۔ جب وہ علی کو دیکھتا تھا، اس کے بابا نے علی کو اس گھر میں لاکر ساون شاہ کو مکمل کر دیا تھا۔

"تم میری آنکھوں کی بات کر رہے ہو یا کسی محبوبہ کا ذکر ہو رہا ہے اور ان لڑکیوں کی باتوں سے متاثر مت ہو۔ یہ بھی بس ٹائم پاس کر رہی ہوتی ہیں۔" علی نے بردباری سے جواب دیا اور بیڈ پہ لیٹ گیا۔

"میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہارے بہانے میں بھی سارہ کے پاس ہو آؤں گا۔ مگر تم تو لیٹ گئے ہو۔" ساون نے اسے لیٹتے دیکھ کر کہا۔

"میں تھک گیا ہوں اور تمہیں بھی فی الحال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑا صبر کر لو۔" علی نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھے ہوئے جواب دیا تو ساون باہر نکل آیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ نہ جائے مگر پھر وہ اپنے دل کو روک نہ پایا۔

☼ ☼ ☼

"اے میڈم! کہاں رہتی ہو آج کل؟" ساون نے سارہ کا دروازہ ہلکا سا بجا کر کھولا تو وہ بیڈ پر بیٹھی نظر آئی۔

"ہاں! بس ویسے ہی کچھ طبیعت صحیح نہیں تھی۔" سارہ نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

"تم رو رہی تھیں۔۔۔؟ ادھر دیکھو۔" ساون کی سارہ کی آنکھوں پر نظر پڑی جو سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"نہیں تو۔ ویسے ہی سر میں تھوڑا درد تھا۔" سارہ نے اپنے لہجے کو خوش گوار کرنے کی کوشش کی۔

"جھوٹ مت بولو سارہ! اس سے پہلے تو تمہیں کبھی ایسا سر درد نہیں ہوا اور نہ ہی تم صرف اس درد کی وجہ سے رونے والی ہو۔" ساون نے تشویش سے اس کے چہرے کو چھوا۔ "کیا مسئلہ ہے سارہ! مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"کچھ نہیں ہے، ساون پلیز!" سارہ نے اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"تم خود ہی تو کہتے ہو کہ سارہ کو کبھی منہ سے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں خود ہی سمجھ جاتا ہوں۔ پھر اب کیوں نہیں سمجھ میں آرہا تمہیں۔" سارہ نے روتے ہوئے کہا تو ساون دم بخود رہ گیا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں سارہ کو یوں روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ غصے میں جلدی آجاتی تھی اور غصہ نکال بھی لیتی تھی۔ لیکن وہ کبھی روئی نہیں تھی۔ ساون کو لگا اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے سارہ رو رہی ہے۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟ کیا انکل، آنٹی نے کچھ کہا ہے؟ کچھ تو بتاؤ۔" ساون بے بس سا ہو کر بولا۔ اس کو آج اپنا دعوا بہت بودا لگ رہا تھا کہ سارہ کو اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے اندر تک جانتا ہے۔ وہ تو اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ ورنہ اس کے رونے کی وجہ یوں دریافت نہ کر رہا ہوتا۔

"پلیز چلے جاؤ ساون! مجھے اکیلا چھوڑ دو، ورنہ میں کچھ کر دوں گی۔" سارہ نے روتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اس وقت بے زاری زیادہ تھی یا دکھ، وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکا اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔ اس نے پھر سارہ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اس نے کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کچھ دن تک سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے۔ اس اتوار کو اس کی منگنی جو ہونے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہمارے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ سارہ! بڑی آئی ہے ساون میں؟"

عظمیٰ شاہ کڑے تیوروں سے سارہ کو گھور رہی تھیں، صبح ہی سارہ نے ناشتے کی ٹیبل پر دھماکا کیا تھا کہ وہ ساون سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس وقت سے وہ اپنے کمرے میں بند تھی اور اب شایان شاہ کے کہنے پر عظمیٰ تحمل اور پیار سے اسے سمجھانے آئی تھیں لیکن سارہ نے جس انداز میں انکار کیا تھا، اس نے عظمیٰ شاہ کو غصہ دلا دیا تھا۔

"وہ میرا سب سے اچھا دوست ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کر سکتی ماما!" سارہ نے بے بسی سے عظمیٰ کو دیکھا۔

"دوستی میں محبت زیادہ ہوتی ہے سارہ! ساون تم سے بہت محبت کرتا ہے کیا، تمہیں کبھی نہیں لگا کہ ساون تمہیں کتنا چاہتا ہے؟" عظمیٰ شاہ نے پیار بھرا لہجہ اختیار کیا۔

"نہیں ماما! ہم صرف دوست ہیں اور میرا نہیں خیال کہ ساون بھی ایسا کچھ سوچتا ہو گا۔ دوستی اور چیز ہے، محبت اور چیز۔ محبت میں دوستی کا زیادہ ہونا ضروری نہیں ہوتا ماما!" سارہ نے گیلی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"تو کیا تم کسی اور سے۔۔۔؟" عظمیٰ شاہ چاہتی تھیں کہ سارہ فوراً ان کی بات کی نفی کر دے، لیکن سارہ خاموش نظروں سے نیچے دیکھے جا رہی تھی۔

"ہونہہ! بہت اچھی طرح سے جان گئی ہوں۔۔۔ اسی دن سے ڈرتی تھی میں۔" ان کے ذہن میں جھماکہ سا ہوا، عظمیٰ شاہ نے سارہ کی اقرار میں جھکی نظروں کو غور سے دیکھا۔

"عظمیٰ! بھائی صاحب آئے ہیں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے۔ تم بھی ادھر آجاؤ۔" اچانک شایان شاہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور سارہ کی طرف دیکھے بغیر عظمیٰ سے کہا۔ عظمیٰ نے ایک غصے بھری نظر سارہ پر ڈالی جو ابھی بھی کارپٹ پر نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور باہر نکل گئیں۔ سارہ نے ایک نظر بند دروازے کو دیکھا۔

"یہی چاہتے تھے نا آپ؟ وہی ہوا جس کا ڈر تھا اور رکھیں اس غریب کی اولاد کو گھر میں۔۔۔ کیسا منصوبہ بنایا ہے اس نے ساری دولت ہڑپ کرنے کا۔" یہ عظمیٰ شاہ تھیں جو بلند آواز میں احسان صاحب اور شایان شاہ کے سامنے بول رہی تھیں اور وہ دونوں سر جھکائے سن رہے تھے۔

"اسی لیے مجھے اس لڑکے کا یہاں آنا پسند نہیں تھا۔ ساون تو سیدھا سادا بچہ اس کو ہر بات میں اپنے برابر رکھتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کل کو اسی نے اس کا بھائی بن کر اس کو ڈس جانا ہے اور میری بھی سدا کی معصوم ہر کسی کی باتوں میں آجانے والی۔ اسے کیا پتا ان لوئر مڈل کلاسیوں کی ذہنیت کا۔" عظمیٰ شاہ کسی جاہل عورت کی طرح نان اسٹاپ بولے جا رہی تھیں۔

"کیا سارہ نے تم سے خود علی کے متعلق کہا ہے؟" شایان شاہ ابھی بھی بے یقین سے تھے۔ نہ جانے ان کے ذہن میں یہ امکان کیوں نہ آسکا تھا۔

"تو اور کہتا کسے کہتے ہیں۔ ایسے ہی تو ساون سے شادی سے انکار نہیں کیا اس نے۔ اب بولیے بھائی صاحب! اب چپ کیوں ہیں؟ آپ کرتے رہیے پلاننگ اپنے بزنس کے لیے اور کروائیں اپنا بزنس وسیع اور رکھیں اسے گھر پہ۔ کیسا صلہ دیا ہے اس نے ہماری نیکی کا۔ اس نے بزنس کے ساتھ ساتھ گھر سنبھالنے کا بھی پلان بنا لیا ہے۔" عظمیٰ شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ علی کو گولی مار دیں۔

"بس عظمیٰ! اور کچھ مت کہو۔ مجھے میرے فیصلے پر اس سے زیادہ مت شرمندہ کرو، اس ذلیل کی اتنی جرأت کہ وہ ایسا سوچے بھی۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔ اس نے کیا سمجھ لیا تھا کہ جس طرح ہم اپنے کاروباری معاملات اس کے حوالے کر رہے ہیں، اسی طرح وہ گھریلو معاملات میں بھی شامل ہو جائے گا۔ اب جو بھی کرنا ہے، مجھے کرنا ہے۔ آج کے بعد وہ یہاں نظر نہیں آئے گا۔"

یہ آواز بلاشبہ احسان شاہ کی تھی۔ علی کے بابا کی اور ابھی جو انہوں نے بولا تھا۔ وہ سب ان کے دوسرے بیٹے علی کے لیے تھا، جسے وہ کبھی کبھی ساون پر فوقیت

دے جاتے تھے۔ دروازے کے باہر کھڑی سارہ کے لیے اپنے قدموں پر کھڑے ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے واپس مڑی۔ اس کا رخ ساون کے کمرے کی جانب تھا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

ساون اپنے بیڈ پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جب سارہ اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی علی ساون کے کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ فائلز ڈاؤن لوڈ کر رہا تھا۔ اس کا کمپیوٹر کام نہیں کر رہا تھا۔ ساون عین منگنی سے ایک دن پہلے اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"ہائے ساون! کیسے ہو؟" سارہ نے اپنے لہجے کو خوش گوار کرتے ہوئے پوچھا اور کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ علی کو اس کی آمد کا پتا چل چکا تھا لیکن اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ یوں اچانک؟" ساون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"ہاں! وہ اصل میں، میں اتنی ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی تم سے ایک بات شیئر کرنے کے لیے ساون! مجھے تمہیں کچھ بتانا تھا۔ اوں۔۔۔ آئی ایم ان لو۔" سارہ نے اچانک ہی کہہ دیا۔ علی جس کی انگلیاں بہت تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں ایک دم رک گئیں اور شاید اس کا سانس بھی۔ ساون نا سمجھی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سارہ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے علی کے سامنے سارہ سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

"میں کافی عرصے سے تمہیں بتانا چاہ رہی تھی لیکن میں نے سوچا ایک ہی دفعہ تمہیں ملا دوں گی اس سے۔ ویسے بھی تمہیں مجھ سے شکایت رہتی تھی ناکہ میں تم سے باتیں شیئر نہیں کرتی۔ اب دیکھ لو سب سے پہلے تمہیں بتا رہی ہوں، اس لیے کہ تم میرے سب سے اچھے دوست ہو۔" سارہ بات تو ساون سے کر رہی تھی، مگر دیکھ کہیں اور رہی تھی جہاں اب دوبارہ سے انگلیاں اس طرح کی بورڈ پر چل رہی تھیں جیسے کبھی رکی ہی نہ ہوں۔

"میں سمجھا نہیں سارہ! تم کیا بات کر رہی ہو؟" ساون ایک عجیب سی کیفیت میں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کچھ غلط ہونے جا رہا ہے لیکن اس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"میں عامر کی بات کر رہی ہوں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ تمہیں بھی پسند آئے گا۔ ماما، پپا ابھی کچھ ٹینس ہیں اور اسی لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ اگر تم انہیں سمجھاؤ گے تو وہ مان جائیں گے۔ پلیز ساون!"

سارہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔ ساون کو اس وقت سارہ کا بولنا اتنا تکلیف دہ نہیں لگ رہا تھا جتنا کی بورڈ پر چلتی انگلیوں کا شور۔ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے یہ شخص۔ میرے دل کی دنیا تباہ ہو چکی ہے اور یہ اپنی فائلز کو ڈاؤن لوڈ کر رہا ہے، یوں جیسے اس سے ضروری کام کوئی اور نہیں۔

ساون نے افسردگی سے علی کی پشت کی طرف دیکھا۔ سارہ اٹھ کر جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہہ رہے ہو ساون! اب یہ عامر کون ہے؟ کیا سارہ نے خود یہ نام لیا ہے؟"

احسان شاہ حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ ابھی ابھی عظمیٰ اور شایان شاہ کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوئے تھے ایک اہم فیصلہ کرنے کے لیے مگر ساون نے یک دم یہ بات کہہ کر تینوں کو حیران کر دیا۔

"پاپا! سارہ مجھے ابھی ابھی بتا کر گئی ہے، ابھی صرف نام بتایا ہے۔ میں نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں آپ لوگوں کو سمجھاؤں اس بارے میں۔"

ساون کی اذیت کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ صرف چند لمحوں میں اس کے خوابوں کی دنیا ختم ہو چکی تھی۔ صرف چند لفظوں نے اس کی محبت کے شہر کو مسمار کر دیا تھا اور صرف چند لمحے لگے تھے اس کو یہ فیصلہ کرنے میں کہ اسے سارہ کی ہر ممکن مدد کرنی ہے۔ نہ جانے یہ عامر کون تھا؟ کیسا تھا؟ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ سارہ کی محبت تھا۔ اس لیے بہت خوش قسمت تھا۔

"لیکن عظمیٰ! تم تو کچھ اور کہہ رہی تھیں۔"

احسان شاہ جو اپنے بیٹے کے لیے دکھی ہو رہے تھے۔ وہیں علی کے بے قصور ہونے پر انہیں ایک عجیب سا سکون بھی ہو رہا تھا۔ ورنہ آج ان کی زندگی بھر کی محنت ایک غلط فیصلے کی وجہ سے ملیامیٹ ہونے جا رہی تھی۔

"وہ بھائی صاحب! سارہ نے میرے سامنے نام تو نہیں لیا تھا مگر میرا خیال تھا کہ۔۔۔" عظمیٰ شاہ بھی کچھ پشیمان سی تھیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی تھیں۔

"چھوڑو اس قصے کو، یہ سوچو کہ اب کرنا کیا ہے؟ کون ہے یہ لڑکا۔ پوچھو سارہ سے۔" شایان شاہ نے پریشانی سے کہا۔

"میرا خیال ہے ساون! تم ہی پوچھو اس سے۔" عظمیٰ نے ساون کی طرف دیکھا تو وہ تڑپ اٹھا۔

"میں آنٹی۔۔۔! آپ پلیز خود ہی پوچھ لیں۔" ساون مزید اذیت سے بچنا چاہ رہا تھا۔

"تم سب رہنے دو۔ اب میں خود سارہ سے بات کروں گا۔ نہ جانے کس کو پسند کر بیٹھی ہے۔ ہمارے [illegible] ہے بھی یا نہیں۔"

شایان شاہ غصے سے بولے اور اٹھ کر چلے گئے۔ عظمیٰ بھی ان کے پیچھے چل دیں۔ احسان شاہ گہری [illegible] سے اپنے لاڈلے بیٹے کو دیکھ رہے تھے جو اپنے [illegible] چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور ساون کے کمرے میں بیٹھا علی اب آخری فائل ڈاؤن لوڈ کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"[illegible]ن ہے یہ لڑکا؟ کیا کرتا ہے؟ اور تم کب سے [illegible] ہو؟" شایان شاہ آگ بگولا ہوتے سارہ کو دیکھ رہے تھے۔ سارہ سر جھکائے مسلسل روئے جا رہی تھی۔

"اب بتاتی کیوں نہیں ہو؟" شایان شاہ اونچی آواز میں دھاڑے تو عظمیٰ بھی دہل گئیں۔

"آہستہ بات کریں، کیا ہو گیا ہے، بتا دے گی۔ میں پوچھتی ہوں اس سے۔" عظمیٰ نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک یہ مجھے اس لڑکے کے بارے میں نہیں بتائے گی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" شایان شاہ سامنے صوفے پر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ سارہ سامنے ہی فلور کشن پر بیٹھی تھی۔

"وہ فیکٹری میں پروسیسنگ ڈپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔ نیا ہے ابھی۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے اسے۔ اس کی پوسٹ بھی اتنی اچھی نہیں ہے، لیکن اس نے انجینئرنگ پڑھی ہوئی ہے۔" سارہ نے ڈرتے ڈرتے باپ کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ اپنے باپ کو اتنے غصے میں دیکھا تھا اور شاید پہلی بار ہی شایان شاہ نے اس کے اتنے آنسو بہہ جانے دیے تھے۔

"کیا؟ وہ ہماری فیکٹری کا معمولی ملازم تمہاری پسند ہے؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ کیا اس کے لیے تم فیکٹری جاتی تھیں۔" شایان شاہ کھول کر رہ گئے اور عظمیٰ شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی۔

"جی۔" سارہ نے اقرار جرم کیا۔

"مائی گاڈ! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کہہ دو کہ تم ہمارے ساتھ مذاق کر رہی ہو۔" شایان شاہ دونوں ہاتھوں میں اپنے بال پکڑے بیٹھے تھے۔

"پاپا مجھے عامر سے ہی شادی کرنا ہے۔" سارہ نے نڈر ہوتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ شایان شاہ اور عظمیٰ شاہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

شایان شاہ نے اپنے آفس میں داخل ہوتے ہی انٹرکام پر سیکریٹری کو عامر کی فائل لانے کی ہدایت کی۔ وہ رات ہی عامر کے متعلق تمام اہم معلومات حاصل کر چکے تھے۔ وہ ایک بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا اور تین بہنوں کا بھائی تھا۔ اس کا گھر شہر کے لوئر مڈل کلاس علاقے میں تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کی امیدوں کا واحد مرکز تھا اور یقیناً "سارہ کے ذریعے اس نے شارٹ کٹ مارنے کی کوشش کی تھی۔ سیکریٹری نے عامر کی فائل لا کر

دے دی تھی۔ ابھی وہ اس کا بغور مطالعہ کر رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور وہ اندر آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

"ہاں آجاؤ۔" انہوں نے اسے اجازت دیتے ہوئے اوپر سے نیچے تک اسے دیکھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ بھی متاثر کن نہیں تھا۔ نہ جانے سارہ نے کیا دیکھا تھا۔ بہرحال شایان شاہ نے اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

"جی سر!" عامر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو تم میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" شایان شاہ نے بلا تمہید پوچھا۔

"جی نہیں۔۔۔ آپ کی بیٹی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اگر وہ ایسا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" عامر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر شایان شاہ کو پریشان کر دیا۔

"کیا وہ تم سے ملتی رہتی ہے؟" شایان شاہ کو خود ہی اپنے سوال کے بودے پن کا احساس ہوا۔

"جی سر! جب وہ فیکٹری آتی تھیں تو تقریباً" روزانہ ہی ملاقات ہو جاتی تھی لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ۔" عامر نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہنا چاہا۔

"تم یہاں سے شکل گم کرنے کے کتنے پیسے لو گے؟" شایان شاہ سرد لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"میں سمجھا نہیں۔" عامر جو اب ذرا سہولت سے بات کر رہا تھا۔ اس سوال پر بھونچکا رہ گیا۔ کل رات ہی تو سارہ نے اسے فون پر شادی کی پیش کش کی تھی۔ یہ بات اتنی اچانک اور اتنی حیرت انگیز تھی کہ پوری رات وہ خوشی سے سو نہیں پایا تھا۔ ایک رات میں ہی اس نے اپنے آپ کو نہ جانے کتنے آسمانوں کی سیر کرادی تھی۔ لیکن ابھی جو بات سارہ کے باپ نے کی تھی وہ اسے واپس اسی جہان میں لے آئی تھی۔

"سمجھ تو تمہیں اب آئے گی اور وہ بھی اچھی طرح۔۔۔ تم نے کیا سوچ لیا کہ میری بیٹی کہے گی اور میں تمہیں بارات لانے کا کہہ دوں گا۔ شکل دیکھی ہے آئینے میں اپنی؟ اور تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ دو کوڑی کے انسان۔"

شایان شاہ بھڑک اٹھے اور عامر کی فائل اٹھ کر دیوار پر دے ماری۔ عامر اب اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ ویسے بھی رات سے اب تک وہ مسلسل انہونیوں کی زد میں تھا۔ وہ خود بھی سوچتا رہا تھا کہ کہاں وہ اور کہاں سارہ شاہ۔ اکثر اوقات آتے جاتے وہ اس سے ہنسی مذاق کر لیتی تھی لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس میں دلچسپی لینا شروع کر دے گی۔ بالکل فلموں والی صورت حال ہو گئی تھی۔

"آپ یہ سب مجھے کیوں کہہ رہے ہیں؟ اپنی بیٹی کو سمجھائیں۔ میں نے اسے نہیں کہا' اس نے مجھے کہا ہے۔" عامر نے تمسخرانہ لہجے میں شایان کی کڑوی باتوں کا جواب دیا۔

شایان شاہ اپنی ہتھیلی پر مکا مار کر بیٹھ گئے۔ وہ اس وقت بے بسی کی انتہا پر تھے۔ ان کی بیٹی نے آج انہیں عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ کاش اس کی جگہ وہ علی کا نام ہی لے لیتی۔ ان کے دل میں ایک دم یہ خواہش ابھری۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔ تمہارا کوئی قصور نہیں' تم جا سکتے ہو' میں بعد میں تم سے بات کروں گا۔" شایان شاہ نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"تھینک یو سر!" عامر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ ایک باپ کی بے بسی سے محظوظ ہو رہا تھا اور اس وقت کا لطف لینا بنتا بھی تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا سوچ رکھا تھا ہم نے اور کیا ہو گیا۔" احسان شاہ ساون کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے' جواں کی گود میں سر رکھے سکون حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ورنہ پچھلے دو دنوں سے زندگی بہت بدل چکی تھی۔

"بابا! مجھے لگتا ہے میں نے صرف اپنی محبت نہیں کھوئی' تم نے بچپن کی دوست کو بھی کھو دیا ہے۔ سارہ

بہت بدل گئی ہے' مجھے ہمیشہ اس سے یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ اپنی فیلنگز مجھ سے شیئر نہیں کرتی اور اب جب اس نے اپنی فیلنگز مجھ سے شیئر کی ہیں تو مجھے پہلی دفعہ وہ اپنی نہیں لگی بہت دور محسوس ہوئی۔"

ساون کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے دھیرے دھیرے بول رہا تھا اور احسان شاہ آنکھوں میں نمی لے کر اس کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے بیٹے کو بہلائیں۔ آج پہلی بار وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔ وہ ایک ایسے مسئلے سے دوچار تھے' جو نہ شایان شاہ حل کر پا رہے تھے اور نہ ہی ان کا کوہر نایاب عمی حسن۔

"کاش! کسی انجانے کی بجائے سارہ' علی کو ہی پسند کر لیتی تو شاید ہم اتنی تکلیف میں نہ ہوتے۔" یہ انجانا سا کاش' نہ جانے ان کے دل کے کس کونے سے ابھرا تھا۔ وہ اس بات پر خود بھی حیران رہ گئے تھے۔

علی نے رات ایک بجے گاڑی گیراج میں روکی تو لان میں بیٹھے ساون کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ گاڑی لاک کر کے وہ اس کی طرف چلا آیا۔

"کیا بات ہے ساون! آدھی رات کو باہر کیا کر رہے ہو' چلو اندر سردی ہو رہی ہے۔" علی نے تشویش سے ساون کا کندھا تھپتھپایا۔

"تمہیں کیا' میں جیوں یا مروں' تم تو آدھی رات تک گھر سے باہر ہوتے ہو' میرے دل پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور تمہیں اپنے کاموں سے فرصت نہیں۔ مجھے اس وقت تمہاری ضرورت تھی لیکن تم نہ جانے کیسے دوست ہو۔" ساون' علی کے پوچھتے ہی پھٹ پڑا۔ علی شرمندگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے' وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں سمجھتا ہوں تمہارے جذبات' لیکن تمہیں تسلی دینے کو میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔ تم تو جانتے ہو' لفظوں کا میرے پاس ہمیشہ کال پڑا رہتا ہے۔ کسی کے جذبات کا خیال کیسے رکھتے ہیں' میں نہیں جانتا۔ مجھے معاف کر دو پلیز۔" علی نے شرمندہ لہجے میں ساون سے کہا تو ساون کی آنکھیں یکدم چھلک پڑیں۔

"ایسے مت کہو یار! میں کیا تمہیں جانتا نہیں ہوں۔ تم میری روتی بسورتی صورت نہیں دیکھنا چاہ رہے تھے۔ اسی لیے گھر سے غائب رہتے ہو۔" ساون نے آنکھیں رگڑتے ہوئے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"ویسے تم روتے ہوئے کافی کیوٹ لگتے ہو۔" علی نے بھی ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا؟ پھر تو مجھے اپنے چہرے پر ہمہ وقت یہی تاثر رکھنا چاہیے۔" ساون کی ہنسی میں دکھ تھا۔

"اللہ نہ کرے یار! تم ہنستے ہوئے زیادہ کیوٹ لگتے ہو' اچھا اب تمہاری بہت تعریفیں ہو گئی ہیں۔ چلو اندر چلیں۔ کافی ٹھنڈ ہے باہر۔" علی نے اسے اٹھتے ہوئے کہا تو ساون بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لاؤنج میں آگئے۔

"تم نے عامر کو دیکھا ہے؟" اچانک ساون نے علی سے پوچھا تو علی کے اعصاب تن گئے۔ اسی موضوع سے وہ بچنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"کیسا ہے؟"

"عام سا ہے۔ کچھ خاص نہیں۔" علی نے پھر سرسری سا جواب دیا۔

"تمہیں اس میں کچھ خاص نہیں لگا؟ وہ جس سے سارہ شاہ محبت کرتی ہے' اس میں کچھ بھی خاص نہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ایسا ہی ہے۔" علی نے بے زاری سے کہا۔

"ایسا نہیں ہے۔" ساون نے قطعی لہجے میں کہا۔

"تم خود دیکھ لینا۔" علی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں فی الحال اسے نہیں دیکھنا چاہتا۔" ساون نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" علی نے ساون کے گال کو سہلایا اور اپنے بیڈ روم کی جانب چل دیا۔ ساون کو اس سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ ایک لالچی شخص ہے' برباد کر دے گا وہ تمہیں اور پورے خاندان کو بھی۔" علی نے عامر کی فائل لا کر سارہ کے سامنے پھینکی۔

"جو پہلے سے ہی برباد ہے' اس کو کون برباد کرے گا۔" سارہ نے علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو علی نے نگاہیں پھیر لیں۔

"اور جو خود اپنے آپ کو برباد کرنا چاہ رہا ہو' اسے میں کیا کہوں؟" علی تھکے ہارے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اسے سارہ شاہ کہہ لیا کرو۔ ٹھیک ہے' مجھے یہ بربادی بھی قبول ہے۔" سارہ آہستگی سے چلتی ہوئی علی کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"میں تمہیں عامر کی فائل دکھانے لایا تھا۔ یہ لڑکا جب سے آیا ہے' کئی کاموں میں ہیرا پھیری کر چکا ہے۔ میں فی الحال اسے صرف آبزرو کر رہا تھا۔ سوچا تھا کسی ٹھوس ثبوت کے ملنے پر ہی سامنے لاؤں گا' لیکن تم نے درمیان میں اپنی بات شروع کر لی۔" علی' سارہ کے اتنے قریب بیٹھنے پر ایکدم اٹھ کھڑا ہوا اور فائل اٹھا کر اس کو دکھائی۔

"اچھا ہے نا۔ ہیرا پھیری تو کرتا ہے۔ تمہاری طرح مخلص نہیں ہے شاہ انڈسٹریز والوں سے۔" سارہ نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں اس گھر کا بیٹا ہوں اور بیٹے ہیرا پھیری نہیں کرتے۔" علی نے سارہ کو جتایا تو سارہ کو کچھ دن پہلے کے احسان شاہ کے کہے الفاظ یاد آگئے جو انہوں نے اس بیٹے کی شان میں کہے تھے۔

"تمہیں اگر کسی بھی بندے سے شادی کرنا تھی تو ساون کیوں نہیں۔" علی نے آہستہ آواز میں سارہ کو سمجھانا چاہا۔

"نہیں۔ ساون سے کبھی نہیں' میں نے اپنی محبت نہیں پائی' تم چاہتے ہو کہ میں اپنا دوست بھی کھو دوں؟" سارہ کارپٹ سے اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"جہاں دوستی ہو' وہاں محبت بھی ہو ہی جاتی ہے۔" علی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا؟ تم محبت کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ سارا دن دو اور دو چار کرنے والے! جو کام تم نے کیا ہی نہیں اس کے بارے میں مت بولو۔" سارہ شکایتی نظروں سے علی کو دیکھ رہی تھی۔

"میں نے نہیں کیا۔ ساون نے تو کیا ہے۔ بہت شدید محبت کرتا ہے وہ تم سے۔ مت کرو ایسا اس کے ساتھ۔" علی نے دکھ بھری نظروں سے سارہ کو دیکھا۔

"بہت شدید محبت تو میں بھی کرتی ہوں تم سے۔ تم کیوں ایسا کرتے ہو میرے ساتھ؟" سارہ نے علی کی شرٹ پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ "بولو! اب بولتے کیوں نہیں۔"

علی سپاٹ چہرہ لیے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنے آپ کو سارہ سے چھڑانا چاہا۔

"مت کرو ایسا میرے ساتھ' کیا ملے گا تمہیں یوں دن رات کام کر کے؟ کیوں خوار کر رہے ہو اپنے آپ کو؟" سارہ نے مضبوطی سے علی کی شرٹ پکڑ رکھی تھی اور علی مسلسل چھڑانے کی کوشش میں تھا۔

"میں کسی کے لیے اپنے آپ کو خوار نہیں کر رہا۔" علی نے سارہ کا بازو پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کیا چیز ہو تم اور کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو۔ کیوں نہیں نارمل انسانوں کی طرح رہتے؟ کچھ نہیں ملے گا تمہیں یہاں سے۔ پلیز علی! کہہ دو کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو' کہہ دو کہ تم صرف ساون کی وجہ سے اپنی محبت سے دست بردار ہو رہے ہو۔ ایک دفعہ کہہ دو' صرف ایک دفعہ۔ میں سب کچھ اپنے سر لے لوں گی۔ تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ اگر تم کسی کا سامنا نہیں کر سکتے تو ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ کہیں دور چلے جائیں گے' تمہیں کسی کو جواب دہ نہیں ہونا ہو گا۔ کہہ دو علی پلیز!" سارہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے علی کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ علی' سارہ کے پاس

سے نے پر پچھتا رہا تھا۔

"میں تمہیں کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا اور یہی سچ ہے میں تمہیں صرف اور صرف عامر جیسے بندے سے باز رکھنے آیا ہوں لیکن تم کچھ سمجھنے پر تیار نہیں ہو۔ اس فضول ضد میں کسی کی جان بھی جاسکتی ہے۔" علی نے سارہ کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"آخر تم کسی سے تو شادی کرو گے زندگی میں تو پھر میں کیوں نہیں۔ تم بے شک مجھ سے محبت مت کرنا مگر میرے ساتھ تو ہو گے نا۔ میرے لیے یہی کافی ہوگا۔ اگر تم مجھ سے شادی کرلو تو میں کبھی بھول کر بھی کسی عامر کا نام نہیں لوں گی۔" سارہ کی آنکھیں رو رو کر لہو رنگ ہو چکی تھیں اور علی کی آنکھیں بغیر آنسوؤں کے ہی سرخ ہو رہی تھیں۔ سارہ آج بھی اپنی ضد پر اسی طرح قائم تھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہے تم ساون سے شادی کرلو۔" علی نے فائل اٹھائی اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے، سارہ ایک دم اس کے سامنے آگئی۔

"نہ جانے لوگ تمہاری آنکھوں کی تعریف کیوں کرتے ہیں، مجھے تو یہ بالکل پسند نہیں، ان میں سب کچھ ہے، صرف میرے لیے محبت نہیں۔"

سارہ نے علی کے سینے پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ علی نے ایک جھٹکے سے اسے علیحدہ کیا تو وہ چلائی۔

"نہیں کروں گی میں ساون سے شادی۔"

علی رکے بغیر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"تم مجھے سکون سے نہیں جینے دو گے؟ آخر کیا بگاڑا تھا اس معصوم شخص نے، جسے اچانک ہی کیس بنا کر جیل بھجوا دیا گیا ہے۔" علی اپنے آفس میں بیٹھا تھا جب سارہ نے اس کے موبائل پر کال کی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ عامر کو میں نے جیل بھجوایا ہے؟" علی نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں! اور کون ہو سکتا ہے۔ تم ہی تو ہو اس گھر کے سب سے بڑے ہمدرد اور تمہیں ہی تو اس پر شک تھا۔" سارہ غصے سے بولی۔

"ہاں! وہ سب ٹھیک تھا، لیکن اس پر غبن کا کیس میں نے نہیں کیا۔ ابھی میں اتنا بااختیار نہیں ہوا۔" علی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"اس کے خلاف ہیرا پھیری کے کئی ثبوت میرے پاس ضرور تھے، لیکن میں نے ابھی کوئی ایکشن نہیں لیا تھا اور یہ غبن کا کیس سچا ہے یا جھوٹا، مجھے نہیں معلوم بہرحال وہ نہ تو معصوم ہے اور نہ ہی بے قصور۔"

"اور اگر جو میں عامر کی جگہ علی کا نام لے دیتی تو کیا آج علی سلاخوں کے پیچھے ہوتا؟" اس سے زیادہ سارہ سوچ نہیں سکی تھی۔

"تو کیا بابا نے؟"

"ہاں، شکر کرو کہ اس بیوہ ماں کے بیٹے کو اپنی جان سے ہاتھ نہیں دھونے پڑے۔" علی نے آہستگی سے سارہ کو بتایا۔

"تو کیا پاپا اس حد تک بھی جاسکتے تھے؟" سارہ نے دکھ سے کہا۔

"اگر وہ ایسا بھی کر دیتے تو کسی نے کیا کر لینا تھا۔" علی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو سارہ خاموش ہو گئی اور موبائل آف کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ لیا تم نے اس محبت کا انجام؟ بس اتنی سی بات تھی جس کے لیے ہم اتنے پریشان ہو رہے تھے۔" شایان شاہ نے خوش گوار انداز میں عظمیٰ شاہ کو بتایا۔

"ہاں! وہ تو ٹھیک ہے، لیکن سارہ کا رویہ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا۔ وہ اتنی پریشان بھی نہیں ہوئی جتنا اسے عامر کے گرفتار ہونے پر ہونا چاہیے تھا بلکہ مجھے تو وہ بہت پرسکون لگ رہی ہے۔" عظمیٰ شاہ کو اپنی بیٹی کے بدلتے موڈ سمجھ نہیں آرہے تھے۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں مسز! آج کل کے بچوں کی ایسی ہی محبتیں ہوتی ہیں۔ ادھر ہم نے عامر کو نظروں سے اوجھل کیا اور ادھر سارہ کے سر سے محبت کا بھوت غائب ہو گیا۔ ان بچوں کے لیے یہ سب کچھ کسی ایڈونچر سے کم نہیں ہے۔ اب دیکھ لینا کچھ دنوں تک وہ ساون سے شادی پر بھی راضی ہو جائے گی۔" شایان شاہ اپنی کارکردگی بڑے مطمئن انداز میں بتا رہے تھے۔

"بالکل صحیح کہتے ہیں پاپا! یہی تھی میری محبت۔ لیکن جو منظر سے غائب ہو گیا ہے، وہ میری محبت نہیں اور جو میری محبت ہے، اسے میں منظر سے غائب ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں ساون سے شادی ضرور کروں گی۔ ایک ایڈونچر اور سہی۔" سارہ دروازے کے باہر کھڑی اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا کر رہے ہو بیٹا!" علی رات کو سونے کے لیے بیڈ روم میں آیا ہی تھا کہ احسان شاہ دروازے پر دستک دے کر اندر آگئے۔

"بابا! آپ اس وقت، خیریت؟" علی نے پیار سے بابا کو کندھے سے تھام کر صوفے پر بٹھایا۔

"ہاں! کافی دنوں سے تم سے زیادہ بات نہیں ہوئی، آج میں نے سوچا تم جتنی بھی دیر سے آؤ میں جاگتا رہوں گا۔"

احسان شاہ کافی بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے۔ علی نے غور کیا کہ ساون کا احسان صاحب نے بہت اثر لیا تھا۔ وہ کافی دنوں سے فیکٹری بھی نہیں آرہے تھے۔ شاید ساون کی دل جوئی کے خیال سے۔

"اوہ سوری بابا! میری وجہ سے آپ جاگتے رہے۔ آپ فون کر دیتے میں جلدی آجاتا۔" علی کاؤچ پر احسان شاہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

"علی! تم ساون کو بھی اپنے ساتھ ساتھ رکھا کرو۔ اسے بزنس میں انوالو کرو، چاہے زبردستی ہی کرو، وہ تمہاری بہت مانتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ بہت اکیلا اکیلا سا ہو گیا ہے۔" احسان صاحب نے اصل بات کا آغاز کیا۔

"بابا! میں تو خود چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ آفس جایا کرے، لیکن آپ تو جانتے ہیں اسے، بہرحال میں پوری کوشش کروں گا کہ وہ بزنس میں انٹرسٹ لینا شروع کر دے۔ آخر کو یہ سب کچھ اسی کا تو ہے اور اسی کو سنبھالنا ہے۔"

علی نے بہت عام سے لہجے میں بات کی تھی۔ لیکن احسان شاہ چونک گئے۔ علی کو بھی اپنے بولنے کا احساس ہوا تو یکدم چپ ہو گیا۔

"یہ سب کچھ تمہارا بھی تو ہے۔" احسان شاہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا۔ وہ ابھی تک اس بات کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتے تھے کہ آیا علی کا مقام آئندہ کے لیے کیا ہوگا۔ کیا وہ یوں ہی فیکٹری سنبھالتا رہے گا یا پھر اسے کوئی حصہ بھی ملے گا اور اسی ایک سوال کا وہ شایان اور عظمیٰ کو جواب نہیں دے پائے تھے۔ علی خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے مسلسل اپنی کہی ہوئی بات پر بے چینی ہو رہی تھی، جو انجانے میں اس کی زبان سے پھسل گئی تھی۔

"اور ہاں علی! میں بتانا بھول ہی گیا۔ سارہ نے ساون سے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے۔" علی نے جھکا سر ایک دم اٹھایا۔ سارہ نے سوچ رکھا تھا کہ شاہ ولاز میں دھماکے ہوتے رہیں اور یہ اس کا نیا کارنامہ تھا۔

"اوہ رئیلی! یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ کیا ساون کو پتا ہے؟" علی نے فوراً ہی احسان شاہ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن اب وہ نہیں مان رہا۔ کہتا ہے ہم سب نے سارہ کو زبردستی اس بات پر تیار کیا ہے اور وہ عامر کی گرفتاری پر بھی ہم سے ناراض ہے۔ تم اسے سمجھاؤ۔ تمہارے علاوہ کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں یہی بات کہنے آیا تھا۔" احسان شاہ نے ہمیشہ کی طرح اس پر اعتبار کرتے ہوئے ایک مشکل کام اس کے سپرد کر دیا تھا۔

"تم اسے سمجھاؤ کہ اس بار سارہ نے خود ہی اس خواہش کا اظہار کیا ہے، اسے کسی نے مجبور نہیں کیا۔" علی کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ آگئی

تھی۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☼ ☼ ☼

"تو لوگ یہاں بیٹھے ہیں چھپ کر' کیا منگنی تک پردہ کرنے کا پروگرام ہے۔" علی نے پورے گھر میں ساون کو ڈھونڈنے کے بعد اسے ٹیرس پر بیٹھا دیکھا تو وہیں چلا آیا۔ ساون نے علی کی بات پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"کس کی منگنی؟"

"تمہاری منگنی اور کس کی۔" علی نے اس کی کم علمی پر افسوس سے سر ہلایا۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ میں منگنی کر رہا ہوں؟" ساون نے ماتھے پر تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ علی کو بابا نے اس سے بات کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

"یہ فضول سوال اب بند کرو اور مزید نخرے کرنا بھی بند کرو' میں کیا تمہیں جانتا نہیں ہوں کہ اس وقت تمہارے اندر کیسے لڈو پھوٹ رہے ہیں۔" علی نے اس کی کمر پر دھپ مارتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے' سارہ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔" ساون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"نہیں یار! سارہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ اس بات کی گارنٹی میں تمہیں دیتا ہوں۔" علی نے ساون کی بات کی نفی کی۔

"لیکن عامر کو گرفتار۔۔۔" ساون کی بات علی نے درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"میں تمہیں عامر کے خلاف ثبوت دکھا سکتا ہوں۔ وہ ایک لالچی انسان ہے اور سارہ کی محبت بھی بس ایسی ہی تھی جیسے ہی وہ جیل گیا ہے' سارہ نے ایک دفعہ بھی اس کے بارے میں نہیں پوچھا۔" علی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں نہیں مانتا۔" ساون نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میرا دل نہیں مان رہا۔"

"تمہارا دل تو شروع سے مانا ہوا ہے۔ اس دل کی ایسی کی تیسی۔" علی نے جارحانہ انداز میں ساون کو گھورا۔

"کیا محبت ایسی بھی ہوتی ہے؟" ساون نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اول تو وہ محبت نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو پھر ایسی ہی ہوتی ہوگی۔" علی نے پہلا جملہ یقین کے ساتھ اور دوسرا بے یقینی سے ادا کیا تھا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ محبت نہیں تھی؟" ساون نے علی کے یقین بھرے انداز پر پوچھا۔

"بس مجھے ایسا نہیں لگا تو میں نے کہہ دیا۔ ویسے بھی محبت وحبت جیسی فضول چیز کے بارے میں مجھے کیا پتا؟"

"میرے بھائی! جب تک یہ ہوتی نہیں۔۔۔ فضول ہی لگتی ہے۔" ساون نے گہرے انداز میں کہا۔

"ہاں! اور کبھی کبھی ہو جانے کے بعد بھی فضول ہی لگتی ہے۔" علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس جملے سے کسی ناکام عاشق کی بو آ رہی ہے۔" ساون نے علی کا جملہ پکڑ لیا تو علی گڑبڑا گیا۔

"تم تو الٹا میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں یہاں تمہاری خبر لینے آیا تھا۔" علی نے ساون کو پکڑ کر اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے تم بھی کچھ باخبر ہوئے ہو۔" ساون نے طنزیہ لہجے میں کہا تو علی نے چونک کر اس کے چہرے کو جانچنے کی کوشش کی۔

"کیا بات ہے ساون! اتنے تلخ کیوں ہو رہے ہو؟ اس انداز میں کیوں بات کر رہے ہو؟" علی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار! تمہاری مصروفیت کی وجہ سے کر رہا ہوں' حالانکہ جانتا ہوں کہ مجھے تمہارا ہاتھ بٹانا چاہیے' لیکن کیا کروں اب تو کسی کتاب میں بھی دل نہیں لگتا۔" ساون کی آنکھوں میں نمی آنے لگی۔ علی نے گہرا سانس بھرا۔

"اچھی بات ہے کہ تمہیں خود ہی احساس ہو گیا۔ تمہیں کام کرنا چاہیے' تم صرف میرا ہاتھ نہیں بٹاؤ گے' بلکہ آہستہ آہستہ میرے کندھے سے تمام ذمہ داریاں اتاروگے اور بہت جلد تمہیں یہ سب کرنا ہوگا۔" علی نے ساون کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"کیوں' تمہیں کہیں جانا ہے کیا؟" ساون نے بڑا فا" کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ اب میں کیا ساری زندگی کام ہی کرتا رہوں گا؟ جن کی ذمہ داری ہے' وہ تو مزے سے عشق فرمانے میں مصروف ہیں اور میں بے چارہ مظلوم۔۔۔ کیا مجھے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے' اب میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں' اس لیے چاہتا ہوں کہ تم اپنی ذمہ داریاں سمجھو اور سنبھالو۔"

علی نے تفصیلاً ساون کو لتاڑا' وہ چاہتا تھا کہ چاہے کسی بھی طرح مگر ساون مصروف ہو جائے اور بزنس سے اچھی مصروفیت کیا ہو سکتی تھی۔

"بالکل صحیح فرمایا جناب نے! کافی اچھا نقشہ کھینچا ہے تم نے اپنی مظلومیت کا' مگر مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ تم اور کیا کرنا چاہتے ہو؟ تم جیسا بندہ بزنس کے علاوہ بھی کچھ کر سکتا ہے؟" ساون نے علی کی بات کی سنجیدگی کو دو سیکنڈ میں ہوا میں اڑا دیا۔

"تم مجھے مزید باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔ میں اب دنیا دیکھنا چاہتا ہوں' گھومنا پھرنا چاہتا ہوں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب بابا اور انکل کو یقین ہو جائے کہ ساون شاہ اپنے بزنس کو سنبھالنے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔"

علی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اسے ہر صورت ساون کو راضی کرنا تھا۔ ساون کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ علی اسے غم جاناں سے ہٹا کر غم دوراں کی طرف کھینچ لایا تھا۔

"بہت سرکار! کیا کہنے آپ کے۔۔۔ اب ہم آپ کی بات ٹال تو نہیں سکتے' کوشش کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکیں۔ محبت میں تو نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔" ساون نے زخم خوردہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"اگر نااہل ثابت ہوتے تو اس جمعے کو تمہاری منگنی نہ ہو رہی ہوتی اور اب بس کرو اس مظلوم عاشق کے کردار کو کیونکہ اب تم ہرگز بھی مظلوم نہیں رہے۔ سارہ نے آخر اپنے دوست میں محبت ڈھونڈ ہی لی' بس اسے تھوڑا ٹائم لگا ہے ڈھونڈنے میں۔" علی آج کل کافی زبردست باتیں کرنے لگا تھا۔ ساون کو اچانک خیال آیا تھا۔

"تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔" ساون نے بے فکری سے انگڑائی لی تو علی کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

"ویسے اس نے زیادہ ٹائم نہیں لیا اپنی محبت کو ڈھونڈنے میں' ہم تو ساری زندگی دینے کو تیار تھے۔" ساون کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ علی اسے دیکھ کر طمانیت بھرے انداز میں مسکرایا۔

☼ ☼ ☼

بہت عرصے کے بعد "شاہ ولاز" میں زندگی مسکرائی تھی اور وہ بھی بھرپور انداز میں۔ آج ساون اور سارہ کی منگنی کی تقریب تھی۔ ہر طرف ویسی ہی چہل پہل تھی' جیسی ان تقریبات پر ہوتی تھی۔ اس دفعہ سارہ شاہ کا ڈریس لندن کے مشہور ڈیزائنر سے تیار کروایا تھا اور عظمیٰ شاہ کا سارا اطمینان اور غرور واپس آ چکا تھا ورنہ پچھلے ایک دو مہینے ان سب نے بہت اذیت میں گزارے تھے۔

احسان صاحب بہت خوش تھے اور ان کے خوش ہونے کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ ساون اور سارہ کی منگنی کے علاوہ' ساون کا بزنس میں دلچسپی لینا ایک بہت بڑی خوشی تھی اور یہ خوشی انہیں علی کے ذریعے ملی تھی۔ ساون کو صرف علی ہی ہینڈل کر سکتا ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا۔

شایان شاہ بھی بہت خوش تھے۔ پہلی خوشی تو ساون اور سارہ کی منگنی کی تھی اور دوسری خوشی ساون کی بزنس میں دلچسپی پر تھی اور تیسری خوشی ایک غریب شخص کے مفت میں جان سے چلے جانے کے الزام سے بچنے کی تھی ورنہ خواہ مخواہ کا کھڑاگ بھی پڑ سکتا تھا

اس لیے آج وہ پہلی دفعہ اپنے بڑے بھائی کے انتخاب اور فیصلے پر مکمل طور پر ان کے ساتھ تھے کیونکہ اس تیسری خوشی کی وجہ علی تھا۔

عظمیٰ شاہ بھی آج بہت خوش تھیں۔ پہلی خوشی تو وہی تھی جو باقی سب کو تھی' دوسری خوشی بھی وہی تھی جو ساون کے متعلق تھی اور تیسری خوشی اس خبر کی تھی جو انہیں ایک ملازم نے دی تھی کہ علی صاحب بزنس کی ذمہ داریاں ساون کے حوالے کر کے کچھ اور کرنے کا سوچ رہے ہیں یا شاید باہر جانا چاہ رہے ہیں' اس لیے آج ان کے دل میں علی کے لیے کوئی بغض نہیں تھا۔

آج ساون بھی بہت خوش تھا۔ پہلی خوشی تو اپنی محبت کے مل جانے کی تھی' دوسری خوشی اپنی دوست کے مل جانے پر تھی اور تیسری خوشی اس کو اپنے بڑوں کے چہرے پر آنے والی اس خوشی کی وجہ سے تھی جو اس کے بزنس میں آجانے کی وجہ سے آئی تھی اور اس آخری خوشی کی وجہ علی تھا لیکن وہ لاعلم تھا کہ اس کی تینوں خوشیوں کی وجہ علی ہی ہے۔

آج سارہ بھی خوش تھی۔ ساون سے شادی کے فیصلے پر سب خوش ہوگئے تھے علی سمیت اس لیے وہ بھی خوش تھی۔ عامر کے جیل جانے کے بعد اس کی محبت کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اب وہ ساری زندگی علی کو اپنے آس پاس دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے وہ خوش تھی۔ وہ اس لیے بھی خوش تھی کیونکہ اسے نہیں معلوم تھا کہ علی نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

آج علی بھی خوش تھا اور اس کے خوش ہونے کی بہت سی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو سارہ کا ساون سے شادی پر مان جانا تھا اور دوسری وجہ ساون کو اس کی ذمہ داریوں کی طرف کھینچ لانا تھا۔ یہ یقیناً" اس کی بہت بڑی کامیابیاں تھیں اور پھر اسے ایک بیوہ ماں کے غریب لڑکے کی جان بچ جانے کی بھی خوشی تھی۔ وہ آج واقعی بہت خوش تھا کیونکہ آج وہ اپنے باپ کی روح کے سامنے بھی سرخرو ہوگیا تھا' جنہوں نے آخری وقت میں کہا تھا کہ ان لوگوں کو اس سے شکایت نہ ہو۔ آج شاہ ولاز میں موجود لوگوں کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اس نے ہر میدان میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ بزنس سے لے کر نجی معاملات تک۔ لیکن کیا وہ واقعی کامیاب ٹھہرا تھا؟ کیا وہ واقعی خوش تھا....؟

☼ ☼ ☼

آج میں نے اپنی ڈائری کے چند پرانے صفحات پلٹے تو مجھے عجیب سا لگا۔ کبھی کبھی اپنی ہی پرانی ڈائری کھول کر انسان کو اپنے بارے میں نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں یہی میرے ساتھ ہوا ہے اور میں اتنی دیر سے حیران بیٹھا ہوں۔ میں روزانہ ڈائری لکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ کبھی کبھی جب مجھے لگتا ہے کہ میں کسی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو میں وہ ڈائری میں لکھ دیتا ہوں۔ اپنے ابو کے مرنے کے بعد مجھے اس کا بہت سہارا ہے۔ آج بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی سو میں اپنی ڈائری لے کر بیٹھ گیا۔

آج مجھ پر حیرانی کا عالم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جو ساون کا بہت گہرا دوست ہوں۔ اس کے بھائیوں جیسا اور سارہ جس سے دوستی تو ہے لیکن برائے نام' ویسی نہیں جیسی ساون اور سارہ کی ہے تو میری پچھلی ڈائری میں ساون کا اتنا ذکر نہیں ہے' جتنا ہر بات میں سارہ کا ذکر ہے۔ ہے نا حیرت کی بات؟

وہ سارہ جس سے میں کم سے کم بات کرتا ہوں۔ اس کا ذکر میری ڈائری کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں موجود ہے اور وہ ساون جو چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہتا ہے' اس کا ذکر اکا دکا موجود ہے تو کیا میں بے خبری میں سارہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں....؟

ساون' سارہ سے محبت کرتا ہے' یہ بات میں اس وقت سے جانتا ہوں' جب اس بات کا شاید ساون کو خود بھی ادراک نہیں تھا۔ اس کی ہر بات میں سارہ کا ذکر ہوتا ہے' بالکل اسی طرح جس طرح میری ڈائری میں ہر جگہ سارہ کا ذکر ہے۔

12 جون....

نہ جانے کیوں میں سارہ سے کترانے لگا ہوں۔ سارہ جتنا مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے میں اتنا ہی اس سے بھاگنے لگا ہوں اسے بھی تو ہر کام مجھ سے کروانے کی عادت ہوتی جارہی ہے۔ اسکول کے زمانے سے جب میں نے پہلی دفعہ اسے بائیولوجی کی ڈائیگرام بنا کر دی تھی تب سے اس کی فرمائشوں کا رخ ساون سے میری جانب پھر گیا تھا۔ ساون نے یقیناً" اس بات پر شکر کا کلمہ پڑھا تھا اور میں بھی خوش دلی سے اس کے لیے ہر کام کردیتا تھا لیکن کالج آنے تک اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہوچکی ہے کہ اکثر وہ کالج سے پک اینڈ ڈراپ کے لیے بھی میری ہی خدمات حاصل کرتی ہے حالانکہ شایان انکل نے اسے گاڑی دی ہوئی ہے لیکن اسے چین نہیں ملتا۔ مجھ پر دھونس جما کر خوش ہوتی ہے بالکل عظمیٰ آنٹی جیسی ہے۔

23 ستمبر....

آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ میں نے بی بی اے میں ٹاپ کیا ہے۔ سب مجھے مبارک بادیں دے رہے ہیں مگر مجھے ابو بہت یاد آرہے ہیں۔ وہ زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔ بابا میرے لیے بہت اونچا سوچ رہے ہیں۔ وہ مجھے ہارورڈ بھیجنا چاہتے ہیں لیکن میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے کسی بڑے ادارے کی ڈگری نہیں چاہیے۔ میں یہیں رہ کر اپنی صلاحیتیں منواؤں گا۔ کیا علی حسن ہارورڈ کی ڈگری کے بغیر ایک بڑا بزنس مین نہیں بن سکتا؟

12 نومبر....

آج بابا نے میرے ٹاپ کرنے کی خوشی میں ایک پارٹی دی تھی جس میں انہوں نے اپنے تمام بزنس سرکل کی شخصیات کو مجھ سے ملوایا تھا اور آج یہ میرا بزنس سرکل میں پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ بہت سی لڑکیاں مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کررہی تھیں لیکن آج میں سارہ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس نے کسی لڑکی کو میرے قریب نہیں ٹھہرنے دیا تھا۔ جیسے ہی کوئی مجھ سے بات کرتی تو سارہ مجھے کسی اور سے ملوانے لے جاتی۔ اس طرح میں لڑکیوں کی فضول اور بے تکی باتوں سے بچا رہا اور ساون تمام وقت مجھ سے جیلس ہونے کی ایکٹنگ کرکے ہنساتا رہا۔ عظمیٰ آنٹی نے بھی بادل ناخواستہ منہ ٹیڑھا کرکے مجھے مبارک باد دے دی۔ یہ بھی بہت ہے میرے لیے' ورنہ تمام عرصے میں جس ایک بات نے مجھے اس گھر کو مکمل طور پر اپنانے نہیں دیا۔ وہ عظمیٰ آنٹی کا رویہ ہی ہے۔

ساون نے ہمیشہ کی طرح مجھے کتابیں گفٹ کی ہیں اور ہمیشہ کی طرح وہ گفٹ کھولنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اپنی پسندیدہ کتابیں اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ سارہ اور میں اس بات پر ہمیشہ اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ گفٹ کی آڑ میں بابا سے پیسے بٹور کر اپنے بک ریک کی کتابوں میں اضافہ کرتا ہے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ تمہارا کوئی خاص شوق ہی نہیں ہے۔ کیا گفٹ کروں؟ البتہ سارہ نے مجھے بہت خوب صورت گھڑی گفٹ کی ہے۔ مجھے واقعی کسی خاص چیز کا شوق نہیں ہے لیکن خوب صورت گھڑیاں مجھے ہمیشہ انسپائر کرتی ہیں۔ نہ جانے سارہ کو اس بات کا کیسے پتا چلا ہے۔

24 دسمبر....

میں ایم بی اے کی کلاسز لے تو رہا ہوں لیکن مجھے یہ پڑھائی بالکل بچکانہ لگ رہی ہے اس سے زیادہ تو میں ویسے ہی جانتا ہوں مگر پھر بھی بابا کے اصرار پر میں یہ ڈگری لینے پر تیار ہوگیا ہوں۔ کتنے اچھے ہیں بابا اور یہ لوگ' جنہوں نے مجھ سے عام لڑکے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آج بزنس سرکل میں میری جو حیثیت اور جو نام ہے' وہ سب شاہ انڈسٹریز کے مالکان کی بدولت ہے۔ خاص طور پر جب سے میں نے اپنی پہلی خود مختار ڈیل کی ہے تب سے شایان انکل بھی میرے گرویدہ ہوگئے ہیں۔ آج اگر بابا نہ ہوتے تو کیا میں یہ سب کچھ سیکھ پاتا؟ کون جانتا کہ ایک لڑکا ہے علی حسن' جو بہت ذہین ہے اور اس کے اساتذہ اس سے فوراً" متاثر ہوجاتے ہیں۔ بابا اور ساون کی محبت نے مجھے کبھی پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہی نہیں کیا۔ ساون اور بابا کی بے لوث چاہتیں ہی ہیں' جو مجھے کبھی نہ اپنا پرانا گھر یاد آیا ہے اور نہ ہی کوئی رشتہ دار۔

3 جنوری....

آج صبح میں کالج کے لیے نکل رہا تھا تو راستے میں سارہ کی کال آگئی۔ وہ کسی انگلش مووی کا نام لے رہی تھی جو اسے چاہیے تھی۔ اس نے مجھے مووی کا نام "شیکسپیئر ان لو" لکھوایا تھا اور وہ بار بار یاددہانی کرا رہی تھی۔

"آخر ایسا کیا ہے اس مووی میں جو تم اتنی بے چین ہو رہی ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تمہیں نام سے کیا لگ رہا ہے کیا ہوگا اس فلم میں۔" سارہ نے مزے سے پوچھا تو میں سٹپٹا گیا۔

"شیکسپیئر ہوگا اور کیا ہوگا۔" میں نے لہجے میں معصومیت بھرتے ہوئے جواب دیا تو سارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے جواب نہیں تمہارا علی! تمہاری انہی باتوں نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"بس کچھ نہیں پھر کبھی بتاؤں گی۔ فی الحال تو آپ یہ مووی لے آئیے گا یاد سے۔" یہ کہہ کر سارہ نے فون رکھ دیا تھا لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے۔ وہی خطرہ جو مجھے کافی دنوں سے محسوس ہو تو رہا ہے مگر میں محسوس کرنا نہیں چاہ رہا۔

3 فروری۔

آج صبح میں اپنی گاڑی کے پاس پہنچا تو سارہ پہلے سے ہی میری منتظر تھی۔ میرے برے برے منہ بنانے پر بھی اسے کوئی اثر نہ ہوا اور خود ہی فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔

"مووی لانے کا شکریہ۔ ویسے پرنٹ انتہائی خراب تھا۔" سارہ نے مووی ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے کیا مجھے اپنا ذاتی ملازم سمجھ رکھا ہے۔ یہ کام تم اپنے ڈرائیور یا ملازم سے بھی کروا سکتی ہو۔" میں نے غصہ نکالا۔

"ہاں کروا تو سکتی ہوں لیکن پتا نہیں کیوں تم سے کروا کر مزا آتا ہے۔" سارہ نے مزے سے جواب دیا۔

میرا موڈ اس کے ساتھ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ کیوں؟ وجہ مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے۔

14 فروری۔

آج کے دن بہت کچھ ہو گیا۔ آج میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ سارہ کی ملازمہ نے میرے کمرے میں سرخ گلابوں کا ایک بڑا سا بکے اور ایک خوب صورت کارڈ میرے حوالے کیا۔ میں حیران پریشان سا کھڑا تھا اور ملازمہ دونوں چیزیں دے کر یہ جا وہ جا۔ کارڈ پر بڑا سا "ٹو مائی ویلنٹائن" لکھا ہوا تھا۔

گلاب بہت خوب صورت تھے نہ جانے اتنی صبح اس نے کہاں سے لیے تھے۔ بہرحال کارڈ کھولا تو اندر وہ سب کچھ درج تھا جو اتنے دنوں سے سارہ کے چہرے پر تحریر تھا اور جو میں پڑھنا نہیں چاہ رہا تھا لیکن اب اس کارڈ کو مجھے پڑھنا ہی تھا۔ سارہ نے بہت کھل کر اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ مجھے اس سے اس کی تمام بولڈنیس کے باوجود اس بات کی توقع نہیں تھی میں نے جلدی سے بکے دراز میں رکھا اور کارڈ الماری میں چھپا دیا۔

ساون ابھی سو رہا تھا۔ میں سیدھا سارہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں سب لوگ سو رہے تھے لیکن سارہ ڈائننگ ٹیبل پر اکیلی بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ "ہیپی ویلنٹائن ڈے" سارہ نے جوش سے کہا لیکن میرے چہرے کے تاثرات انتہائی سخت تھے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

"یہ حرکت نہیں، محبت ہے اور کیا مجھے یہ بھی تمہیں بتانا پڑے گا کہ آج کا دن محبت کرنے والوں کا دن ہوتا ہے۔" سارہ نے میرے لہجے کی سختی کا کوئی نوٹس لیے بغیر کہا تھا۔

"کیا تم نے ساون کو بھی وش کیا ہے؟" میں نے نہ جانے کیوں یہ سوال پوچھ لیا۔

"نہیں یہ دوستی کا نہیں محبت کا دن ہے۔" سارہ نے بتایا اور میں جو اس کی خبر لینے وہاں گیا تھا۔ چپ چاپ واپس آگیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے سارہ کی محبت منہ زور ہوتی جا رہی ہے میں اس کے آگے بند کیسے باندھوں؟

4 مارچ۔

مجھے سارہ کو روکنا ہوگا ہر حال میں۔ وہ بے وقوف نہیں جانتی کہ اس میں سب کی تباہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں کیا کروں میں جو ہر روز سوچتا ہوں کہ اس کی پیش قدمی کو اپنے رویے کی سختی سے روک دوں گا مگر میں اتنی سختی دکھا نہیں پا رہا۔ کیا میں کمزور پڑ رہا ہوں؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کبھی بھی نہیں۔ مجھے اپنے آپ کو نارمل ہی ظاہر کرنا ہوگا۔ بہت زیادہ سختی سے کچھ الٹ بھی ہو سکتا ہے اور پھر ساون کو بھی شک ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک حل ہے میں سارہ کو ساون کی محبت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن ایسا تو میں ہمیشہ سے کرتا آیا ہوں۔

"اف خدایا میں کیا کروں؟"

17 مارچ۔

آج سارہ کے کالج میں فنکشن تھا اور بابا نے مجھے اسے پک کرنے کے لیے بھیج دیا آج وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ میرے لیے اپنی نظریں ہٹانا ناممکن ہو رہا تھا۔

"میں علی حسن ہوں مضبوط اعصاب کا مالک" اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک میں اپنے آپ کو یہ باور کرا چکا تھا اور اس کا مجھ پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اب میں مکمل کنٹرول میں تھا جب اس نے مجھ سے اپنی تعریف کرنے کو کہا تو میں نے انتہائی سرسری سی نظر ڈالی تھی جس سے اچھی خاصی جل گئی تھی اور پھر ہمارے درمیان ایک دلچسپ مکالمہ شروع ہو گیا تھا۔ میں اس مکالمے کے سہارے اس پر ساون کے جذبات آشکار کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ سارہ کیا سمجھ رہی ہے۔ اس وقت میں نے جو چمک اور رنگ سارہ کے چہرے پر دیکھے تھے ان رنگوں نے میرے اندر عجیب سی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ میں سونے کے لیے لیٹا تو اس کے حسین چہرے پر پھیلی روشنی نے مجھے جگا دیا ہے تب ہی تو میں آدھی رات کو اٹھ کر ڈائری لکھنے بیٹھ گیا ہوں کیونکہ ساون کا نام لینے پر جس تیزی سے وہ روشنی ماند پڑی تھی اس نے میرا سکون اور چین چھین لیا ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی مجھے اس وقت حقیقت بتانے کی؟ اس کے چہرے کے رنگ تو برقرار رہتے۔ "علی حسن! تم اسے اتنی سی خوشی بھی نہ دے سکے؟"

27 اپریل۔

مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ کچھ غلط ہو چکا ہے میرے اندر بہت ہی اندر موجود ہستی اچانک میرے سامنے آگئی ہے۔ وہ ہستی کہ جس کے اپنے اندر موجود ہونے پر میں نے ہمیشہ اپنے دل سے شدید احتجاج کیا تھا۔ آج میرے دل نے ہر احتجاج کو مسترد کرتے ہوئے اس کی شبیہ میری آنکھوں پر چپکا دی ہے۔ تب ہی تو میں نے فنکشن کے بعد سے اب تک کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی کہیں میری چوری نہ پکڑی جائے اور چوری بھی ایسی کہ جس کی کوئی معافی نہیں مل سکتی کتنا روکا تھا میں نے اپنے آپ کو آج کے دن وہاں جانے سے لیکن ساون کو میرے بغیر چین نہیں آتا۔ عجیب شخص ہے۔ جتنا سارہ کے لیے محسوس کرتا ہے اتنا ہی شاید میرے لیے بھی۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھے سارہ سے بھی زیادہ اہمیت دے جاتا ہے اور اگر اسے پتا چل جائے سارہ کے دل کی حالت اور میرے جذبات تو کیا وہ پھر بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرے گا؟

کتنی خوب صورت لگ رہی تھی وہ اور کتنا انتظار تھا اسے میری طرف سے کسی خوب صورت جملے کا۔ مگر میں نے ہمیشہ کی طرح اسے مایوس کر دیا۔ وہاں تک تو میں اپنے اوپر مکمل کنٹرول رکھے ہوئے تھا لیکن مجھے یہ ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ میری بے اختیاری یوں ظاہر ہو جائے گی۔ مجھے ہوش تو تب آیا جب میں نے "SA" والا لاکٹ سارہ کے حوالے کر دیا۔ نہ جانے میرے ہوش کہاں گم تھے جو میں جیولرز کی شاپ پر پڑا یہ خوب صورت لاکٹ اٹھا کر لے آیا۔ ساون اور سارہ ایک ساتھ چونکے تھے اور تب ہی مجھے اپنی حرکت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ میرا دماغ کام کر گیا تھا اور میں نے ایسی وجہ پیش کی کہ میں

خود بھی عش عش کر اٹھا۔ ساون اتنا اچھا اور سادہ ہے کہ اس نے میری تاویل بخوشی مان لی۔ ویسے بھی اسے مجھ پر خود سے زیادہ اعتماد ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا میرے بارے میں' جبکہ سارہ کے چہرے پر آج پھر سے چمک' وہی رنگ ایک جھلک دکھا کر معدوم ہو گئے تھے۔ میں نے دانستہ اس پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں سارہ' ساون کے سامنے کچھ نہ کہہ دے لیکن شکر ہے کہ ابھی تک اس نے اس بات کو صرف ہم دونوں تک محدود رکھا ہوا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آج میرے ہوش ٹھکانے پر نہیں تھے اور جو تھوڑے بہت رہ گئے تھے وہ اس آخری واقعے نے تمام کر دیے۔ سارہ کے ایئررنگز اور بال اس کی شرٹ کے موتیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ اس کی چیخ نے مجھے اور ساون کو بیک وقت متوجہ کیا تھا۔ لیکن میں وہیں جما رہا اور ساون نے فوراً" آگے بڑھ کر اس کے بال سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ ویسے بھی جو بے ساختگی سارہ اور ساون کے رشتے میں ہے۔ وہ میرے اور سارہ کے درمیان نہیں ہے۔ میں وہاں سے اٹھ جانا چاہتا تھا کہ میرا دل اچانک مچلنے لگا۔ وہ ساون کی جگہ مجھے وہاں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں دل کی اس بغاوت پر حیران رہ گیا۔ قدرت کو میرے دل پر رحم آگیا اور ساون کو ملازم بلا کر لے گیا۔ میں نے بہت آہستگی سے ایک ایک بال کو اس کے ایئررنگز اور شرٹ سے نکالا تھا۔ میں یہ کام ذرا جلدی بھی کر سکتا تھا لیکن میرا دل۔

پھر میں واپس آگیا۔ کیونکہ میں اپنے دل کو اس سے زیادہ چھوٹ نہیں دے سکتا تھا۔

یکم مئی۔

آج بابا نے مجھے شاہ انڈسٹریز کا منیجنگ ڈائریکٹر بنا دیا ہے۔ یہ ان لوگوں کی محبت ہے۔ ان کا اعتبار ہے۔ نہ جانے میں اس قابل ہوں بھی یا نہیں۔

مجھے کل ایک مہینے کے لیے کینیڈا جانا ہے۔ کچھ اہم میٹنگز ہیں' جن کے لیے بابا مجھے بھیج رہے ہیں۔ آج کل گھر کی فضا میں کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔

یکم جون۔

میں کل ہی کینیڈا سے واپس آیا ہوں۔ سارہ مجھ سے اصرار کر رہی تھی کہ میں اس کی محبت کو قبول کر لوں۔ اور بابا سے بات کروں مگر ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس گھر کے مکینوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ خصوصا" ساون کو۔ سارہ کو اب تک یہ یقین آگیا ہے کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا اور پھر میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ اگر وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے تو کسی کے سامنے میرا نام نہیں لے گی۔ میں نے صحیح کیا نا؟

12 جون۔

سارہ نے ایک نہیں' دو دھماکے کر دیے ہیں۔ پہلا ساون سے شادی سے انکار اور دوسرا عامر کا نام لے کر۔ پتا نہیں ایسا کیوں کیا' بے چارے عامر کو مفت میں پھنسا دیا ہے۔ ساون بہت اپ سیٹ ہے۔ مجھے ساون کے پاس ہونا چاہیے۔ اسے میری ضرورت ہے۔ لیکن میں اس کے پاس بیٹھنے کی بجائے فیکٹری میں اور زیادہ مصروف ہو گیا ہوں۔ آخر میں کیا کروں؟ کیسے دل جوئی کروں ساون کی؟

19 جون۔۔۔

آج شایان انکل نے مجھے اپنے آفس میں بلوایا تھا۔ وہ عامر سے مل چکے تھے اور اس کے متعلق تمام معلومات بھی حاصل کر چکے تھے۔ وہ عامر کے چیمبر میں آگ لگوا کر اسے مارنے کا پلان بنائے بیٹھے تھے۔ انکل اس حد تک بھی جا سکتے ہیں' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ عامر ایک لالچی لڑکا ضرور ہے' لیکن اس کے جرائم اتنے بڑے نہیں ہیں کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ بھی ایک ایسی بات کے پیچھے جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے انہیں ایک نمبن کیس بنوا کر اسے جیل بھجوانے کی تجویز دی۔ وہ بہت مشکل سے مانے۔ وہ پکا کام کرنا چاہ رہے تھے۔

اور اگر سارہ میرا نام لے دیتی تو کیا آج میرے آفس میں آگ لگ چکی ہوتی۔۔۔؟

26 جون۔

آج میرے فیکٹری سے آنے پر بابا میرے کمرے میں آئے تھے۔ وہ بہت کم کم میرے بیڈ روم میں آتے ہیں۔ اس لیے میں جان گیا تھا کہ انہیں کوئی ضروری بات کرنا ہے۔ آج میرا دل ایک دم سے چاہنے لگا کہ بابا مجھ سے میرے بارے میں بات کریں۔ اور پھر ہمیشہ کی طرح انہوں نے یہ کہہ دیا۔۔۔

"علی! میں جانتا ہوں صرف تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔" یہ جملہ سننے کی مجھے عادت سی ہو گئی ہے۔ یہاں پر ہر کوئی میرے دماغ کی بات کرتا ہے۔ کبھی کسی نے مجھ سے میرے دل کے بارے میں نہیں پوچھا۔ انہوں نے مجھے ساون کو منانے کو کہا اور میں نے بہرحال یہ کام کرنا ہے۔

3 جولائی۔

آج سارہ اور ساون کی منگنی ہے۔ شاہ ولاز کے در و دیوار بھی خوشی سے جھوم رہے ہیں۔ سب بہت خوش ہیں۔ ساون نے اس عرصے میں جس تیزی سے کاروباری اسرار و رموز سیکھے ہیں۔ اس نے سب کو حیران کر دیا ہے۔ سب اس کا کریڈٹ مجھے دے رہے ہیں۔ سارہ نے پچھلے مہینے سے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ ساون سے اب وہ اچھی طرح بات کرتی ہے۔ آج میں سرخرو ہو گیا ہوں۔

میرا پروجیکٹ مکمل ہو چکا ہے۔ اب یہاں میرے کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ مجھے صرف یہاں سے اپنے ٹکٹ کے لیے پیسے درکار ہیں تاکہ باہر جا کر کوئی نوکری تلاش کر سکوں۔ مجھے اب بزنس نہیں کرنا ہے کیا رکھا ہے بزنس میں اور کیا رکھا ہے اس زندگی میں۔

کوئی بات نہیں کہ اگر مجھے اس گھر کے ہر فرد سے محبت ہو گئی ہے یہاں تک کہ عظمیٰ آنٹی سے بھی۔

اور کیا ہوا جو میرا دل ہار گیا ہے۔

کوئی سنے گا تو کیا سوچے گا کہ علی حسن رو رہا ہے۔ وہ علی حسن کہ جس کے فولادی اعصاب ہیں اور جسے دو اور دو چار کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا' وہ رو رہا ہے؟

یہاں سے جا کر کیا میں خوش رہ سکوں گا؟

نہیں۔ مگر مجھے آج کہنے دو' ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا اور شاید دماغ بھی۔

مجھے سارہ شاہ سے محبت ہے۔ آج سے نہیں اس دن سے جب میں نے اس کے لیے پہلی بائیولوجی کی ڈائیگرام بنائی تھی۔ ساون نے بہت خاموشی کے ساتھ سارہ کے کام میرے حوالے کر دیے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سارہ شاہ کو میرے حوالے کر رہا ہے۔

منگنی سے کچھ دیر پہلے ایک ملازمہ سارہ کا لکھا پیغام لے کر آئی تھی۔ لکھا تھا کہ "زندگی صرف وہ نہیں ہوتی جو ہم گزار رہے ہوتے ہیں' زندگی وہ بھی ہوتی ہے جو ہم گزارنا نہیں چاہتے۔"

میں اسے جواباً" کہنا چاہتا ہوں کہ "سارہ! محبت صرف وہ نہیں ہوتی جو ہم کسی سے کرتے ہیں۔ محبت وہ بھی ہوتی ہے جو ہم کسی کو دے نہیں پاتے۔" لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ پایا اور کاغذ کی وہ پرچی پھاڑ دی۔

یہ میں کیا لکھے جا رہا ہوں اپنے جذبات کا تحریری ثبوت۔؟

اگر غلطی سے کسی کی نظر پڑ گئی تو۔ ایسا نہیں ہو گا میں کل ہی اسے سمندر کے حوالے کر آؤں گا۔ اس ڈائری کو۔ اپنی محبت کو اور اپنے دل کو۔ مجھ جیسے لوگ دل ڈیزرو نہیں کرتے' صرف دماغ ہی رہنا چاہیے' ان کے پاس' دل نہیں۔

خدا حافظ میری ڈائری' میری دوست۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی ابھی ساحل سمندر سے لوٹا تھا۔ سامنے ہی ڈائننگ ٹیبل پر ساون اور احسان شاہ بیٹھے تھے۔

"کیا بات ہے علی! تمہاری گاڑی تو گیراج میں کھڑی تھی۔ تم کہاں تھے؟" احسان شاہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا' جبکہ ساون گردن جھکائے اپنی پلیٹ کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ گاڑی میں پیٹرول تھوڑا تھا۔ میں نے سوچا اب کیا ڈلواؤں' ٹیکسی سے ہی چلا جاتا ہوں۔ کچھ ضروری

کام تھا۔" علی نے کسی کی طرف دیکھے بغیر سالن کا ڈونگا اپنے آگے کیا تو احسان شاہ چونک سے گئے۔ ساون نے ابھی بھی کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

"میں امریکہ جا رہا ہوں کل شام کی فلائٹ سے۔" علی نے اچانک کہا۔ ساون کے ہاتھ سے کانٹا پلیٹ میں جا گرا لیکن علی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ احسان شاہ سے مخاطب تھا۔

"لیکن ہمارا تو کوئی کلائنٹ امریکہ سے تعلق نہیں رکھتا؟" احسان صاحب شاید سمجھے نہیں تھے۔

"نہیں۔ میں ویسے ہی جانا چاہ رہا ہوں کچھ عرصے کے لیے۔ اگر صحیح لگا تو شاید وہیں سیٹل ہو جاؤں۔" علی نے کہتے ہوئے ساون کی پلیٹ کی طرف دیکھا جہاں چاول ادھر ادھر کیے جا رہے تھے اور پھر ایک دم ساون جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ علی نے اس کی پشت کی جانب دیکھا اور گہرا سانس لیا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ ساون اٹھ جائے۔

"میں نے اپنے اکاؤنٹ سے ڈیڑھ لاکھ نکلوا کر باقی ساون کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیے ہیں' وہ اصل میں مجھے ٹکٹ اور چند ضروری اخراجات کے لیے چاہیے تھے۔ باقی سب معاملات اور اہم کوڈز وغیرہ میں کل صبح آپ کو اور ساون کو ہینڈ اوور کر دوں گا۔" احسان شاہ کے دل پر گھونسا سا پڑا کیونکہ علی کے لہجے میں اجنبیت تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو علی! کیا میں نے تم سے کبھی حساب مانگا ہے؟ اور صرف ڈیڑھ لاکھ سے تم امریکہ جا کر کیا کرو گے۔"

"میں کوئی جاب وغیرہ ڈھونڈوں گا۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ بزنس تو نہیں' لیکن میں ڈیفنس والا گھر اور کافی کچھ تمہارے نام۔" احسان شاہ کافی دیر تذبذب میں رہے تھے۔ لیکن پھر اچانک ہی جیسے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا مگر علی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کرا دیا۔

"نہیں بابا! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں پہلے ہی یہاں سے کافی کچھ لے چکا ہوں اور کچھ بھی نہیں لوٹا سکا۔ آپ لوگوں کی محبت ہی بہت ہے۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔" علی نے پیار سے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور پھر انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"تم امریکہ جا رہے ہو؟" سارہ ویران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں کچھ ضروری سامان پیک کر رہا تھا۔ جب سارہ شاہ اس کا امتحان لینے آ گئی تھی۔ چار دن پہلے ہی اس کی منگنی ہوئی تھی۔

"ہاں۔" علی نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

"کیوں' اب کیا مسئلہ ہے؟ اب تو میں نے تمہیں تنگ کرنا چھوڑ دیا۔" سارہ کے آنسو اس کے حلق میں اٹک گئے تھے۔

"میں نے ایسا کب کہا ہے؟ مجھے جانا ہی تھا۔ ویسے بھی بزنس اور ایک ہی روٹین نے مجھے بور کر دیا ہے' اب کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔"

علی نے ہنوز اپنی نظریں زمین پر مرکوز رکھیں۔ اس کے ہاتھ پیکنگ میں مصروف تھے۔ وہ چند کپڑے اور اپنے ڈاکومنٹس ہی لے کر جا رہا تھا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" سارہ نے ایک دم اس کے بیگ کو چھینا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"سارہ پلیز! اب تم کسی کی امانت ہو' یوں مت بی ہیو کرو۔ دیکھو! تم سمجھ دار ہو' کسی نے سن لیا تو کیا ہوگا۔" علی نے اس کے ہاتھ سے بیگ چھیننا چاہا لیکن سارہ نے مضبوطی سے اس کا بیگ پکڑ رکھا تھا۔

"نہیں ہوں میں سمجھ دار۔ تم نے کہا' تمہیں مجھ سے محبت نہیں' میں نے مان لیا۔ تم نے کہا' تمہارا نام نہ لوں' میں نے نہیں لیا۔ تم نے کہا ساون سے شادی کر لوں' میں مان گئی۔ اب تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں دیکھنے سے بھی محروم ہو جاؤں؟ یہ میں نہیں مان سکتی۔ تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ پلیز میری محبت کو مزید آزماؤ۔ مت جاؤ یہاں سے۔"

سارہ نیچے کارپٹ پر بیٹھتی چلی گئی۔ بیگ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور علی بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بات تو آج بھی وہی تھی۔ نہ سارہ بدلی تھی اور نہ سارہ کی محبت۔

"اچھا! میں سوچتا ہوں' پلیز تم رو مت اور جاؤ یہاں سے۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔" علی نے رسان سے سمجھایا۔ اسے فی الحال سارہ کو یہاں سے بھیجنے کا یہی حل نظر آیا تھا۔

"کسی نے سن لیا تو' کسی نے دیکھ لیا تو۔ کیا ہمارے درمیان صرف یہی کچھ ہے؟" سارہ شکایت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں! بس تم جاؤ پلیز۔" علی دیوار کی طرف منہ موڑ کر بولا۔ سارہ نے بیگ کی زپ کھول کر سارے کپڑے الٹ دیے اور اس کے ڈاکومنٹس والی فائل نکال کر ساتھ لے لی۔ علی کا منہ ابھی بھی دیوار کی طرف تھا۔ اس لیے وہ دیکھ نہ سکا۔

☼ ☼ ☼

"تم شاید یہ ڈھونڈ رہے ہو۔" علی جو پورے کمرے میں اپنی فائل ڈھونڈ رہا تھا۔ اپنی ڈائری ساون کے ہاتھ میں دیکھ کر سن ہو گیا۔ اس کے پیروں سے زمین نکلی تھی یا چھت زمین سے آ لگی تھی۔ وہ کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" علی نے لہجے کو سرسری بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ اس کی ڈائری کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ تو کب کا اسے سمندر کے حوالے کر کے آیا تھا۔

"یار علی! اب اور نہیں' ایوری تھنگ از اوور ناؤ۔ بہت زیادتی ہو گئی میرے ساتھ' اب اور نہیں۔" ساون نے ڈائری اس کے سامنے بیڈ پر پھینکتے ہوئے لرزتے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں لرزاہٹ کے ساتھ نمی بھی تھی۔ علی کو لگا' وہ مزید کچھ دیر اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔

ساون بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھ گیا اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگا۔ علی اپنی جگہ پر سن کھڑا تھا۔

"چپ نہیں کراؤ گے مجھے؟ کیا سارے رشتے بھی توڑ کر جا رہے ہو؟"

ساون نے علی کو خاموش اپنی جگہ پر جمے دیکھ کر شکایتاً کہا۔ علی نے سر جھکا لیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ لفظوں نے اس کا ساتھ کبھی نہیں دیا تھا لیکن لفظوں نے ایسی دشمنی کر ڈالی تھی کہ وہ ابھی تک اپنی کالی جلد والی ڈائری پر ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔ بالآخر ساون کو ہی اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔

"ہم بہت برے ہیں نا' تب ہی تم ہمیں یوں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ نہیں ہم ہمیں چھوڑ کر نہیں جا رہے تمہارے منہ پر طمانچہ مار کر جانا چاہ رہے ہو۔"

ساون' علی کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ رہا تھا اور علی ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھا۔ یہ ڈائری ساون کے ہاتھ کس وقت لگی۔ اس نے تو کبھی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اس کی ساری ریاضت پر آخری وقت میں پانی پھر گیا تھا۔ نہ جانے وہ کل کیا سمندر کے حوالے کر کے آیا تھا۔

"کچھ تو بولو۔ اب یوں چپ کیوں کھڑے ہو' کیسا سادہ تھا میں جو تمہاری ہر بات کو ایک بھائی اور ایک دوست کی محبت سمجھ بیٹھا۔ میں کب جانتا تھا کہ یہ سب کچھ میرے بابا کی ڈیل کا نتیجہ ہے۔ ہم سے محبت بھی اسی ڈیل میں شامل تھی کیا؟"

ساون خود ہی بولے جا رہا تھا۔ شاید اس کے دل کو سب سے زیادہ ٹھیس پہنچی تھی۔ کیونکہ وہ واحد شخص تھا جو ہر بات سے لاعلم تھا۔

"کیا بات ہے ساون! تم نے بلایا ہے؟" اچانک سارہ کی آواز کمرے میں گونجی تو علی نے چونک کر پہلے سارہ اور پھر ساون کو دیکھا۔

"آؤ سارہ! تمہارا یہاں موجود ہونا بہت ضروری تھا۔ مجھے بہت سے حساب لینے ہیں تم دونوں سے۔" سارہ نے فق چہرے کے ساتھ علی کی طرف دیکھا جو سب کچھ کھلنے کے در پے تھا۔

"تم صحیح کہتی تھیں سارہ! مجھے ہر بات دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ ورنہ اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کوئی بات نہ تھی۔ میں ہی انجان تھا۔" ساون نے ٹوٹے لہجے میں سارہ کو مخاطب کیا۔ "تم دونوں مجھ سے دوستی کا دعوا کرتے رہے ہو' یہ کیسی دوستی تھی۔ اس سے اچھے تو دشمن ہوتے ہیں۔" ساون نے شکوہ بھری نظر دونوں پر ڈالی اور وہ دونوں یوں سر جھکائے کھڑے تھے کہ جیسے ساون سے کبھی نظریں نہیں ملا پائیں گے۔

"ساون! علی بے قصور ہے۔ اس نے تمہیں کبھی دھوکا نہیں دیا۔ یہ تو میں تھی' جس کا سارا قصور ہے' علی نے کبھی تم سے کچھ نہیں چھپایا۔" سارہ نے فوراً علی کی صفائی دینی چاہی۔

"نہیں سارہ! تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اصل قصوروار صرف علی ہے۔ تم نہیں' تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں علی نے ضرور کی ہے۔ اس لیے کہ اس نے صرف اپنا فرض نبھانا تھا اور فرض تو اس نے نبھا دیا مگر محبتیں نہ نبھ سکا۔ دوستی نہ نبھا سکا۔"

ساون' علی کے سامنے کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا مگر علی نے ابھی تک سر نہیں اٹھایا تھا۔ اسے لگا کہ وہ کبھی سر نہیں اٹھا پائے گا۔ وہ کیسے سب کا سامنا کرے گا۔ وہ سرخرو نہیں ہو پایا تھا۔

سفر کے اختتام پر وہ سب سامان لٹا بیٹھا تھا۔ اگر لٹنا تو اسے دونوں صورتوں میں تھا۔ پھر پریشانی کیسی! اور اس آخری خیال نے اس کے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھانے میں مدد دی تھی۔

"ساون پلیز! کسی سے کچھ مت کہنا۔ میں آج شام میں نکل جاؤں گا یہاں سے۔ تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو' ہم اکیلے میں بات کر سکتے ہیں' تم جو سناؤ گے مجھے منظور ہے۔ لیکن سارہ کو بھیج دو۔" علی آہستگی سے ساون کو کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی لیکن ساون نے نظر انداز کر دیا۔ ساون بھرے بھرے انداز میں دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اور تم جو سزا مجھے اور سارہ کو سنا کر جا رہے ہو' وہ کیا کم ہے؟" ساون اب علی کو چھوڑ کر سارہ کے پاس چلا گیا جو دروازے کا سہارا لیے کھڑی تھی۔

"میں جھوٹ کہتا تھا سارہ! کہ میں تمہیں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ اگر جانتا ہوتا تو آج میری جگہ علی ہوتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ تمہیں کیسا گفٹ دینا چاہیے۔ میں کبھی نہیں جان سکا کہ تم کس بات پر خوش ہوتی ہو اور کس بات پر اداس' مگر پھر بھی تم سے محبت کا دعوا کرنے لگا تھا۔ حالانکہ میں تو محبت کر ہی نہیں سکا اور یہ شخص تم سے دور رہ کر بھی تمہیں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ تمہارے مزاج کے ہر موسم سے یہ واقف ہے۔ میں نہیں۔ اور آفرین ہے اس شخص پر کہ یہ ہماری منگنی والے روز مسکرا مسکرا کر ہمیں وش کرتا رہا اور بے وقوف بناتا رہا۔" ساون نے ڈائری بیڈ سے اٹھائی اور سارہ کے حوالے کر دی۔

"محبت صرف وہ نہیں ہوتی' جو ہم کسی سے کرتے ہیں۔ محبت وہ بھی ہوتی ہے جو ہم کسی کو دے نہیں پاتے۔"

"یہ میں نہیں کہتا۔ یہ ڈائری کہتی ہے۔ یہ لو اس پر سب سے زیادہ تمہارا حق ہے۔ اسے پڑھو تاکہ تمہیں پتا چل سکے کہ تم نے جس شخص سے محبت کی ہے۔ وہ تم سے عشق کرتا ہے۔ آج سے نہیں' اس دن سے جس دن میں نے اپنے ہاتھ سے تمہارے کاموں کی ذمہ داری اس کے حوالے کر دی تھی اور میں وعدہ کرتا ہوں سارہ! کہ اس کا انجام عامر جیسا نہیں ہوگا کیونکہ تمہارا یہ علی بھی مجھے اپنے بھائی سے زیادہ اپنا دوست لگتا ہوں۔ بھائی خود غرض ہو سکتا ہے مگر دوست نہیں۔ میں نے تو ایک غیر لڑکے کے لیے بھی جگہ خالی کر دی تھی یہ تو پھر بھی میرا اپنا ہے۔"

ساون کی آواز میں نمی گھلتی جا رہی تھی۔ آخری جملہ کہہ کر اس نے ایک نظر علی پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

سارہ حیرت سے ڈائری کے صفحات پلٹ رہی تھی اور علی کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح صوفے پر ڈھے گیا۔

☆ ☆ ☆

"بابا! آپ اپنے بیٹے کو روکیں گے نہیں؟" ساون نے احسان شاہ کو لاؤنج میں مضطرب بیٹھے دیکھا تو قریب آ گیا۔

"میں اسے کیسے روکوں؟ وہ رکنا ہی نہیں چاہتا۔"

"لیکن آپ نے تو علی کے والد سے وعدہ کیا تھا کہ آپ تا زندگی اس کی سرپرستی کریں گے۔" ساون آج بہت کچھ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"ہاں! اور میں نے اپنا وعدہ پورا بھی کیا ہے۔ اب اگر اس کی یہی مرضی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" احسان شاہ نے دلگیر لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں بزنس کی طرف نہ آتا تو کیا پھر بھی آپ اسے جانے دیتے؟" ساون نے کھوجتی نظروں

سے باپ کو دیکھا۔
"کیا مطلب؟ تمہارے آنے سے ہمیں خوشی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن آج بھی فیکٹری کو علی کی اتنی ہی ضرورت ہے، لیکن میں اسے زبردستی باندھ کر نہیں رکھنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے اس کی مرضی کی زندگی گزارنے دی جائے۔" احسان شاہ کی آواز میں افسردگی تھی اور اس افسردگی نے ساون کے دل پر چھائی دھند کو دھو ڈالا تھا۔

"تو پھر روک کیوں نہیں لیتے اپنے بیٹے کو، میرے بھائی کو۔ بابا! وہ خوشی سے نہیں جارہا۔" ساون نے بابا کے گھٹنوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ چونک گئے اور پھر ساون نے ساری بات ان کے گوش گزار کردی۔

☆ ☆ ☆

آج پھر شاہ ولا زرق برق قمقموں اور تازہ پھولوں سے سجایا گیا ہے۔ ہر طرف رونق ہی رونق ہے کیونکہ آج سارہ شاہ اور علی حسن کی شادی ہے۔ وہ دونوں ساتھ کھڑے بہت خوب صورت لگ رہے ہیں اور بہت خوش بھی۔ انہیں شادی کے فوراً بعد امریکہ جانا ہے، جہاں پر علی کچھ عرصے کے لیے جاب کرنا چاہتا ہے۔ یہ خواہش صرف علی کی نہیں بلکہ سارہ کی بھی ہے۔ وہ اسے لانگ ہنی مون ٹرپ کا نام دے رہی ہے۔ ساون نے شاہ انڈسٹریز کو خوش اسلوبی سے سنبھال لیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اب شاہ انڈسٹریز علی کے بغیر تو چل سکتی ہے، لیکن ساون شاہ کے بغیر نہیں۔

آج احسان شاہ بہت خوش ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے انہیں مل گئے ہیں۔ وہ جو ساری زندگی علی کی حیثیت کے متعلق تذبذب کا شکار رہے تھے، ان کے ایک بیٹے نے دوسرے بیٹے کو اس کا مقام دلوا دیا ہے۔ آج وہ کسی تذبذب کا شکار نہیں ہیں۔

آج شایان شاہ اور عظمیٰ شاہ بھی حیرت انگیز طور پر خوش ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ بیٹی کے چہرے پر سارے جہان کی خوشیاں دیکھ کر ماں، باپ خوش نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا۔ ویسے بھی علی سے دونوں ذہنی طور پر اتنے متاثر ہیں کہ عامر کے مقابلے میں یہ داماد انہیں خوشی سے قبول ہے۔

آج ساون بھی بہت خوش ہے۔ کیونکہ اگر بروقت علی کے ساحل سمندر پر جانے سے پہلے اس کے کمرے میں نہ جاتا اور میز پر پڑے اس کالے بیگ کو اپنی عادت کے خلاف نہ کھولتا تو سب کچھ غلط ہو جاتا۔ اس بیگ میں صرف ڈائری نہیں تھی۔ سارہ کی بھی ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں، جو ساون نے دیکھتے ہی پہچان لی تھیں۔

اس نے اپنی تمام کتابیں لائبریری میں رکھ دی ہیں۔ اب وہ انسانوں کو پڑھنے کا ہنر سیکھ رہا ہے۔ فیکٹری کے معاملات کے علاوہ چند ایسے کام بھی اس کے سپرد کیے گئے ہیں جن سے علی کی اچھائیوں کا صحیح معنوں میں اسے اندازہ ہوا ہے۔ مثلاً "عامر" کے گھر ماہانہ خرچ بھجوانے کے علاوہ اس کے کیس کی پیروی کر کے اس کو رہائی دلانا۔

اس لیے اس کے خیال میں علی کی آنکھوں کی چمک اس کے اندر کی اچھائیوں کی وجہ سے ہے۔

آج سارہ بھی بہت خوش ہے۔ اس نے اپنی محبت پالی ہے اور اس محبت کی چمک اسے علی کی آنکھوں میں نظر آرہی ہے۔ آج اسے کسی جذبے کو کھوجنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آج علی بھی خوش ہے اور آج وہ واقعی بہت خوش ہے۔ لیکن آج ان سب کی خوشیوں کی وجہ علی سے زیادہ ساون ہے۔

ناولٹ

مہوش افتخار

تیری دسترس میں درماں

اجیہ اپنی والدہ بازغہ اور سوتیلے باپ خلیل کے ساتھ پاکستان سے باہر رہتی ہے۔ اس کے والدین کی علیحدگی ہو گئی تھی
جس کے بعد اس کی والدہ بازغہ نے خلیل سے دوسری شادی کی اور اجیہ کو اپنے ساتھ جرمنی لے گئی تھی۔ اجیہ کا رشتہ بچپن
ہی سے اس کے سگے چچازاد زوار سے طے ہے۔ مگر وہ اپنے ددھیال والوں سے خائف ہے۔ کیونکہ بازغہ نے ان کے
ستم کی داستانیں سنا کے اجیہ کو ان سے متنفر کیا ہوا تھا۔ اجیہ نے پاکستان آکر اپنے ددھیال والوں پر جائیداد کا مقدمہ کر دیا۔
اجیہ نے اپنے دادا سے بدتمیزی بھی کی۔ زوار کو یہ پتا چلا تو اسے بے حد غصہ آیا۔

اجیہ کو پاکستان میں مقیم اپنا ماموں زاد دانش پسند آ گیا۔ دونوں کی رضامندی سے ان کی منگنی طے ہو گئی۔
منگنی کی تقریب کے دوران اچانک زوار وہاں پہنچا اور دعوا کیا کہ اجیہ اور وہ نکاح کر چکے ہیں۔ اجیہ نے اس سے انکار
کیا۔ مگر کسی نے بھی اس کی بات کا یقین نہ کیا۔ کیونکہ زوار کے پاس نکاح نامہ بھی موجود تھا۔ اجیہ کے ماموں نسیم
نے اجیہ کے احتجاج کے باوجود اجیہ کو زوار کے حوالے کر دیا۔

اپنے ساتھ لا کر زوار نے اجیہ سے زبردستی نکاح کر لیا اور اس پر دباؤ ڈال کر اسے کیس واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے
بعد زوار علی اجیہ کو اپنے گھر لے آیا اور گھر والوں کو بتا دیا کہ اس نے اجیہ سے نکاح کر لیا ہے۔

۲

دوسری اور آخری قسط

"مبارک ہو بھئی۔ حسین اس نالائق کو اپنی فرزندی میں لینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔" داؤد صاحب' اماں جان کو لیے مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو اس اطلاع پہ سب ہی کے چہرے کھل اٹھے۔ بہروز حسن اور جبین اٹھ کر بابا جان اور اماں جان کے گلے لگ کر انہیں مبارک باد دینے لگے۔ جبکہ دونوں چھوٹے بہن بھائی' ممتاز اور شہباز' نجیب حسن کے سر ہو گئے تھے۔

"ہاں بھئی برخوردار! مبارک ہو تمہیں!" داؤد صاحب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو جھینپے جھینپے سے نجیب حسن اٹھ کر پہلے باپ اور پھر ماں کے گلے لگ گئے۔

"میں جا کر ذرا عالی کو فون کرتی ہوں۔" جبین سب کا منہ میٹھا کروانے کے بعد پرجوش سی اندر کی جانب بڑھیں تو اماں جان کے لبوں پہ بے اختیار دعا آ ٹھہری۔

"اللہ بازغہ کو بھی جبین کی طرح ہمارے اور ہمارے بچے کے حق میں بہت اچھا کرے۔" جبین کی پشت سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے انہوں نے داؤد صاحب کی جانب دیکھا۔

"کیوں نہیں بھئی۔ اللہ نے چاہا تو وہ بھی ایسی ہی ہو جائے گی۔ آخر کو اپنی بچی ہے۔" داؤد حسن مسکراتے ہوئے بولے تو ممتاز ایک نظر بھائی کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے ہنسی۔

"بچی تو اپنی ہے۔ لیکن خاصی طرح دار بچی ہے۔ سارے کس بل نکل جائیں گے بھائی کے۔"

"خدا نہ کرے اور میرے بچے کے کون سے کس بل ہیں۔ اتنا سیدھا تو ہے میرا بیٹا۔" اماں جان نے اسے گھورتے ہوئے جھٹ پاس بیٹھے نجیب کا سر اپنے شانے سے لگایا تو تینوں بہن بھائیوں کا قہقہہ گونج اٹھا۔

"جی۔ جی۔ بالکل جلیبی کی طرح۔ تب ہی تو میاں سادے نے چپکے چپکے لڑکی بھی پسند کر لی اور کسی کو بتایا تک نہیں۔" بہروز حسن نے ہنستے ہوئے بھائی اور ماں کی طرف دیکھا۔

"چپکے چپکے کیسے بھائی! بچپن سے تو دیکھی ہوئی ہے۔ بس اماں اور بابا کو بتا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔" نجیب اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔ تب ہی جبین کی کمرے میں دوبارہ واپسی ہوئی تو بہروز حسن نے قصداً" اک ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں بھئی خوش قسمت ہو۔ ہمیں تو صرف مطلع کر دیا گیا تھا کہ تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ دل بے چارے پہ کیا گزری۔ کسی نے پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔"

"تو اب پوچھ لیتے ہیں۔" جبین مسکراتے ہوئے ساس کے پہلو میں جا بیٹھیں۔

"دیکھ لیں اماں! خود ہی اجازت دے رہی ہیں۔" انہوں نے شرارت سے ایک نظر بیوی پہ ڈالتے ہوئے اماں جان کی طرف دیکھا۔

"ہاں بچے! جیسے اسی بے چاری کی تو اجازت درکار ہے تمہیں۔ پہلی' ماں باپ کے کہنے پہ اور دوسری' بیوی کے کہنے پہ' اٹھنے ہی تو سیدھے ہو تم۔" انہوں نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بیٹے کو کہا تو کمرا ایک بار پھر قہقہوں سے گونج اٹھا جبکہ بہروز حسن جھینپی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگے۔

"حد ہے اماں! آپ میری ماں ہیں کہ ان کی؟"

"جو حق پہ ہو گا اس کی۔ جب میری بہو نے ہماری عزت اور خدمت میں کوئی کمی نہیں کی' تو میں بھلا اس کے ساتھ زیادتی کروں۔" انہوں نے شفیق لہجے میں کہا تو جبین نے مسکراتے ہوئے ان کے شانے پہ سر رکھ دیا۔

"نہیں اماں! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے کبھی یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ یہ میری سسرال ہے۔" انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا تو ممتاز ہنس پڑی۔

"دعا کریں کہ آنے والوں کو بھی یہ محسوس ہو سکے۔"

"جب مجھے غیر ہو کے محسوس ہو سکتا ہے تو وہ تو یہاں بچپن سے آ رہی ہے۔"

"تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔ پتا نہیں اس تک چڑھی کو حسنہ میں بھائی کو نظر کیا آیا ہے۔" ممتاز نے شرارت سے کہتے ہوئے نجیب کی طرف دیکھا۔ جو بہن کی بات مصنوعی خفگی سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

"ایسے نہیں کہتے نازی! بازغہ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے ذرا زیادہ لاڈلی ہے اور کوئی بات نہیں' لیکن شادی کے بعد سب ہی لڑکیاں حساس اور ذمے دار ہو جاتی ہیں۔" اماں جان کے رسان سے کہنے پر ممتاز کی شوخ نظریں ایک بار پھر نجیب کی جانب اٹھ گئیں۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ نہیں تو نجیب بھائی گئے کام سے۔"

"کوئی بات نہیں یار! پھر دونوں بھائی مل کے دوسری کر لیں گے۔" بہروز حسن اچانک بولے تو سب بے اختیار ہنس پڑے۔

"سب کو اپنی پڑی ہے اور اندھے کو لاٹھی کی پڑی ہے۔" داؤد صاحب نے ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا تو محفل کشت زعفران بن گئی۔

☆ ☆ ☆

"نو رگاڈ سیک امی! آپ لوگ داؤد انکل کو جواب دینے سے پہلے ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیتے۔" داؤد حسن اور فریدہ بیگم کے جاتے ہی بازغہ منہ سجائے ماں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا پوچھ لیتے بیٹا! وہ کوئی انجان تو نہیں ہیں۔ تمہارے پاپا کے بچپن کے دوست ہیں۔ نجیب بھی ہمارا دیکھا بھالا بچہ ہے۔ ماشاء اللہ لاکھوں کا کاروبار ہے ان کا۔ عزت' شرافت' روپیہ پیسہ۔ کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ تمہیں اور کیا چاہیے۔" انہوں نے بیٹی کی جانب دیکھا۔

"مجھے نجیب اچھا نہیں لگتا۔ وہ بالکل بھی ہینڈسم نہیں۔" وہ غصے سے بولی تو طلعت کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بے وقوف لڑکی! مردوں کی شکل صورت کب دیکھی جاتی ہے۔ ان کی تو تعلیم' قابلیت' کردار اور خاندان دیکھا جاتا ہے۔"

"پلیز امی! آپ کس دور کی باتیں کر رہی ہیں؟" جھلا کے کہتی وہ ماں کے سامنے بیٹھ گئی۔

"اسی دور کی باتیں کر رہی ہوں میری جان! ویسے بھی جو مرد عام شکل صورت کے ہوتے ہیں انہیں اگر خوب صورت بیوی مل جائے تو وہ اس کے پیر دھو دھو کے پیتے ہیں' پھر وہ تمہیں پسند بھی بہت کرتا ہے اور تم نے وہ بات تو سنی ہو گی' جو پیا من بھائے وہی سہاگن۔ تم دیکھنا' اللہ نے چاہا تو وہ تمہیں پھولوں کی طرح رکھے گا۔" انہوں نے پیار سے بیٹی کا چہرہ چھوا تو متذبذب سی بازغہ خاموش ہو گئی اور طلعت جو اس کی عادت سے واقف تھیں۔ اسے یوں چپ ہوتا دیکھ کے مطمئن ہو گئیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ ان کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

تین ماہ کا مختصر عرصہ لگا تھا اور بازغہ' نجیب کے سنگ رخصت ہو کے "حسن ولا" چلی آئی تھی۔ جہاں آنے والے وقت میں طلعت بیگم کی کہی بات حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تھی۔

نجیب اسے پسند نہیں بلکہ دیوانگی کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ اس کی زبان سے نکلی ہر فرمائش پوری کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پہ وہ پہروں پریشان رہتے تھے۔ ان کی اسی درجہ محبتیں بازغہ کو مغرور کیے دیتی تھیں۔ اس کے مزاج کی نازکی' طبیعت کی اتراہٹ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی اور فریدہ بیگم جو یہ سوچے ہوئے تھیں کہ وہ آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن اپنی ذمے داریاں نبھانا سیکھ لے گی۔ پریشان سی اس کے طور طریقے دیکھتی رہتی تھیں۔

بیٹے کے بیوی کے حد سے زیادہ چاؤ چونچلے بھی انہیں اندر ہی اندر کھولائے دیتے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ حد سے بڑھی محبت بھی زندگی کے توازن کو بگاڑ دیتی ہے' خاص کر تب جب ایک فریق صرف دینے پہ اور دوسرا صرف لینے پہ تلا ہو۔

انہوں نے ڈھکے چھپے اور پھر ایک آدھ بار واضح الفاظ میں دونوں کو ہی ان کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی مگر دونوں نے ان کی بات پہ کان دھرنے کے بجائے اپنی من مانی جاری رکھی تھی اور وہ صرف گھر کے ماحول کی خاطر خاموشی اختیار کرنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔ تب ہی اللہ نے ان دونوں کو صاحب اولاد کر دیا تھا۔

اجیہ کی پیدائش پہ دل کھول کے خوشی منائی گئی تھی۔ بہروز حسن کے دو بیٹوں کے بعد وہ گھر میں آنے والی پہلی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش پہ داؤد صاحب اور فریدہ بیگم سمیت سب ہی نے دل ہی دل میں سکھ کا سانس لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب بازغہ اور نجیب دونوں کے مزاج میں ذمہ داری اور سوچ میں پختگی در آئے گی۔

مگر انہیں اس وقت شدید مایوسی ہوئی تھی' جب بازغہ کی فرمائش پہ نجیب حسن نے بچی کے لیے گورنس کا انتظام کروا دیا تھا۔ اس دن سوا سال میں پہلی بار داؤد حسن بیٹے اور بہو پہ خوب برسے تھے۔ انہوں نے نہ صرف گورنس کو نکال باہر کیا تھا بلکہ بازغہ کو بھی بحیثیت ایک بہو اور ایک ماں کے' اس کی ذمہ داریوں پر سیر حاصل لیکچر دیا تھا۔

اس عزت افزائی کے بعد فریدہ بیگم اور جبین کو لگا تھا کہ بازغہ کو عقل آجائے گی۔ مگر اس کے تیور تو پہلے سے زیادہ بگڑ گئے تھے۔ نجیب الگ سب سے کھنچ گئے تھے۔ اجیہ پورا پورا دن دادی پھوپھی اور تائی کے پاس رہنے لگی تھی۔ کیونکہ بازغہ نے اسے سنبھالنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

بہو اور بیٹے کو اپنی اولاد سے بے نیاز دیکھتے ہوئے' داؤد صاحب نے بہروز حسن کی خواہش پہ ننھی اجیہ کو چھ سالہ زوار سے منسوب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کے اس اعلان پہ بازغہ نے گھر میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ مگر اس بار خلاف توقع سب کے ساتھ ساتھ نجیب حسن نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے نہ تو بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور نہ ہی گھر والوں سے کوئی سوال کیا تھا۔ یعنی اجیہ کے لیے انہیں یہ فیصلہ صحیح لگا تھا۔ تب ہی تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کی اس خاموشی پہ سوائے ایک جبین کے سب ہی نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ ان کے دل میں بازغہ کے رویے سے ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔ مگر چونکہ فیصلہ ان کے شوہر اور داؤد صاحب کا تھا' اس لیے وہ خاموشی اختیار کرنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔

وقت چند ماہ آگے بڑھا تھا۔ تب ہی ممتاز کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا تھا۔ داؤد صاحب اور بہروز حسن کے ساتھ ساتھ نجیب حسن نے بھی اس معاملے میں اپنی ذمہ داری خوب نبھائی تھی۔ لڑکا سب ہی کو بے حد پسند آیا تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہیں مثبت جواب دے دیا گیا تھا۔

گھر میں اچانک منگنی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ فریدہ بیگم نے خاص طور پر بازغہ کو کام میں ہاتھ بٹانے کی ہدایت کی تھی۔ مگر اس کی بد مزاجی تو اس ہنگامے کے بعد سے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ پھر ایک مرتبہ اس کی زبان سے صبح شام اپنے گھر والوں کی شان میں قصیدے سن سن کے بالآخر نجیب حسن نے انہیں ٹوک دیا تھا۔ اس کے بعد تو کمرے میں بازغہ نے وہ قیامت اٹھائی تھی کہ بے چارے نجیب حسن کے طوطے اڑ گئے تھے۔ وہ اپنی صفائی دیتے رہ گئے تھے اور بازغہ بچی پھینک پھانک ماں کے گھر جا بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کہاں جھونک دیا ہے آپ لوگوں نے مجھے۔ اتنا ماں باپ کا غلام شخص میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔" وہ چسکوں پھسکوں رونے میں مصروف تھی اور طلعت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی لاڈلی کو کیسے چپ کروائیں۔

"اچھا چپ تو کرو۔ میں نجیب کو ابھی فون کر کے پوچھتی ہوں۔" انہوں نے اس کا بازو سہلاتے ہوئے کہا تو بازغہ نے غصے سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ میں اس شخص کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن اجیہ کو تو اپنے ساتھ لے آتیں۔" "نہیں چھ ماہ کی نواسی کی فکر لاحق ہوئی تھی۔

"کیوں؟ ذرا باپ بھی تو سنبھالے۔ بڑے کان بھرے گئے ہیں نا کہ میں کچھ نہیں کرتی۔ اب بیٹھ کے پالے بچی۔" آنسو صاف کرتی زہر خندی بولی تو طلعت نے تشویش سے اس کی جانب دیکھا۔

"اور وہ جو آٹھ دن بعد فنکشن ہے؟"

"بھاڑ میں گیا فنکشن۔ میرا تو اس ممتاز کی شکل دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ صورت دیکھی ہے آپ نے اس کی۔" اس نے تنفر سے کہتے ہوئے ماں کی جانب دیکھا۔ "اور اگر وہ لڑکا اور اس کا گھر بار دیکھیں نا تو انگلیاں منہ میں دبا لیں۔ ہائے گاڈ! اتنا ہینڈسم آدمی اور اتنا خوب صورت گھر میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔" اس نے اپنے سلگنے کی اصل وجہ بیان کی تو طلعت اک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

"کیا کہہ سکتے ہیں' اپنا اپنا نصیب ہے۔"

"ہاں یہ اچھا ہے۔ اپنی غلطیوں کو نصیب کے کھاتے میں ڈال کے بری الذمہ ہو جاؤ۔" اس نے جل کے منہ پھیر لیا تو طلعت اپنی پیشانی مسلنے لگیں۔

"اچھا اب یہ رونا دھونا بند کرو اور جا کے منہ ہاتھ دھو۔ تھوڑی دیر میں نزہت آنے والی ہے۔" انہوں نے اپنی بہن کا حوالہ دیا تو بازغہ کے ابرو تن گئے۔

"میں نہیں ان سے ملوں گی۔ ہر بات کی ٹوہ لینے لگ جاتی ہیں۔"

"تو پھر اپنے کمرے میں جاؤ۔" طلعت خفگی سے بولیں۔

"نہیں! میں فریش ہو کے شاپنگ پہ جاؤں گی۔ دم گھٹ رہا ہے میرا۔" وہ اچانک سیدھی ہوتے ہوئے بولی تو طلعت تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"لیکن گاڑی نہیں ہے گھر پہ۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔" وہ بے نیازی سے کہتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو طلعت بے اختیار سر پکڑ کے رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھلے شاپنگ بیگز سے لدی پھندی بازغہ سڑک کے کنارے کھڑی متلاشی نظروں سے خالی ٹیکسی ڈھونڈ رہی تھی۔ جب پاس سے گزرتی ایک گاڑی نے تھوڑی دور جا کے بریک لگائے۔ اگلے ہی لمحے گاڑی ریورس ہو کے بازغہ کے سامنے آٹھہری تو اپنے دھیان میں کھڑی بازغہ نے چونک کر ایک نظر گاڑی پہ اور دوسری ڈرائیونگ سیٹ پہ ڈالی تھی اور ایک پل کے لیے حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔

"السلام علیکم! آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔" ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص نے سر ترچھا کرتے ہوئے مسکرا کر بازغہ کی جانب دیکھا تو وہ چہرے پہ اڑتی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑستی گاڑی کے قریب چلی آئی۔

"بہت شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پلیز بازغہ! تکلف مت کریں۔ آئیے بیٹھیں۔" اس نے آگے جھکتے ہوئے اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ دل ہی دل میں اس کے طرز تخاطب پہ حیران ہوتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"کمال ہے۔ آپ نے مجھے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔" رسمی حال احوال کے بعد اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تو اس کے برابر بیٹھے شخص کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"آپ کوئی بھولنے والی چیز ہیں بھلا۔" اک گہری نظر اس پہ ڈالتا وہ گمبھیر لہجے میں بولا تو بازغہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کو تحیر در آیا۔ لیکن اگلے ہی پل اس کے چہرے اور آنکھوں میں ازلی غرور آٹھہرا تھا۔

"تھینکس فار دی کامپلیمنٹ۔" وہ اعتماد سے مسکرائی تو مقابل کی مسکراہٹ بھی گہری ہو گئی۔

"مائی پلیژر۔ ویسے آپ اس وقت اکیلی کیوں نکلی تھیں؟ آپ کے شوہر نامدار کہاں ہیں؟"

"شوہر نامدار کو اپنے کاموں سے فرصت ملے تو وہ بیوی پہ توجہ دیں نا۔" وہ بنا کسی لگی لپٹی کے تلخی سے

گویا ہوئی تو وہ سرہلاتے ہوئے بولا۔
"ہاں ہوتے ہیں کچھ ناقدرے لوگ۔ جنہیں خدا فیاضی سے نواز دیتا ہے۔ مگر وہ پھر بھی اس کے عطا کردہ بیش بہا خزانے کی قدر نہیں کرتے۔" اور بازغہ کا دل اس درجہ واضح تعریف پہ بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔

"آپ یہاں سے رائٹ لے لیں۔ میں اپنی امی کے گھر ٹھہری ہوئی ہوں۔" کچھ دور جا کے بازغہ نے اسے گائیڈ کیا تو اس نے گاڑی مطلوبہ سمت میں موڑ لی۔

"یہاں پہ ایک بہت اچھی کافی شاپ ہے۔ کیا خیال ہے ایک کپ کافی کا ہو جائے۔" اس نے نرمی سے کہا تو وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

"میرے خیال میں رہنے دیں۔ ابھی دیر ہو جائے گی۔"

"اتنا ٹائم نہیں لگے گا۔ ویسے بھی پھر کبھی یہ موقع آئے یا نہ آئے کون جانتا ہے۔" اس نے اپنے ساتھ بیٹھی بازغہ کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں پل بھر کو ٹکرائی تھیں اور بازغہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

لیکن آنے والے پانچ چھ دنوں میں "یہ موقع" تین چار بار آیا تھا اور وہ بھی کچھ اس طرح سے کہ طلعت بیگم کو بھی اس بات کا علم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ جا رہی ہے اور ساتویں دن جب وہ نجیب حسن کی بے شمار منتوں اور پھیروں کے بعد ان کے ساتھ "حسن ولا" واپس پہنچی تھی' اس کا دل ایک نئی لے پہ دھڑک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ممتاز کی منگنی بڑی دھوم دھام اور خوش اسلوبی سے اپنے انجام کو پہنچی تھی۔ بازغہ نے بھی خلاف توقع بڑے اچھے موڈ سے فنکشن میں شرکت کی تھی۔ اس کا رویہ سب کے ساتھ خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ جس پہ سب گھر والے پہلے حیران اور پھر خاموش ہو گئے تھے۔ مزاج دار سو کے ان بدلتے تیوروں پہ وہ بے چارے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

منگنی اور شادی کے دوران چونکہ صرف دو ... وقت تھا اس لیے گھر میں بنا کسی توقف کے شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ حیران کن طور پہ بازغہ نے بہت سی ذمہ داریاں ازخود اپنے سر لے کے سب کو چونکا دیا تھا۔ اسے چونکہ ڈرائیونگ آتی تھی۔ اس لیے اس نے زیادہ تر شاپنگ وغیرہ اور باہر کے چکر اپنے ذمے لیے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ان کاموں کی آڑ میں وہ کچھ اور ہی مقصد پورا کر رہی تھی۔

دن بہت تیزی سے گزر رہے تھے۔ جب ایک شام جبین کی چچی کی اچانک فوتگی کی خبر پہ سب گھر والوں کو بہروز حسن کے چچا سسر کے ہاں بھاگنا پڑا تھا۔ ممتاز کی چونکہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور گھر پہ بھی لاکھوں کا سامان پڑا تھا اس لیے بازغہ اور ممتاز دونوں ہی گھر پہ رک گئی تھیں۔

چائے کے بعد ممتاز دوا لے کے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی تو بازغہ لاؤنج میں آبیٹھی۔ آج پروگرام کے مطابق ملنے کے لیے نہیں جا سکی تھی۔ اس لیے کچھ سوچتے ہوئے اس نے فون اٹھا کر نمبر ملایا تھا۔ مگر دوسری طرف سے عورت کی آواز سن کے اس نے بنا کچھ کہے لائن کاٹ دی تھی۔

تیسری مرتبہ ٹرائی کرنے پہ اسے مطلوبہ آواز سنائی دی تو اس نے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

"آج کیوں نہیں آئیں تم؟ پتا ہے میں نے پورے دو گھنٹے تمہارا انتظار کیا تھا۔" دوسری طرف وہ اس کی آواز سنتے ہی دبی آواز میں خفگی سے بولا تو بازغہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"کیا بتاؤں۔ یہاں نیا ڈراما جو شروع ہو گیا تھا۔" اس کے بعد اس نے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کروائی تو وہ دھیرے سے ہنسا۔

"اس کا مطلب ہے تم گھر پہ اکیلی ہو۔"

"اکیلی کہاں۔ ممتاز اوپر سو رہی ہے۔" وہ اس کا مطلب سمجھے بنا بے زاری سے بولی۔

"اپنے کمرے میں ہے نا۔ ہم تو تمہارے کمرے

میں ہوں گے۔" وہ مزے سے بولا تو پھر وہ چونک گئی۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟"

"ہاں ہو گیا ہے۔ تم چوکیدار کو ادھر ادھر کرو۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" وہ دھیمے لیکن قطعی لہجے میں بولا تو بازغہ کا رنگ اڑ گیا۔

"خدا کا واسطہ ہے یہ غضب مت..." اس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ کچھ سوچتی ہوئی گیٹ کی جانب بھاگی تھی۔

☼ ☼ ☼
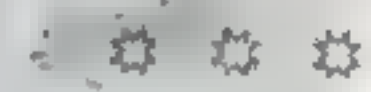
"بیٹا! بچیاں گھر میں اکیلی ہیں۔ تم ایک چکر وہاں کا لگاتے ہوئے ادھر آنا۔" فریدہ بیگم نے آفس میں فون کر کے نجیب حسن کو تاکید کی تھی۔ اسی لیے وہ آفس سے بہروز حسن کے چچا سسر کی طرف جانے کے بجائے پہلے گھر کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بچپن کے دوست بھی تھے۔ جنہیں انہوں نے راستے میں ڈراپ کرنا تھا۔ تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے وہ گھر پہنچے تھے۔

غفار کو گاڑی میں ہی انتظار کرنے کا کہہ کے وہ خود تیز قدموں سے گیٹ کی جانب گئے تھے۔ گیٹ پہ چونکہ چوکیدار ہوتا تھا' اسی لیے گیٹ میں موجود آنے جانے والا چھوٹا دروازہ اندر سے لاک نہیں ہوتا تھا۔ اسی اعتماد سے انہوں نے اپنے دھیان میں دروازے کو کھولنے کی غرض سے اندر کو دھکیلا تھا۔ لیکن دروازہ اندر سے بند پا کے وہ بے اختیار حیران ہوئے تھے۔

ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی سے دروازہ بجاتے ہوئے انہوں نے چوکیدار کا نام پکارا تھا۔ ان کے یوں چوکیدار کو پکارنے پہ غفار بھی گاڑی کا دروازہ کھول کے باہر نکل آئے تھے۔ مگر جب دو تین بار دروازہ بجانے اور چوکیدار کو پکارنے پہ بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ تب دونوں ٹھٹک گئے تھے۔ پریشانی سے نجیب نے تیزی سے بیل بجانی چاہی۔ لیکن غفار نے انہیں سرعت سے روک دیا۔

"بیل مت بجانا نجیب! مجھے کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔ خدانخواستہ کہیں کوئی ڈاکا..." انہوں نے قصداً بات ادھوری چھوڑتے ہوئے ان کی جانب دیکھا۔

"یااللہ خیر!" نجیب حسن کا رنگ لمحے بھر میں اڑ گیا تھا۔ "اب... اب کیا کریں؟" انہوں نے پریشانی سے غفار کی جانب دیکھا۔

"میرے خیال میں پچھلی طرف سے دیوار کود کے اندر جاتے ہیں تاکہ اگر خدانخواستہ اندر کوئی موجود ہو تو ہم کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہو سکیں۔" ان کے مشورے پہ نجیب حسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فوری طور پر قدم آگے بڑھائے تھے۔

گھر کی پچھلی طرف پہنچ کے دونوں نے نہایت خاموشی اور ہوشیاری سے دیوار پھلانگی تھی اور پھر اسی خاموشی سے چلتے ہوئے کچن کے عقبی دروازے سے گھر کے رہائشی حصے میں داخل ہو گئے تھے۔

دبے قدموں سے انہوں نے ایک کے بعد ایک نیچے کے سارے کمرے کھنگال لیے پھر اوپر کی جانب چلے آئے۔ شام کے اس پہر پورا گھر سناٹے میں ڈوبا دیکھ کر نجیب حسن کی پریشانی دوچند ہو گئی تھی۔

پہلے دو کمروں کا جائزہ لینے کے بعد نجیب اپنے کمرے کی جانب بڑھے تھے۔ بنا کوئی آواز پیدا کیے انہوں نے دروازہ کھولنا چاہا تھا۔ لیکن اندر سے دروازہ بند پا کے انہوں نے تیزی سے پلٹ کر غفار کی جانب دیکھا تھا۔ تب ہی انہیں اندر سے کسی مرد کی دبی دبی سی آواز کے بعد بازغہ کی دھیمی سی ہنسی سنائی دی تھی اور ان کا پورا جسم جیسے کان بن گیا تھا۔

سرعت سے دروازے سے کان لگاتے ہوئے انہوں نے کچھ محسوس کرنا چاہا تھا۔ لیکن چند لمحوں کی ناکام کوشش کے بعد وہ گھبرا کے پیچھے ہٹے تھے۔ کچھ غلط ہونے کا احساس ان کے اندر بڑی شدت سے جاگا تھا۔

بے اختیار وہ دبے لیکن تیز قدموں سے لابی کے آخری سرے پہ موجود ممتاز کے کمرے کی جانب

بڑھے تھے اور اسے اپنے بیڈ پہ اجیہ کے برابر گہری نیند سوتا دیکھ کے ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ مارے وحشت کے وہ اس کے کمرے کا دروازہ بند کیے بنا' تیزی سے سیڑھیوں کی جانب لپکے تھے۔ حیران پریشان سے غفار بھی نا سمجھی کے عالم میں ان کے پیچھے نیچے اترے تھے۔

"کیا بات ہے نجیب! خیر تو ہے نا؟؟" انہیں لاؤنج میں موجود دیوار گیر الماری کی دراز' دیوانہ وار کھنگالتے دیکھ کر وہ تیزی سے ان کی جانب آئے تھے۔ مگر نجیب حسن انہیں کوئی جواب دیے بنا دراز میں سے چابیوں کا گچھا اٹھا کے واپس اوپر بھاگے تھے۔

ان کے ہاتھ میں چابیاں دیکھ کر غفار ملک کو بھی عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس لیے مزید کچھ پوچھے بنا وہ بھی ان کے پیچھے لپکے۔

سیڑھیاں چڑھ کے نجیب حسن نے ایک بار پھر احتیاط سے اپنے کمرے کی طرف پیش رفت کی تھی۔ دروازے کے لاک میں چابی ڈالنے سے پہلے ان کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔ مگر انہوں نے لب بھینچے یہ پل صراط پار کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ صوفے پہ بیٹھی بازغہ کے چہرے پہ جھکا ہوا تھا۔ جب لاک میں کھٹ کی ہلکی سی آواز نے دونوں کے مدہوش اعصاب کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے اور سمجھ کے سنبھلتے' دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا تھا۔ اور دونوں کے جسم کا رواں رواں نجیب حسن کو سامنے پا کے کھڑا ہو گیا تھا۔

جب کہ نجیب اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کی آغوش میں دیکھ کے کسی بت کی طرح ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کے پیچھے کھڑے غفار کی بھی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو گئی تھی۔

سرعت سے خود پہ قابو پاتے ہوئے ان دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑتے ہوئے کھڑا ہونا چاہا تھا۔ لیکن تب تک نجیب حسن کے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ چکے تھے۔

دیوانوں کی طرح اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارتے ہوئے مغلظات کا ایک طوفان تھا' جو نجیب کے لبوں سے برآمد ہوا تھا اور جس وقت انہوں نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا اپنا پسٹل نکالا تھا' کونے میں کھڑی تھر تھر کانپتی بازغہ کی دہشت ناک چیخوں نے "حسن ولا" کے در و دیوار کو ہلا ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼
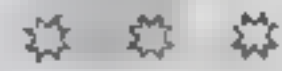
عجیب سا شور تھا جس نے مہناز کی آنکھ کھول دی تھی۔ چند لمحے نا سمجھی کے عالم میں اس نے ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جونہی اسے چیخوں اور چیزیں گرنے کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے کمبل ہٹا' کھلے دروازے سے باہر بھاگی تھی۔ مگر بھائی کے کمرے کے منظر نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔

"چھوڑو مجھے غفار! میں ان کمینوں کو چھوڑوں گا نہیں۔" غفار نے آپے سے باہر ہوتے نجیب حسن کو جکڑ رکھا تھا جبکہ وہ ہاتھ میں پستول لیے خود کو چھڑانے کی کوشش میں بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

بے اختیار وہ وحشت زدہ سی آگے بڑھی تھی۔ اس کی نظر کمرے کے انتہائی سرے پہ دیوار کے ساتھ روتی شور مچاتی بازغہ پہ پڑی تھی۔ تب ہی اس کھینچا تانی میں نجیب نے کسی کو زوردار ٹھوکر ماری تھی اور وہ کراہتا ہوا دروازے کی جانب گرا تھا۔

مہناز کی متوحش آنکھیں اس شخص کی جانب اٹھی تھیں اور پھر گویا جھپکنا بھول گئی تھیں۔ وہ کوئی اور نہیں' بلکہ اس کا منگیتر تھا۔ وہ شخص جو اسے محض ڈیڑھ مہینے بعد بیاہنے آنے والا تھا۔ اس کا متوقع شوہر اور اس گھر کا ہونے والا داماد اس کے بھائی کی ٹھوکروں میں کیوں تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

ادھر غفار' نجیب حسن سے پسٹل چھیننے میں کامیاب ہوئے تھے مگر انہوں نے بازغہ کو نجیب کے ہاتھوں سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ جنہوں نے پے در پے اس کے منہ پہ تھپڑ مارنے کے بعد اسے بالوں سے پکڑ کے اپنے روبرو کیا تھا۔

"میں نجیب حسن' بقائمی ہوش و حواس' بازغہ حسین تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں!!"

باہر کھڑی مہناز پہ حقیقت پہاڑ بن کے ٹوٹی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں اپنا چکراتا سر تھامے وہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

غفار کے فوری فون پہ سب گھر والے دوڑے چلے آئے تھے۔ اس دوران اس نے نجیب حسن کو زبردستی ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ جبکہ مہناز کا منگیتر انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا وہاں سے نکل گیا تھا۔ بازغہ بھی اس سب کے بعد زیادہ دیر وہاں نہیں رکی تھی۔

"حسن ولا" کے پریشان حال مکین بری سے بری خبر کا سوچتے ہوئے محض آدھے گھنٹے میں گھر پہنچے تھے۔ مگر آگے جو کرب ناک اور بھیانک صورت حال ان کی منتظر تھی۔ اس کے بارے میں تو انہوں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔ دھچکا اتنا شدید اور اچانک تھا کہ فریدہ بیگم تو وہیں چکرا کے گر پڑی تھیں جبکہ داؤد صاحب کی تو جیسے قوت گویائی ہی سلب ہو کے رہ گئی تھی۔ بہروز اور شہباز حسن۔ سرخ انگارے چہروں کے ساتھ باہر کی جانب لپکے تھے۔ لیکن آگے بپھرے ہوئے حسین صاحب' منیر حسین اور مہناز کے سسرال والوں کو دیکھ کے وہیں رک گئے تھے۔ اس کے بعد وہاں وہ قیامت برپا ہوئی تھی کہ رشتے ناطے' عزت اور لحاظ ہر چیز اس طوفان میں بہہ گئی تھی۔

بازغہ نے خود پہ لگے الزام سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سب نجیب حسن اور اس کے دوست کی گندی چال تھی۔ کیونکہ نجیب کا خود کسی لڑکی سے معاشقہ چل رہا تھا۔ جس کی بابت بازغہ کو مہناز کے منگیتر نے خبر دی تھی اور نجیب اس حقیقت کے کھلنے پہ اس بے چارے کے دشمن بن گئے تھے۔ انہوں نے بازغہ کو بھی دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اپنے گھر والوں یا کسی اور سے اس بارے میں بات کی تو وہ اسے طلاق دے دیں گے۔ اس دوران مہناز کے منگیتر نے نجیب کو دو' تین بار مزید اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تو خود کو انہیں سمجھانے سے روک نہ سکا۔ اس کی دخل اندازی نے نجیب کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ بازغہ کے بقول اس شام بھی نجیب نے ہی آفس سے فون کر کے اسے گھر پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ اور جب وہ گھر آ گیا تو وہ اپنے دوست کو لے کر ان کے سر پہ پہنچ گئے اور ان پہ انتہائی رکیک الزام لگا کے مار پیٹ شروع کر دی اور بازغہ کو کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔

بازغہ کے اس بیان نے نہ صرف اس کے باپ بھائی بلکہ مہناز کے سسرال والوں کی توپوں کا رخ بھی نجیب حسن کی جانب کر دیا تھا۔ بازغہ کی اس درجہ بے شرمی اور مکاری پہ نجیب اس کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ ہر طرف عجیب و غریب چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جنہوں نے داؤد صاحب کے گھرانے کو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔

نجیب حسن نے خود کو گھر میں قید کر لیا تھا۔ ان کی نہ صرف غیرت پہ بلکہ محبت پہ بھی تازیانہ پڑا تھا۔ لوگوں کے سامنے کی ان میں ہمت نہ رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے گھر والوں سے بھی نگاہیں ملانے کے قابل نہ رہے تھے۔ ان کی حالت اور بربادی پہ ماں' بہنوں کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ بس ایک اجیہ کا وجود تھا جو ان کے لیے اس تکلیف میں سکون کا باعث تھا۔ وہ اس مختصر عرصے میں بہت تیزی سے اپنی بیٹی کے قریب آئے تھے۔ لیکن خدا کو شاید ان کی مزید آزمائش مقصود تھی۔

بازغہ نے ان سے بدلہ لینے کے لیے اجیہ کے حصول کا مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ نجیب حسن اس وار پہ تڑپ اٹھے تھے۔ ایک بدکردار عورت کو اپنی بیٹی سونپنے کا خیال ہی ان کے لیے سوہان روح تھا۔ انہوں نے شہر کے بہترین وکیل سے رابطہ کیا تھا اور پانی کی طرح اس کیس پہ پیسہ بہایا تھا لیکن چونکہ اجیہ محض آٹھ ماہ کی تھی اور ان کے پاس بازغہ کی بدکرداری کا کوئی مضبوط

ثبوت بھی نہیں تھا۔ اسی لیے فیصلہ بازغہ کے حق میں ہوا تھا۔ وہ اس لڑائی میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے تھے۔ دکھوں اور آزمائشوں نے جیسے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔

بیٹے اور پوتی کے غم میں فریدہ بیگم بستر سے جا لگیں۔ اس پہ مستزاد مناز کی فکر نے انہیں دنوں میں ختم کردیا تھا۔ جس روز انہوں نے آنکھیں بند کی تھیں' اس روز نجیب حسن کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

وہ وقت کتنا کڑا اور اذیت ناک تھا' یہ کوئی داؤد حسن سے پوچھتا۔ جن کی ایک طرف زندگی کی غم گسار ساتھی' ساتھ چھوڑ گئی تھیں اور دوسری طرف جوان بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ان کے بکھرتے حوصلوں کو مزید بکھیرنے پہ تلا تھا۔ بیٹی کا گھر بسنے سے پہلے اجڑ گیا' وہ غم الگ تھا۔

اجیہ کی جدائی' اپنی بیماری اور ماں کے غم سے سنبھلنے میں نجیب حسن کو دو تین ماہ لگ گئے تھے۔ اس دوران ان سب کو بازغہ کے ایک ماہ پہلے ہونے والے نکاح کی خبر ملی تو سب چونک گئے۔ کیونکہ ایسی صورت حال میں اجیہ کے نجیب حسن کی کفالت میں آنے جانے کی امید تھی۔

امید کی اس نئی کرن نے سب کے ہی اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی وہ سب ایک بار پھر وکیل کی جانب دوڑے تھے۔ اور تب بازغہ کا آخری وار ان سب پہ منکشف ہوا تھا۔ وہ اجیہ کو اپنے ساتھ جرمنی لے گئی تھی۔ اسے اجیہ سے کتنا لگاؤ تھا اور وہ اسے کیوں لے گئی تھی' سب اچھی طرح جانتے تھے۔ مگر بازغہ کی ذلالت کے آگے بے بس ہوگئے تھے۔

اس گری ہوئی عورت کا یہ وار نجیب حسن کے لیے کاری اور آخری ضرب ثابت ہوا تھا۔ انہیں ایک بار پھر شدید قسم کا اٹیک ہوا تھا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے تھے اور ان سب کو بھری جوانی میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

داؤد صاحب کی سسکی انہیں ماضی سے واپس حال میں کھینچ لائی تھی۔ کیسا کرب ناک عذاب سہا تھا انہوں نے۔ جب ان کے ناتواں بوڑھے وجود نے جوان بیٹے کے جنازے کو کندھا دیا تھا۔ اپنی وہ ذہنی کیفیت اور اپنے لاڈلے کی وہ اذیت بھری موت انہیں آج پچیس سال بعد بھی بخوبی یاد تھی۔ مگر بازغہ نے انتقام یہیں پہ ختم نہیں کیا تھا اس نے اپنی پاکستان [illegible] پر داؤد صاحب کی اجیہ سے ملنے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اور اس نے ایسا ایک بار نہیں بلکہ بار بار کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر خود ہی ہمت ہار بیٹھے تھے۔

اس دوران اس نے اجیہ کے دل میں اس کے [illegible] اور ددھیال والوں کے خلاف اتنا زہر بھرا تھا کہ وہ ان میں سے کسی کا نام تک نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس بات کا انکشاف داؤد صاحب پہ آج سے بس ڈیڑھ ماہ پہلے ہوا تھا۔ جب ایک دن اچانک انہیں عدالت کی طرف سے ایک نوٹس ملا تھا جس میں ان کی پچھلے پچیس سال سے گم گشتہ پوتی نے ان سب کو غاصب قرار دیتے ہوئے اپنے باپ کی وہ جائیداد طلب کی تھی جو بقول اس کے ان کی ذاتی کمائی سے بنائی گئی تھی۔

اس نوٹس نے "حسن ولا" کے سب مکینوں کو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا دھچکا پہنچایا تھا۔ لیکن داؤد صاحب پہ تو شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ اجیہ کا مطالبہ اور اس مطالبے سے جھلکتی بیگانگی سب کچھ بھول بھال اسی بات پہ نہال ہوگئے تھے کہ ان کی اجیہ ان کے پاس اسی شہر میں موجود تھی۔

وہ اسے دیکھنے' اس سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھے تھے۔ انہوں نے بہروز حسن سے اس کا ایڈریس پتا کروانے کے لیے کہا۔ کیونکہ بازغہ کے والدین کو گزرے ہوئے تو کافی عرصہ بیت گیا تھا۔ منیر جو آرمی میں تھے۔ اس لیے انہیں اندازہ نہ تھا کہ وہ کہاں ٹھہری ہوئی تھی۔

ان کے بے حد اصرار پہ بالآخر بہروز حسن مجبور ہوگئے تھے۔ ان کے پتا کروانے پہ انہیں نہ صرف اجیہ کی تنہا پاکستان آمد کے بارے میں پتا چلا تھا بلکہ یہ بھی

پتا چلا تھا کہ منیر حسین آج کل اسی شہر میں پوسٹڈ تھے اور اجیہ انہی کے گھر ٹھہری ہوئی تھی۔

یہ تمام تفصیل انہوں نے داؤد صاحب کے گوش گزار کردی تھی۔ جو اجیہ کی تنہا پاکستان آمد کا سن کے پھولے نہیں سمائے تھے۔ ان کے خیال میں اجیہ سے ملاقات کا یہ بہترین موقع تھا جبکہ باقی گھر والے اس بات پہ مصر تھے کہ ان کا اجیہ سے جا کر ملنا کسی طور پر مناسب نہ تھا۔ وہ لڑکی ان سب سے انجان اور مکمل طور پہ بدگمان نظر آرہی تھی مگر داؤد صاحب کی بات میں اپنی جگہ وزن تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا اجیہ سے ملنا شاید اس کے اندر کوئی تبدیلی نہ لاسکے' لیکن ان کی آج کی بے نیازی شاید ہمیشہ کے لیے اس کی بدگمانی پہ یقین کی مہر لگا دے اور وہ چونکہ بازغہ کے کہے کو سچائی میں بدلنا نہیں چاہتے تھے اسی لیے وہ اگلے دن بہروز حسن اور شہباز حسن کو لے کر اپنی پوتی سے ملنے منیر حسین کے گھر چلے آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟" گیٹ پہ آنے والے ملازم نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"ہمیں اجیہ بی بی سے ملنا ہے۔ ان سے کہنا کہ "حسن ولا" سے ان کے دادا ملنے آئے ہیں۔" داؤد حسن نے رسان سے اسے جواب دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

"معاف کیجیے گا' لیکن کرنل صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ آپ سے نہیں ملنا چاہتیں۔" پانچ چھ منٹ کے انتظار کے بعد وہ کورا جواب لیے باہر آیا تو بہروز حسن کے چہرے پہ تناؤ در آیا۔

"اپنے کرنل صاحب سے کہیں کہ وہ اس بات کا فیصلہ اجیہ کو ہی کرنے دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔" بہروز حسن کے کاٹ دار لہجے پہ ملازم خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا۔

مگر اب کی بار اس کی واپسی جلدی ہوئی تھی اور اس نے ان کے لیے آتے کے ساتھ ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

"آیئے۔" داؤد صاحب کا دل یک لخت مسرور ہوگیا تھا۔ ان کے دونوں بیٹے کیا سوچ رہے تھے' انہیں اندازہ نہیں تھا۔ لیکن انہیں اپنے یہاں آنے کا فیصلہ یکایک بالکل درست لگا تھا۔

ملازم انہیں لیے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ جہاں تنہا صوفے پہ نجیب کی شباہت اور بازغہ کا رنگ روپ چرائے بیٹھی ایک لڑکی ان تینوں کی ساری توجہ اپنی جانب کھینچ لے گئی تھی۔

بے اختیار داؤد حسن آنکھوں میں نمی اور دل میں بے قراری لیے اس کی جانب بڑھے تھے مگر اس نے اپنی جگہ سے اٹھے بنا ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

"وہیں رک جائیں۔" داؤد صاحب کے قدم اپنی جگہ پہ ساکت ہوگئے تھے۔

"آپ سے نہ ملنے کا فیصلہ میرا اپنا تھا اور میں نے آپ کی یہی غلط فہمی دور کرنے کے لیے آپ کو اندر بلایا ہے۔ مجھ سے آئندہ اپنا تعلق جوڑنے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔"

آنکھوں میں نفرت اور چہرے پہ بیگانگی لیے وہ انتہائی گستاخانہ لہجے میں بولتی بہروز اور شہباز دونوں کو سراپا سلگا گئی۔ لیکن داؤد حسن نجانے محبت کی کس انتہا پہ تھے کہ انہوں نے اس کی اس درجہ بدتمیزی کو بالکل نظر انداز کردیا تھا۔ یوں جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

"اپنی ذات سے جڑا میرا حوالہ تو تم خود بھی نہیں توڑ سکتیں بیٹا!" وہ بھرائے ہوئے نرم لہجے میں گویا ہوئے۔

"کیا کہا' بیٹا؟" استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے تمسخرانہ نظروں سے داؤد صاحب کی جانب دیکھا تو انہوں نے مارے اذیت کے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا جبکہ شہباز حسن کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئی تھیں۔

"کمال ہے۔ آج تک تو اس "بیٹا" کی کبھی یاد نہیں آئی اور اب کورٹ کا نوٹس ملتے ہی نہ صرف ٹھکرائی

ہوئی پوتی یاد آگئی بلکہ وہ "بیٹا" بھی بن گئی۔ یہ دولت بھی کتنی بری چیز ہے نا۔ انسان کو کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پہ مجبور کردیتی ہے۔" طنزیہ لہجے میں کہتی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہم یہاں دولت اور جائیداد بچانے کے لیے آئے ہیں؟" اس کی بدگمانی پہ داؤد صاحب کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی تھی۔

"پلیز! اب یہ مت کہیے گا کہ آپ لوگ یہاں میری محبت میں آئے ہیں۔" ان کی جانب دیکھتی وہ تلخی سے بولی تو داؤد حسن تڑپ اٹھے۔

"یہی سچ ہے بیٹا! ہم یہاں صرف تم سے۔"

"بس کریں۔ پلیز فار گاڈ سیک!" وہ یک لخت حلق کے بل چلا اٹھی تھی۔ "آپ لوگوں نے کیا مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے، جو مجھے بے وقوف بنانے کھڑے ہوگئے ہیں؟ یا آپ سب میں واقعی شرم نام کی کوئی چیز نہیں؟ میری ممی بالکل ٹھیک کہتی ہیں آپ لوگ نہایت گھٹیا، لالچی اور مطلب پرست ہیں لیکن آپ یوں میرے منہ پہ آکے جھوٹ بولیں گے اس۔"

"زبان کو لگام دو اجیہ!" شہباز حسن سرخ چہرہ لیے یک لخت چند قدم آگے آتے ہوئے بولے تو اجیہ ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔ لیکن صرف ایک لمحے کو۔ اگلے ہی پل اس کے لبوں پہ بڑی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"بس اتنی ہی دیر محبت کا ڈھونگ رچانے کی ہمت تھی؟" اس نے شہباز صاحب کے سرخ چہرے کی جانب دیکھا تو وہ ایک کھا جانے والی نظر اس پہ ڈالتے ہوئے باپ کی طرف پلٹے۔

"بہت ہوگیا بابا جان! میں مزید یہاں آپ کو ایک منٹ نہیں رکنے دوں گا۔"

"شکر ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے ملازموں کو بلانے کی زحمت سے بچالیا۔ بٹ اینی وے چال اچھی تھی۔ وہ اور بات ہے کہ کامیاب نہیں ہوئی۔ لہٰذا اب ملاقات کورٹ میں ہوگی۔" ان تینوں پہ ایک تنفر بھری نظر ڈالتی وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی تو داؤد حسن نے اپنے لرزتے سرد ہاتھ سے قریب کھڑے شہباز صاحب کا بازو تھام لیا۔

"بابا جان! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" ان کے دل کی اس وقت کیا کیفیت تھی یہ ان دونوں سے بہتر بھلا اور کون جان سکتا تھا، جن کے اپنے دل اس وقت خون کے آنسو رو رہے تھے۔

"میں ہار گیا بیٹا! اور میرا نجیب بھی ہار گیا۔ وہ عورت، اس کی مکاری اور اس کا جھوٹ جیت گیا۔" ان کی غم زدہ آنکھوں کے آنسو ان کے بوڑھے جھکے ہوئے چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔

"چلو۔ اب یہاں سے چلتے ہیں۔" وہ لرزتے قدموں سے باہر کی جانب بڑھے تھے لیکن دروازے میں منیر حسین کو تمسخرانہ نظروں سے اپنی جانب تکتا پاکے وہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ انہیں رکتا دیکھ کے بہروز اور شہباز حسن کی نظریں بھی سامنے کی جانب اٹھیں اور ان کے چہرے تن گئے۔

"بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔" طنزیہ لہجے میں کہتے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن ان تینوں کا تن من اس تذلیل سے جل اٹھا تھا۔ گھر آکے داؤد حسن تو نڈھال سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ لیکن شہباز حسن کے لیے خاموش رہنا ناممکن ہوگیا تھا۔ سب کے پوچھنے پہ وہ بے اختیار پھٹ پڑے تھے۔ اجیہ کے ناروا سلوک نے سب ہی کی آنکھیں نم اور دل غصے سے بھر دیے تھے۔ لیکن شاہی کے لیے یہ سب خاموشی سے برداشت کرنا اور صبر سے کام لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ کسی طور اس بدتمیز لڑکی کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا جس نے اس کے بزرگوں خاص کر ان کے عزیز از جان دادا کی اس درجہ بے عزتی کی تھی۔

وہ تو اسی وقت منیر حسین کے گھر جاکے اس لڑکی کا دماغ ٹھکانے لگانے پہ تل گیا تھا لیکن بہروز حسن کی سختی سے کی گئی تنبیہہ نے اسے روک دیا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے بنا سوچے سمجھے اپنے بڑے بھائی زوار کو فون کیا تھا۔ جو کورس کے سلسلے میں پچھلے ایک ماہ

سے لاہور گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ گزشتہ دنوں کی ہر بات سے بے خبر تھا۔ شاہی کے منہ سے ساری باتیں سن کے وہ بے اختیار اس پہ برس پڑا تھا۔ گھر میں اتنا کچھ ہوگیا تھا اور کسی نے اس سے ذکر تک کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ شاہی کے صفائی دینے پہ اس نے غصے سے فون پٹخ دیا تھا۔

لیکن اگلے روز اس نے اپنی واپسی کے متعلق بھائی کو بتاتے ہوئے مکمل خاموشی کی تلقین کی تھی۔ وہ ایئرپورٹ سے سیدھا اپنے "واہ" والے گھر گیا تھا۔ اس کی اسی حرکت نے شاہی کو الجھا دیا تھا۔ اس کے اصرار پہ زوار نے اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کردیا تھا۔

شاہی اس کے اس درجہ انتہائی ردعمل کا سن کے بری طرح پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ اپنی عادت کے مطابق اپنی بات پہ اڑ گیا تھا۔ ویسے بھی سب سے بڑا پوتا ہونے کی وجہ سے وہ داؤد صاحب کے بے حد نزدیک تھا۔ کسی کی ان سے اونچی آواز میں کی بات بھی اس کے لیے برداشت کرنا ناممکن ہوتا تھا کجا کہ اس درجہ بے عزتی؟

اس نے اجیہ نجیب کو سزا دینے کی ٹھان لی تھی۔ اس لیے شاہی جانتا تھا کہ اس کا یہ سمجھانا بجھانا اب کسی کام نہیں آنے والا تھا۔

زوار نے وہیں رک کے اپنے ترتیب دیے پلان پہ کام شروع کیا تھا۔ اس دوران اجیہ کی دانش منیر سے انڈر اسٹینڈنگ اور منگنی کی خبر بھی اس کے علم میں آئی تھی اور باوجود اس کے کہ ان کے درمیان موجود دوسرا رشتہ وقت کی گرد تلے دب گیا تھا۔ اجیہ کا خیال اس کے ذہن سے کبھی فراموش نہ ہوسکا تھا۔ ویسے بھی وہ تو ان کے گھر کا ایک غائبانہ فرد تھی۔ جو ان کی زندگیوں سے نکل کر بھی نہ نکلی تھی۔ ایسے میں ان دونوں کے رشتے کے حوالے سے کوئی نہ کوئی آدھا ادھورا جملہ اس کے دل میں ہلکی سی ہلچل ضرور پیدا کرتا تھا۔

مگر اب اس سب کے بعد وہ میٹھی میٹھی سی کسک بھی ختم ہوگئی تھی۔ یہ اس کے لیے اب صرف عزت و ناموس کی لڑائی رہ گئی تھی۔ وہ لڑائی جسے بازغہ حسین پچھلے پچیس سال سے اپنے مکروفریب کے بل بوتے پہ جیتے ہوئے تھی۔ مگر جسے اب زوار کو اس کی شکست میں بدلنا تھا۔ اسے منیر حسین کو یہ بتانا تھا کہ درحقیقت بے آبرو ہونا کہتے کسے ہیں اور سب سے بڑھ کے اسے اجیہ نجیب کو نہ صرف اس کی بے لگامی پہ سبق سکھانا تھا بلکہ اس کی آنکھوں پہ بندھی اس کی ماں کی نیکی اور اچھائی کی پٹی بھی کھولنا تھی۔ کیسے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اسے اپنے اللہ پہ بھروسا تھا کہ وہ ضرور ایک باپ کی سچائی اس کی بیٹی پہ واضح کرے گا۔

زوار کا اجیہ کے لیے اٹھایا جانے والا قدم بظاہر ایک جذباتی فیصلہ تھا۔ لیکن درحقیقت اس کا بڑا گہرا اور مثبت پہلو تھا۔ جو دھیرے دھیرے ہی سب پہ واضح ہونا تھا۔ لیکن تب تک کے لیے اسے اپنے فیصلے پہ مضبوطی سے قائم رہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

زوار نے بازغہ خلیل سے اپنا حساب تو بےباق کردیا تھا۔ لیکن داؤد صاحب جانتے تھے کہ اجیہ اور ان لوگوں کے درمیان موجود خلیج کو زوار کی اس حرکت نے اتنا وسیع کردیا تھا کہ اب اسے پاٹنا شاید ان میں سے کسی کے بس میں نہ رہا تھا۔ وہ داؤد صاحب کی آنکھوں کے سامنے ہر لحہ ان کی آزمائش بن کے آکھڑی ہوئی تھی اور وہ اس کی نفرت سے کیسے نبرد آزما ہونے والے تھے۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

داؤد حسن سمیت سب پہ ہی یہ رات بہت بھاری گزری تھی اور یہ بوجھل پن اگلی صبح "حسن ولا" کے مکینوں سے لے کر اس کے در و دیوار تک پہ چھا گیا تھا۔ ہر کوئی چپ چاپ اپنی اپنی سوچوں میں گم اس نئے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ زوار البتہ سب سے بے نیاز ناشتا کرکے اپنے آفس جاچکا تھا۔ شاہی بھی خاموشی سے فیکٹری کے لیے نکل گیا تھا اور پیچھے ایک بار پھر سے مسئلہ زیر بحث تھا۔

"یہ لڑکی مگرمچھ کے آنسو بہا رہی ہے۔ درحقیقت

یہ دونوں ماں' بیٹیاں جانتی تھیں کہ انہیں اس مقدمے سے کچھ حاصل وصول نہیں ہونے والا۔ لہٰذا یہ کسی اور موقع کی تلاش میں تھیں اور ہمارے لاڈلے نے جذبات میں وہ موقع ان کی جھولی میں لا پھینکا۔ جس زبردستی کا یہ شور مچا رہی ہے' کوئی پوچھے بھلا وہ کب اور کیسے ہوئی؟ کیا منیر سو رہا تھا؟ میرا بیٹا اٹھا لے گیا تھا اسے؟"

جبین نے سرخ متورم آنکھوں سے حاضرین محفل کی جانب دیکھا۔ "یہ رونا دھونا' یہ شور' ہنگامہ صرف ڈراما ہے ان ماں' بیٹی کا۔ ورنہ اصل میں تو ان مکار عورتوں کی دلی مراد بر آئی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو بابا جان! آپ ابھی اسے بلائیں اور کہیں کہ یہ منیر کو فون کر کے یہاں بلائے۔ میں خود اسے اس کے ساتھ بھیجوں گی اور دیکھوں گی کہ زوار کیسے اپنی غلطی نہیں سدھارتا۔"

"بھابھی! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اگر زوار نے زور زبردستی نکاح پڑھوایا تھا تو منیر یہاں کیوں نہیں آیا؟ اور بازغہ نے اس نے کیسے یہ سب برداشت کر لیا۔ یقیناً" دال میں کچھ کالا ہے اور یہ تب ہی کلیئر ہو سکتا ہے جب اجیہ' منیر اور ہم سب ایک دوسرے کے روبرو ہوں گے۔" عالیہ نے بھاوج کی تائید کی تو داؤد حسن نے پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ واقعی یہ سب سوال بے حد اہم اور غور طلب تھے۔

عالیہ کے کہنے پہ ملازمہ گیسٹ روم سے اجیہ کو بلانے گئی تھی۔ جو نہ جانے کیا سوچ کر اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ دوسری جانب ان سب نے بھی اسے اتنی آسانی سے اپنے سامنے پا کے سکھ کا سانس لیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا!" اسے دروازے کے پاس کھڑا دیکھ کے داؤد صاحب نے شفقت سے کہا۔

"کس لیے بلایا ہے مجھے؟" ان کی بات کو نظرانداز کیے وہ تنے ہوئے لہجے میں بولی تو داؤد صاحب کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ جبکہ باقی سب کو اس کا انداز بے حد ناگوار گزرا تھا۔

"بہت شور مچا رکھا ہے نا تم نے کہ زوار نے تمہارے ساتھ زبردستی نکاح پڑھوایا ہے۔" عالیہ اٹھ کر اسٹینڈ پہ پڑے کارڈلیس کی جانب بڑھیں اور فون اٹھا کر اجیہ کی طرف پلٹیں۔ "یہ پکڑو اور منیر کی بات کرواؤ بابا جان سے۔ ہم ابھی اسی وقت اسے یہاں بلا کے تمہیں اس کے ساتھ روانہ کریں گے۔" انہوں نے ساکت کھڑی اجیہ کا ہاتھ پکڑ کے اس پہ فون رکھا تھا اور اجیہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے؟

وہ بھلا کس منہ سے منیر ماموں کو فون کر سکتی تھی۔ انہوں نے تو محض یہ جان کر کہ وہ نکاح کر چکی ہے۔ اس سے ہر تعلق توڑ لیا تھا اور اگر جو انہیں یہ پتا چل جاتا کہ اس نے نکاح زوار حسن سے کیا ہے تو انہوں نے تو اس کی ماں کی بھی ساری زندگی شکل نہیں دیکھنی تھی' کجا کہ اس کی کسی بات پہ یقین کرنا اور اس کی مدد کرنا؟

نہیں۔ وہ کسی طور اپنی ماں کی تکلیف میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اتنا تو وہ بھی بازغہ کو جانتی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے انہوں نے از خود منیر سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہو گا کہ اجیہ کا شوہر کوئی انجان شخص نہیں' بلکہ زوار حسن ہے۔ وہ بھلا اپنے ہاتھوں اپنی سبکی میں اضافے کا سامان کیسے کر سکتی تھیں؟ وہ تو بڑی خوددار اور غیرت مند عورت تھیں۔

"نہیں فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اس سب کے بعد مجھ سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔" وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولی تو عالیہ کے چہرے پہ طنزیہ تاثر پھیل گیا۔

"کیوں تم نے زوار سے اپنی مرضی سے نکاح پڑھوایا ہے کیا۔ جو وہ تم سے قطع تعلق کر چکا ہے؟"

"آپ لوگوں کے عیار بیٹے نے انہیں یہی تاثر دیا ہے۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتی وہ دوبدو بولی۔

"اور تم اتنی سیدھی ہو نا کہ تم نے اسے جھٹلایا نہیں اور وہ منیر۔ کیا اسے نہیں پتا کہ اس کی بھانجی کے ساتھ زور زبردستی کی گئی ہے یا اس نے اپنی مرضی سے نکاح رچایا ہے۔ وہ کیا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے یا ہم تمہیں پاگل نظر آ رہے ہیں؟" عالیہ غصے سے بولیں تو اجیہ کا ضبط جواب دے گیا۔

"نہ وہ پاگل ہیں اور نہ آپ لوگ۔ بلکہ زوار حسن ضرورت سے زیادہ مکار ہے۔ وہ نقلی نکاح نامہ لے کر میری منگنی میں پہنچ گیا تھا اور اسے اصلی ثابت کر کے مجھے نہ صرف زبردستی وہاں سے لے آیا' بلکہ بعد میں مجھ سے اصل نکاح بھی پڑھوا لیا۔"

"کیا بکتی ہو؟ جعلی نکاح نامہ؟" حیران پریشان سی عالیہ نے پلٹ کے سب کی طرف دیکھا تو بہروز صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا فضول بات ہے یہ۔ جعلی نکاح نامے کو اصل ثابت کرنا کوئی مذاق ہے کیا؟" دلہن کی جگہ پہ تمہارے دستخط کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟ اور یہی تو وہ پوائنٹ تھا جہاں پہ آ کے وہ خود حیرت بھری الجھن میں گرفتار ہو جاتی تھی۔ تو وہ بھلا کسی اور کو کیا جواب دے سکتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اسی کیفیت میں گھری یہ سوچ رہی تھی کہ انہیں اس بات کی کیا صفائی پیش کرے۔ جب جبین غصے سے بول اٹھی تھیں۔

"کس فراڈ کی باتوں پہ یقین کر رہے ہیں آپ لوگ۔ کیا کوئی تک بنتی ہے اس بات کی؟" انہوں نے قہر برساتی نظروں سے اجیہ کو گھورا۔ "اصل بات یہ ہے کہ یہ لڑکی منیر کو فون نہیں کرنا چاہ رہی۔ جس کا مطلب ہے کہ نہ صرف یہ بلکہ اس کی ماں اور اس کا ماموں سب کی یہی خواہش اور کوشش تھی کہ اس گھر میں نقب لگائی جا سکے تاکہ اس دولت اور جائیداد کو یہ لوگ لوٹ سکیں اور ہمارے بیٹے کی غلطی نے ان مکار لوگوں کو یہ موقع باآسانی فراہم کر دیا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا لڑکی!" وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "میں تمہیں اور تمہاری ماں کو اپنے بیٹے کی زندگی سے نہیں کھیلنے دوں گی۔ تم نے ان چند دنوں میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم صرف بازغہ کی بیٹی ہو اور بازغہ جیسی عورت کی بیٹی ہمیں کسی بھی رشتے میں قبول نہیں۔"

"بے فکر رہیں۔ بازغہ کی بیٹی کو بھی آپ لوگ کسی حیثیت' کسی رشتے میں قبول نہیں۔ رہی یہ دولت اور جائیداد تو جو کہانی آپ کے دماغ نے بنائی ہے' وہ آپ کی اپنی سوچ کی عکاسی کر رہی ہے۔ کیونکہ یہ دنیاوی چیزیں آپ لوگوں کا ایمان ہیں۔ میرا یا میری ماں کا نہیں۔ جنہیں آپ لوگوں نے ان کے ہر حق سے محروم کر کے اس گھر سے باہر نکال دیا تھا اور جب میں نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی تو مجھے باندی بنا کے اس گھر میں لا پھینکا۔ آپ جیسا ظالم اور خودغرض بھی بھلا کوئی ہو سکتا ہے؟ اگر زوار حسن نے میری واپسی کے راستے اس بری طرح بند نہ کیے ہوتے تو میں آپ کی غلط فہمی دور کرنے میں ایک لمحہ نہ لگاتی۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتی وہ متنفر لہجے میں بولی تو جبین کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ آ کے غائب ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری واپسی کا راستہ اب میں کھلواؤں گی؟ دیکھتی ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔"

"شوق سے۔ اس منحوس گھر میں آپ لوگوں کے درمیان سانس بھی لینا میرے لیے اذیت کا باعث ہے۔" کاٹ دار لہجے میں کہتی وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئی تھی۔

"دیکھی آپ نے اس لڑکی کی زبان۔ اس کا بس چلے تو یہ ہم سب کو گولی سے اڑا دے اور آپ چلے تھے اپنا حصہ اس بدبخت کے نام کرنے۔" اس کے باہر نکلتے ہی غصے سے بھری مہناز نے شکایتی نظروں سے باپ کی جانب دیکھا تھا۔ جو بے بسی اور دکھ کے احساس تلے اک بوجھل سانس کھینچ کے رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اپنے پیچھے گیسٹ روم کا دروازہ پوری طاقت سے بند کرتے ہوئے ذلت اور دکھ کے احساس سے جلتی اجیہ تیز قدموں سے کمرے کے وسط میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ ایک بچے کی طرح بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ شکستگی کی کیفیت میں دو زانوں زمین پہ گر گئی تھی۔ کتنی بے مول تھی

اس کی ذات۔ جس کا اس بھری دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ اس کے سگے باپ نے اسے ایک ناگوار بوجھ سمجھ کے جھٹک دیا تھا۔ جبکہ اس کے سوتیلے باپ نے اسے کبھی قبول ہی نہیں کیا تھا۔ خلیل جہانگیر کی موجودگی نے اسے اپنی ماں کی بھرپور محبت سے بھی محروم کردیا تھا۔ بے شمار دولت ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ جب تک وہ ناسمجھ تھی' ان کی بے پرواہیوں کے مفہوم سے ناآشنا تھی۔ لیکن تب بھی ان کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکتی نفرت کا احساس اسے خائف کردیتا تھا۔ انہیں اس کا اپنی چھوٹی بہنوں کے پاس آنا بھی گوارا نہ تھا۔ ان کے اس رویے نے اسے ان تینوں سے دور کردیا تھا۔ وہ اس فیملی کا حصہ ہوکے بھی ان سب سے الگ ہوکے رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کا محور و مرکز اس کی ماں کی ذات بن کے رہ گئی تھی۔ جن کی تھوڑی بہت محبت بھی اس کے ترسے ہوئے وجود کے لیے بہت تھی۔

رفتہ رفتہ اسے خلیل جہانگیر سے اپنا رشتہ خود ہی سمجھ میں آگیا تھا۔ جس کے بعد اس کے اندر اپنے اصل باپ اور اپنی اصل فیملی کے متعلق سوالوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں جو تلخ حقیقت اس کی ماں کے ذریعے اس کے علم میں آئی تھی' اس نے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا۔

اس کی ممی نے اسے بتایا تھا کہ اس کا باپ' نجیب حسن ایک بہت اونچے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جبکہ خود ان کا تعلق نسبتاً" کم دولت مند فیملی سے تھا۔ اسی لیے جب نجیب حسن نے ان سے پسند کی شادی کا فیصلہ کیا تو اس کے ددھیال والوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا اور باوجود اس کے کہ اس کی ممی داؤد حسن کے دوست کی بیٹی تھیں۔ انہیں یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔ لیکن نجیب کی ضد کے آگے ان کی فیملی کو ہار ماننا پڑی تھی اور بالآخر وہ بہو بن کے "حسن ولا" میں آگئی تھیں۔ مگر چونکہ ان لوگوں نے انہیں دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے ان کی نہ تو کوئی عزت تھی اور نہ ہی انہیں کوئی مقام دیا گیا تھا۔ ان کے گھر میں آتے ہی تمام ملازموں کو فارغ کردیا گیا تھا اور پھر ہر چیز کی ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی تھی۔ نجیب حسن نے بھی اپنے ماں' باپ اور گھر والوں کی ہر زیادتی پہ خاموشی اختیار کرلی تھی۔

دن ایک ایک کرکے گزرنے لگے تھے۔ اس کی ممی پریگننٹ ہوگئی تھیں۔ اس دوران اس کا باپ اپنی رنگین فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوکے اپنی پرانی سرگرمیوں کی جانب لوٹ چکا تھا۔ بازغہ میں ان کی دلچسپی دن بہ دن کم ہوتی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی پیدائش نے بھی ان کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

اس کی ممی کے بقول اس کے باپ کو اول روز سے اس کے وجود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہی حال باقی گھر والوں کا بھی تھا۔ جو کئی کئی دن اس کا چہرہ تک نہیں دیکھتے تھے۔ ہاں! لیکن اجیہ کی ذات پہ اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے انہوں نے اس کا رشتہ بازغہ کی مرضی کے خلاف زوار حسن سے طے کردیا تھا۔ پھر جب وہ چھ' سات ماہ کی تھی' تب ایک دن وہ سب ایک فنکشن میں گئے ہوئے تھے۔ اس کی ممی اس کی وجہ سے جلدی گھر آگئی تھیں اور تب انہوں نے اس کے باپ کو اپنے ہی کمرے میں ایک عورت کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ ان کے شور مچانے اور احتجاج کرنے پہ اس کے ظالم باپ نے انہیں کھڑے کھڑے طلاق دے دی تھی اور جب یہ خبر اس کے باپ کے گھر والوں کو پتا چلی تھی' تب انہوں نے اس کی ماں کا ساتھ دینے کے بجائے اپنے بیٹے کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے انہیں جھوٹا قرار دے کر اجیہ سمیت گھر سے نکال دیا تھا اور پھر ایسے ہی ظالمانہ طریقے سے وہ اس کے پورے ننھیال کے ساتھ پیش آئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اجیہ سے بھی مکمل طور پہ لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ کہ اسے جائیداد میں سے کچھ دینا نہ پڑے۔

عدت کے بعد اس کے نانا نے اس کی ممی کا رشتہ ان کے منع کرنے کے باوجود خلیل جہانگیر سے طے کردیا تھا۔ وہ بھی اس شادی کے لیے صرف اس لیے

راضی ہوگئی تھیں کہ خلیل' اجیہ کو بھی اپنانے کے لیے تیار تھے۔ اس طرح ان کی دوسری شادی خلیل جہانگیر سے ہوگئی تھی اور وہ اسے لے کر جرمنی چلی آئی تھیں۔ جبکہ پیچھے کچھ عرصے بعد اس کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔

اس کہانی کے بعد اجیہ کا اپنے سگے باپ سے متعلق ہر سوال اپنی موت آپ مرگیا تھا اور ان کے لیے اس کے اندر سوائے نفرت کے اور کچھ نہ بچا تھا۔ اپنے لالچی اور گھٹیا ددھیال والوں کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی جذبہ نہ تھا۔

اسے خلیل جہانگیر یکایک بہت بہتر انسان لگنے لگے تھے۔ جنہوں نے اپنی ناگواری کے باوجود کم از کم ایک ماں کو اس کی اولاد سے جدا تو نہیں کیا تھا۔ اسے اب ان سے کوئی شکوہ نہ رہا تھا۔ وہ ان کے گھر میں رہتی تھی۔ یہی بہت تھا۔ مگر اپنی ہر ہر محرومی پہ اس کے دل میں اپنے مرحوم باپ اور ان کے گھر والوں کے لیے عناد بڑھتا چلا جاتا تھا۔

ہائی اسکول کے بعد اس نے اپنا خرچ اٹھانے کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی نوکری بھی شروع کردی تھی اور اب کی بار اس کی ماں نے بھی اسے نہیں روکا تھا۔ وہ ان کی مجبوری سمجھتی تھی۔ اس دہری مشقت کی ہر تکلیف بھی "حسن ولا" کے کمینوں کے نام لکھی گئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اسے اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے لیے بہترین تعلیم کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے اپنی پوری توجہ پڑھائی پہ مرکوز کردی تھی۔ مگر عمر کے چوبیسویں سال جب وہ اپنا ماسٹرز کررہی تھی اسے ایک انڈین مسلم لڑکے سے محبت ہوگئی تھی اور بات شادی تک جا پہنچی تھی۔

خلیل جہانگیر نے بازغہ کے منع کرنے کے باوجود ان لوگوں کو صاف لفظوں میں بتادیا تھا کہ وہ اجیہ کے سگے باپ نہیں تھے۔ اس لیے وہ اسے کچھ بھی دینے والے نہ تھے۔

اس کورے جواب کے بعد وہ لوگ پیچھے سے اکھڑ گئے تھے۔ اس لڑکے کو بھی خلیل صاحب کا انداز بے حد ہتک آمیز لگا تھا۔ اس نے اجیہ کو صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اس سب کے بعد اس کے گھر والے کسی طور اس رشتے کے لیے تیار نہ تھے اور چونکہ وہ بہت سے معاملات میں اب تک اپنی فیملی کا محتاج تھا۔ اس لیے وہ ان کے خلاف نہیں جاسکتا تھا۔

اجیہ کے لیے یہ سب سہنا بہت مشکل تھا۔ مگر چونکہ وہ جانتی تھی کہ اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے اس نے خاموشی سے اس کے فیصلے کو قبول کرلیا تھا مگر اس تلخ گھونٹ کے بعد اس نے بازغہ کے کہنے پہ دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اب وہ غاصبوں سے اپنا حق لے کے رہے گی۔ گو کہ وراثت میں اس کا حصہ نہیں بنتا تھا کہ نجیب حسن کا انتقال داؤد صاحب کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا۔ لیکن بازغہ کو یقین تھا کہ ابھی بھی ایسا بہت کچھ تھا جو نجیب کی کمائی سے تھا اور جس پہ اجیہ قانوناً" حق رکھتی تھی۔ ان ہی کے مشورے پہ اس نے پہلے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ ساتھ ہی دن رات ایک کرکے اس نے پاکستان جانے اور وہاں مقدمے کے لیے پیسے جمع کیے تھے۔ بازغہ نے بھی اس سلسلے میں اس کی تھوڑی بہت مدد کی تھی کہ خلیل جہانگیر اپنی پائی پائی کا حساب رکھنا خوب جانتے تھے۔

ڈیڑھ سال کی تگ و دو کے بعد وہ پاکستان آئی تھی اور یہاں پہنچ کے اس نے منیر صاحب کے مشورے سے بہترین وکیل کیا تھا۔ اس دوران منیر ماموں کا بیٹا دانش بہت تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔ دونوں کو ہی ایک دوسرے کا ساتھ بھایا تھا اور انہوں نے اس ساتھ کو ہمیشہ نبھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس دوران "حسن ولا" کے لالچی کمین نوٹس ملتے ہی اس سے اپنی محبت جتانے آکھڑے ہوئے تھے۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا اور اس نے اپنی ساری جلن بنا کسی خوف کے ان لوگوں پہ نکال دی تھی۔ مگر یہ جرأت اسے اتنی مہنگی پڑ جائے گی اور "حسن ولا" کی نئی نسل اس درجہ کم ظرفی اور کمینگی پہ اتر آئے گی' اس بات کا اسے اندازہ نہ تھا۔

زوار حسن ایک طوفان کی طرح اس کی زندگی میں آیا تھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تہس نہس کرتا چلا گیا تھا۔ اس مکاری سے کہ وہ سچی ہوکے بھی جھوٹی بن گئی تھی اور وہ جھوٹا ہوکے بھی سچا بن گیا تھا۔ ایسے میں ان بے حس اور اخلاقی طور پہ دیوالیہ لوگوں سے اس کی نفرت اور گھن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

اپنی دولت کو بچانے کے لیے وہ کیسے اس کے در پہ محبت کا راگ الاپتے ہوئے چلے آئے تھے اور آج جب ان کے بیٹے نے اس کی مرضی کے خلاف ہی سہی، لیکن اجیہ کو ان کے درمیان لا بٹھایا تھا تو وہ سب ہی اپنے چند دن پیشتر کے دعوے کو بھول بھال اسے اس گھر سے نکالنے پہ تل گئے تھے۔ ان کے دوغلے پن نے اسے حیران کرنے کے ساتھ ساتھ بے انتہا دکھی بھی کر دیا تھا۔ اپنی کم مائیگی پہ آنسو بہاتے اس کا دل اپنی حرماں نصیبی پہ رلا رہا تھا۔ جسے ساری زندگی عزت، پیار اور مان نہیں ملا تھا اور شاید اب زندگی کی آخری سانس تک ملنے والا بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

دو دن ہو گئے تھے، بازغہ کو اجیہ سے بات کیے ہوئے۔ مگر ان کی بے یقینی تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ بھوک، پیاس، نیند ہر احساس جیسے ختم ہو گیا تھا۔ سوچوں نے انہیں خود سے بھی بے گانہ کر دیا تھا۔

ان کی حالت کو اجیہ کی شادی سے منسوب کرتے ہوئے خلیل صاحب کی جھلاہٹ عروج پہ پہنچ گئی تھی۔ طعنے، باتیں سنانے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کی اس سوگوار کیفیت سے اب تو نعم اور حبہ بھی چڑنے لگی تھیں۔ آخر اجیہ نے صرف اپنی پسند سے شادی ہی تو کی ہے۔ اس میں اتنا اوور ری ایکٹ کرنے والی کون سی بات ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

ان کی بات پہ بازغہ کے دل میں اک ہوک سی اٹھتی تھی۔ کاش کہ معاملہ یہیں تک ہوتا تو وہ کبھی پروا بھی نہ کرتیں۔ مگر یہاں تو پچھلی پچیس سال کی بساط ہی الٹ گئی تھی۔ ان لوگوں نے نہ جانے اجیہ کو کیا پٹی پڑھائی تھی کہ اس نے زوار سے ہی شادی کرلی تھی۔ اور اس سے بھی بڑی الجھن کی بات یہ تھی کہ اجیہ نے اگر زوار سے مہینے بھر سے نکاح کر رکھا تھا تو اس دوران اس کا رویہ بازغہ کے ساتھ تبدیل کیوں نہیں ہوا تھا؟ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں تھی کہ "حسن ولا" کے مکینوں نے اس کی ہر غلط فہمی دور کرنے میں مدد نہ لگایا ہوگا اور سچائی جاننے کے بعد اجیہ نے گزشتہ برسوں کی ہر بات بھلا دی ہو مگر دو دن پہلے بھی جب اس کا فون آیا تھا تو وہ صرف گھبرائی ہوئی تھی۔ ان سے اکھڑی ہوئی نہ تھی اور یہ کوئی عام بات نہیں تھی۔

اس نقطے پہ وہ جتنا غور کرتی جا رہی تھیں، اتنی ہی ان کے دل میں کھٹک بڑھتی جا رہی تھی۔ یقیناً "کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ مگر ان کی مجبوری تھی کہ وہ اس گڑبڑ کا سراغ اتنی دور بیٹھ کے بنا کسی کی مدد کے نہیں لگا سکتی تھیں۔ جبکہ پاکستان جانا سب کے کان کھڑے کرنے والی بات تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ان کے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا۔ انہیں بڑے صبر سے اجیہ کی دوبارہ کال کا انتظار کرنا تھا۔ بشرطیکہ وہ دوبارہ کال کرتی۔

☼ ☼ ☼

زوار آفس سے آکر فریش ہونے کے بعد لاؤنج میں آیا تو بہروز حسن اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کی اس حرکت پہ اس کی نظریں ماں کی جانب اٹھی تھیں۔ جو اسے مکمل طور پہ نظر انداز کیے ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ بے اختیار وہ اک گہری سانس لیتا صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔ ثانیہ خاموشی سے کارپٹ پہ بیٹھی سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔

"ثانی! بابا جان کی چائے ان کے کمرے میں دے آنا۔ وہ یہاں نہیں آنا چاہتے۔" ٹی وی سے نظریں ہٹاتے ہوئے جبین بظاہر ثانیہ سے مخاطب ہوئی تھیں مگر در حقیقت انہوں نے کسے سنایا تھا۔ زوار اچھی طرح جانتا تھا۔

رات اس کے جانے کے بعد جو بابا جان کی کیفیت ہوئی تھی۔ وہ بھی ثانیہ صبح اسے بتا چکا تھا۔ اس لیے وہ کچھ سوچتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ثانی! تم میری چائے بھی وہیں لے آنا۔ میں بابا جان کے پاس جا رہا ہوں۔" اس کی بات پہ جبین بیگم نے پہلو بدلا تھا مگر وہ ان دیکھا کیے اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

داؤد صاحب اپنے کمرے میں پرانے البم کھولے بیٹھے تھے۔ دستک کی آواز پہ ان کی نظریں دروازے کی جانب اٹھی تھیں لیکن جوں ہی زوار کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی نگاہیں ایک بار پھر البم پہ جما گئے تھے۔

"بابا!" اس نے آہستگی سے انہیں پکارا تھا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا، دوزانوں ان کے قدموں میں آبیٹھا تھا۔

"پلیز بابا! میری طرف دیکھیں تو۔" ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے وہ التجائیہ لہجے میں بولا تھا لیکن داؤد صاحب کی نظروں کے زاویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میں نے جو کچھ کیا ہے بہت سوچ سمجھ کے کیا ہے بابا میرا یقین کریں۔ میں خود سے وابستہ ہستیوں خاص طور پہ آپ کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ دھیمے لہجے میں بولا تو داؤد صاحب کے لبوں پہ اک دکھ بھری مسکراہٹ ابھری۔

"مگر تم مجھے بہت بری طرح تکلیف پہنچا چکے ہو زوار!" انہوں نے یک لخت اپنی نظریں اٹھاتے ہوئے زوار کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا درد بھرا شکوہ اسے لحظہ بھر کو خاموش کر گیا تھا۔

"بلکہ صرف تکلیف نہیں، تم نے میرے مان کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں جو یہ سمجھتا تھا کہ تم کبھی کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتے، تم نے میرے اس یقین کو توڑ ڈالا ہے۔ تم نے اجیہ کے دل میں پنپتی بد گمانیوں پہ یقین کی مہر لگا دی ہے۔ میں اب مرتے دم تک کبھی اس کا دل اپنے بیٹے کی جانب سے صاف نہیں کر سکوں گا۔ میں کبھی اسے یہ یقین نہیں دلا سکوں گا کہ میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں۔" بات کرتے کرتے ان کی آواز بھرا گئی تو زوار بے اختیار اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا گیا۔ اس میں تو کوئی شک نہ تھا کہ داؤد صاحب کے لیے یہ ساری صورت حال بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ اجیہ کو بے انتہا چاہتے تھے۔ فی الوقت وہ انہیں اگر اپنے مقصد کی گہرائی سمجھانا چاہتا ہے۔ تب بھی شاید نہیں سمجھا سکتا تھا۔

"بابا! کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے؟" ان کی جانب دیکھتا وہ دل گرفتی سے بولا تو داؤد حسن اک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولے۔

"میری معافی تو ان حالات میں بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی زوار! ہاں اگر تم میری اذیت میں کمی چاہتے ہو، یہ چاہتے ہو کہ تمہارا بوڑھا دادا سکون سے مر سکے تو میری ایک بات مان لو۔"

"آپ۔۔۔ آپ کہیں بابا۔۔۔ میں آپ کی بات کبھی نہیں ٹالوں گا۔" اس نے بے قراری سے ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تم اجیہ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل کر لو۔ اسے اپنی عزت بنا لو بیٹا!" اور ان کا مطالبہ سن کے زوار کسی بت کی طرح ساکت بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اجیہ کو آزاد کر دینے کی بات کریں گے اور ان کی خاطر وہ یہ بھی کر گزرنے کو تیار تھا کہ یہ سب کچھ اس نے اپنے خاندان کی خاطر ہی تو کیا تھا۔ مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے اسے 'اجیہ کو اپنانے کے لیے کہہ دیں گے۔ اس بات کا اسے اندازہ نہ تھا۔

"بابا۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"زوار! اگر تمہارے دل میں میری ذرا سی بھی عزت ہے تو تم میرا کہا نہیں ٹالو گے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے اس کے فرار کی ساری راہیں مسدود کر ڈالیں تو وہ یک ٹک ان کی جانب دیکھتے ہوئے لب بھینچ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں۔ میں اجیہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے تیار ہوں۔" چند کڑے لمحوں کے توقف کے بعد وہ اٹکتے ہوئے بولا تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی ثانیہ بھائی کی آواز پہ دم بخود اپنی جگہ پہ ساکت ہو گئی تھی۔ آن واحد میں ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹا! میرا مان رکھنے کے لیے بہت شکریہ میرے بچے۔" فرط مسرت سے جھک کر انہوں نے زوار کا سر چوم لیا تو اس نے مارے بے بسی کے اپنی آنکھیں ایک پل کو بند کر لیں۔

"لیکن بابا! اجیہ تو شاید کبھی نہیں مانے گی اور امی بھی اس بات کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گی۔" ثانیہ ہوش میں آتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھی تو داؤد صاحب کے چہرے پہ پرسکون سی مدھم مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اللہ نے چاہا تو وہ بھی مان جائے گی۔ رہے جبین اور بہروز تو مجھے یقین ہے وہ دونوں میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔"

اور ان کے مطمئن لہجے پہ ثانیہ بے اختیار بھائی کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔ جو نظریں جھکائے بے تاثر چہرہ لیے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا!" جبین کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔ "کیا وہ لڑکی آپ کو اتنی پیاری ہو گئی کہ آپ میرے بچے کی زندگی تباہ کرنے چلے ہیں۔ کیا آپ نجیب کا انجام بھول گئے ہیں؟؟"

سسر کی جانب دیکھتی وہ غصے سے بولی تھیں۔ ان کی بات پہ داؤد صاحب کے چہرے کا رنگ سرعت سے پھیکا پڑ گیا تھا۔ جبکہ بہروز حسن نے تیز نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

"جبین!"

"مجھے مت ٹوکیں بہروز! یہ بات کڑوی ضرور ہے۔ لیکن یہی سچائی ہے۔ اجیہ نجیب کا خون ضرور ہے۔ مگر اس کی پرورش ایک حرافہ کے ہاتھوں ہوئی ہے اور میں اتنی پاگل نہیں کہ ایک گری ہوئی عورت کی بگڑی ہوئی بیٹی کو اپنے بیٹے کی عزت تار تار کرنے کے لیے اس کی زندگی میں لے آؤں۔" وہ شوہر کی جانب دیکھتی تیز لہجے میں بولیں تو بہروز صاحب کی بھنویں تن گئیں۔

"مت بھولو کہ تمہارا بیٹا یہ کام اپنے ہاتھوں انجام دے چکا ہے جبین! اب ہم میں سے کوئی مانے یا نہ مانے اجیہ اس کی بیوی بن چکی ہے اور شرافت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ نبھائے۔"

"لیکن مجھے یہ رشتہ قبول نہیں زوار کو ہر حال میں اجیہ کو طلاق دینا ہو گی۔" وہ بنا کسی جھجک کے اٹل لہجے میں بولیں تو داؤد حسن کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا۔

"یوں نہ کہو بیٹا! اجیہ بھی ہماری اپنی بچی ہے۔ زوار نے جذبات میں آ کے جو غلطی کی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اثر اگر کسی کی زندگی پہ پڑا ہے تو وہ اجیہ ہے۔ تم خدارا معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایک غلطی زوار نے کی ہے۔ دوسری غلطی تم مت کرو۔" انہوں نے التجائیہ لہجے میں کہتے ہوئے بیٹے اور بہو کی جانب دیکھا۔

"تم لوگوں نے آج تک مجھے جو مان اور عزت دی ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ اللہ نے اس دور میں بھی مجھے اتنی سعادت مند اولاد اور جان چھڑکنے والے پوتے' پوتیاں دی ہیں۔ لیکن آج میں تم دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اجیہ کو اپنا لو۔ اپنے بوڑھے بابا کی اس آخری گزارش کو سن لو بیٹا! شاید اللہ تعالیٰ نے اس بچی کے اس گھر میں آنے کی یوں ہی سبیل بنا رکھی تھی۔ اس کے کھولے گئے راستے کو اپنے ہاتھوں سے بند نہ کرو۔ دیکھو میں تم دونوں کے آگے ہاتھ۔۔۔" انہوں نے بات کرتے ہوئے یک لخت اپنے ہاتھ جوڑ دیے تو بہروز حسن نے تڑپ کے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"خدا کا واسطہ ہے بابا! کیوں مجھے گناہ گار کرنے

ہیں۔ ٹھیک ہے آپ کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔ اجیہ ہماری ہو ہے اور رہے گی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے تو آنکھوں میں نمی لیے بے یقینی سے داؤد صاحب دھیرے سے مسکرا دیے۔ جبکہ جبین نے اپنے لب سختی سے بھینچ لیے تھے۔ ان کی کیفیت سمجھتے ہوئے بہروز صاحب نے نرمی سے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"جبین! تم جانتی ہو کہ بابا نے ہم سے زندگی میں پہلی بار کچھ مانگا ہے اور مجھ میں اپنے باپ کو خالی ہاتھ لوٹانے کا حوصلہ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح میرا ساتھ ضرور دو گی۔" اور ان کے اس درجہ مان پہ جبین بیگم کا ہر انکار ان کے اندر ہی دم توڑ گیا تھا۔ مارے بے بسی کے وہ یک لخت پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔ ان کے آنسو ان کی پسپائی کا اعلان تھے۔ بے اختیار داؤد حسن کا ہاتھ ان کے سر پہ آ ٹھہرا تھا اور ان کے دل نے گہرائی سے اپنے بچوں کی دائمی خوشیوں کی دعا مانگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں مر جاؤں گی مگر اس کمینے اور ذلیل انسان کے ساتھ کبھی زندگی نہیں گزاروں گی اور آپ لوگ ہوتے کون ہیں میرے لیے فیصلے لینے والے۔ ہاں۔۔۔؟؟" کف اڑاتی اجیہ نے خون آشام نگاہوں سے اپنے کمرے میں کھڑی عالیہ اور ممتاز کی جانب دیکھا۔

"تمیز سے بات کرو احسان فراموش لڑکی! بجائے اس کے کہ تم ہماری اور ہمارے بچے کی شکر گزار ہو کہ ہم اپنے بابا جان کے کہنے پر ہی سہی لیکن تمہاری زندگی برباد ہونے سے بچا رہے ہیں۔ تم ہمیں آنکھیں دکھا رہی ہو؟ ارے آج اگر ہم تمہیں ہاتھ پکڑ کے اس گھر سے باہر نکال دیں تو کبھی سوچا ہے تم نے کہ تم کہاں کھڑی ہو گی؟ اور کیا بگاڑ لو گی ہمارا؟ ہماری شرافت اور اچھائی کو ہماری کمزوری مت سمجھو اجیہ۔ کیونکہ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں' بلکہ تمہیں ہماری ضرورت ہے۔" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے عالیہ غصے سے بولیں۔

"اچھی طرح جانتی ہوں کہ کس کو کس کی ضرورت ہے۔ یہ نیکی' یہ خدا خوفی سب ایک چال ہے۔ اپنی دولت بچانے کی' مجھے محکوم بنانے کی۔ مگر میں آپ کی اس گھٹیا چال میں نہیں آؤں گی۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتی وہ شعلے برساتے لہجے میں بولی تو عالیہ کے لبوں پہ اک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

"سچ کہا ہے کسی نے 'ساون کے اندھے کو ہرا ہرا نظر آتا ہے۔' جیسی تم ماں بیٹی خود ہو' ویسے ہی تمہیں باقی لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ جھوٹے اور مکار' خواہشات کے مارے ہوئے۔ لیکن اگر تمہیں یاد ہو تو ہم نے یہ "چال" چلنے سے پہلے تم سے کہا تھا کہ اپنے ماموں ہماری بات کرواؤ' تاکہ تمہیں اس کے ساتھ بھیج دیں۔ لیکن تب شاید تم نے ہی انکار کیا تھا۔"

"ہاں کیا تھا۔ لیکن اب میں اپنی ماں کو ضرور فون کروں گی اور انہیں ہر وہ جھوٹ بتاؤں گی جو ان سے بولا گیا ہے۔" غصے سے چیخی۔

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہو گی۔ کم از کم ہماری اور ہمارے بچے کی جان تو چھوٹے گی۔" زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اچانک با آواز بلند ملازمہ کو پکارا تھا۔ جو ان کی ہدایت پر پہ لاؤنج سے کارڈلیس اٹھا لائی تھی۔ عالیہ نے ملازمہ سے فون لیتے ہوئے اجیہ کی جانب دیکھا۔ "یہ رکھا ہے فون' جس سے جی چاہے بات کرتی پھرو۔" وہ فون بیڈ پہ اچھالتی ممتاز کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اور پیچھے اجیہ بے یقینی سی کھڑی بند دروازے اور سامنے پڑے فون کو دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے۔ میں رخصتی کے لیے تیار ہوں۔"

رات میں عالیہ اور ممتاز اس کا حتمی جواب لینے کے لیے آئی تھیں۔ لیکن اس کا اقرار سن کے وہ دونوں ایک لمحے کے لیے حیران کھڑی رہ گئی تھیں۔ اس کا کھویا کھویا انداز اور بدلا ہوا فیصلہ دو ہی باتوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ یا تو بازغہ نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یا پھر اس نے اجیہ کو کوئی نئی پٹی پڑھائی

تھی۔ مگر وہ اسے کوئی تاثر دیے بنا باہر نکل گئی تھیں۔

اس کے مثبت جواب نے سوائے ایک داؤد صاحب کے پورے گھر میں کھلبلی سی مچادی تھی۔ حتیٰ کہ جب زوار کو بھی پہلے اس کے انکار اور بعد میں اقرار کے بارے میں پتا چلا تھا تو وہ بے اختیار سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اگر یہ سچ تھا کہ اجیہ نے ہر بات اپنی ماں کو بتادی تھی، تب تو یقیناً "رخصتی کا یہ فیصلہ ان دونوں ماں بیٹی کی کسی ملی بھگت کا نتیجہ تھا اور اگر ایسا تھا تو اجیہ نجیب نے اپنے حق میں بہت برا کیا تھا۔ کیونکہ وہ نجیب حسن نہیں، بلکہ زوار حسن تھا۔ جو اپنے دشمنوں کو کسی طور معاف کرنے کا قائل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ ایک بے حد شان دار تقریب میں زوار کے سنگ رخصت ہو کے بالکل نئے انداز میں "حسن ولا" میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے آنے پہ داؤد صاحب کی ہدایت کے مطابق سب ہی رسمیں پوری کی گئی تھیں مگر کوشش کے باوجود دولہا، دلہن سمیت کوئی بھی ان رسموں میں دل سے شریک نہ ہوسکا تھا۔ اجیہ کے وجود پہ چھایا سناٹا آج اپنے عروج پہ تھا۔ اس نے جب سے رخصتی کے لیے اقرار کیا تھا۔ وہ اس دن سے ہی گم صم سی ہو گئی تھی۔ دلہن کے روایتی لباس، زیورات اور خوب صورت میک اپ میں بھی اس کے چہرے کا خالی پن اور لبوں کی خاموشی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ لیکن جب رسموں کے اختتام پہ اسے زوار کے کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ تب اس کے چہرے کا بے تاثر پن شدید گھبراہٹ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سب کے جانے کے بعد سب سے پہلے اپنا حلیہ ٹھیک کرے گی۔ سج سنور کے کم از کم اس کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے اس گھر میں آئے آج ڈیڑھ ہفتہ ہونے کو تھا۔ اس دوران اس کا دوبارہ زوار سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

سب کے باہر جانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اپنے عکس پہ نگاہیں جمائے وہ ایک لمحے کے لیے پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی۔ آف وائٹ اور ڈارک گرین برائیڈل ڈریس میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اتنی کہ بے اختیار اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ کاش کہ آج یہ تیاری دلکشی کے حوالے سے کی گئی ہوتی تو اس کی خوشی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ مگر شاید وہ محبت کے معاملے میں شروع سے ہی بدنصیب رہی تھی۔ تب ہی تو اس کا دل کبھی حقیقی خوشی سے ہمکنار نہیں ہوسکا تھا۔

ڈبڈبائی نظروں سے اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کے اپنے جھمکے کو اتارنا چاہا تھا۔ جب اسے اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔

بے اختیار اجیہ کے ہاتھ لحظہ بھر کو ساکت اور نگاہیں سامنے آئینے کی جانب اٹھی تھیں۔ جو دروازے کے عین سامنے والی دیوار کے ساتھ ہونے کی وجہ سے پیچھے کا سارا منظر واضح کر رہا تھا۔ زوار کو دروازہ بند کرتا دیکھ کے اجیہ کا دل اچھل کے حلق میں آگیا تھا۔ مگر بظاہر وہ مضبوطی سے ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

لیکن جوں ہی زوار اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اجیہ کے لیے اپنی بے نیازی اور ہمت دونوں قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ جھمکے پہ ہاتھ رکھے وہ خوف زدہ نظروں سے آئینے میں ایک ٹک زوار کو دیکھے چلی گئی تھی۔ جو بلیک تھری پیس سوٹ میں پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا دھیرے دھیرے چلتا اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ وہ آج حقیقتاً "غضب ڈھا رہا تھا۔ لحظہ بھر کو دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پہ ٹھہری گئی تھیں۔

"جس کے لیے یہ روپ سجا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر تم کیسے اسے ہاتھ لگا سکتی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں تکتا وہ یک لخت سرد لہجے میں بولا تو اجیہ کے چہرے پہ پھیلا خوف مزید گہرا ہو گیا۔ اسی اثنا میں زوار نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پہ رکھتے ہوئے اسے ایک جھٹکے سے اپنے قریب کیا تو اجیہ کے لیے اپنی وحشت پہ قابو پانا مشکل ہو گیا۔

"چھوڑو! چھوڑو مجھے۔" اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ تڑپ کے اس سے دور ہٹنے کی کوشش میں سامنے ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکرائی تھی۔ اس کے ٹکرانے سے کتنی ہی چیزیں نیچے آگری تھیں۔ مگر وہ کسی بات کی پروا کیے بغیر خود کو سنبھالتی تیزی سے اس کی جانب گھومی تھی۔ جو اس سارے منظر کو بنا کسی حیرت کے محظوظ ہوتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اجیہ کے پلٹنے پہ اس کی حظ اٹھاتی نگاہیں اس کی متوحش آنکھوں سے آ ٹکرائی تھیں۔

"خاصا عجیب رد عمل نہیں ہے تمہارا؟ ویسے اس رخصتی کے لیے تم ہی نے ہامی بھری تھی نا یا پھر۔" وہ قصداً" بات ادھوری چھوڑتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

"کک۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے سہمی ہوئی نظروں سے زوار کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ ڈیر کہ کہیں "ممی" کے کہنے پہ تو تم نے یہ قدم نہیں اٹھایا؟" وہ گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا تو اجیہ کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"جو زہر تم میری زندگی میں گھول چکے ہو اس کے بعد تمہیں لگتا ہے کہ انہوں نے مجھ سے بات کی ہوگی؟" اس کی جانب دیکھتی وہ تلخ لہجے میں بولی تو زوار کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ آ کے غائب ہو گئی۔

"فی الحال تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن تمہارا سوال میں نے ذہن نشین کرلیا ہے اور اب تم بھی میری ایک بات دماغ میں بٹھالو۔" بات کرتے کرتے وہ یک لخت قدم بڑھا کے اس کے سر پہ آکھڑا ہوا تو اجیہ نے گھبرا کے پیچھے ہٹنا چاہا مگر زوار نے اس کا بازو بے رحمی سے جکڑتے ہوئے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور اجیہ کسی بے جان گڑیا کی طرح اس کے سینے سے جا ٹکرائی تھی۔

"مجھے نجیب حسن سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ کیونکہ جس دن مجھے یہ پتا چلا کہ تم نے مجھ سے اس معاملے میں کوئی چال چلی ہے۔ اس دن میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ بلکہ اس دن میں تمہیں تمہاری اصل اوقات یاد دلا دوں گا۔ میرے گھر والوں کے جذبات اور میری عزت کے ساتھ کبھی بھول کر بھی کھیلنے کی غلطی مت کرنا اجیہ نجیب حسن۔ کیونکہ اگر میں اپنے باپ دادا کی عزت کی خاطر تمہیں عزت بنا سکتا ہوں تو سوچ لو کہ میں اپنی عزت کی خاطر کس حد تک جاسکتا ہوں۔"

اس کی خوف زدہ آنکھوں میں تکتا وہ انتہائی سرد اور بے لچک لہجے میں بولا تو اجیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

"تم اس کمرے میں صرف بابا جان کی خواہش پہ لائی گئی ہو۔ اس لیے کوئی خوش فہمی پالنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری اتنی اوقات نہیں کہ زوار حسن تمہیں منہ لگائے، سمجھیں!"

اس کے وجود کو کسی حقیر شے کی طرح جھٹکتا وہ ڈریسنگ روم میں جا گھسا تھا۔ جبکہ پیچھے کھڑی اجیہ کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی عزت نفس کی دھجیاں بکھیر کے اس کی ذات کو دو کوڑی کا کر دیا ہو۔

"کیا اب اس کی زندگی کا آنے والا ہر لمحہ اتنی ہی تذلیل اور حقارت کی نظر ہونے والا تھا؟"

"کرب سے سوچتے ہوئے وہ بے اختیار اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

☼ ☼ ☼

رات کے تین بجنے کو تھے۔ مگر بازغہ کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ خلیل جہانگیر آج رات بھر گھر سے غائب تھے۔ لیکن بازغہ کو ان کی پروا نہ تھی۔ ان کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ بالآخر وہ تھک کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔ تازہ ہوا میں سانس لینے کا خیال انہیں بالائی منزل سے اتر کے داخلی دروازے کی جانب لے آیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کے باہر لان میں نکلیں۔ ان کی نظر تہ خانے سے آتی روشنی سے ٹکرائی تھی۔

وہ تہ خانے کی لائٹ بند کرنے کے ارادے سے

نیچے کو جاتی سیڑھیوں کی طرف آئی تھیں۔ لیکن آخری سیڑھی پہ انعم کو بیٹھا دیکھ کے وہ ٹھٹک گئی تھیں۔ اردگرد سے بے نیاز وہ ہتھیلی پہ کوئی چیز رکھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے ناک کے قریب لے جاکے سونگھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو بازغہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کررہی ہے۔ لیکن جوں ہی اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کے ایک چھوٹی سی تھیلی برآمد کرتے ہوئے اس میں سے سفید رنگ کا پاؤڈر اپنی ہتھیلی پہ ڈالا تھا۔ بازغہ کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھٹ گئی تھیں۔

”انعم!“ حلق کے بل چلاتے ہوئے وہ تیر کی طرح نیچے پہنچی تھیں۔ جھپٹ کر انہوں نے ایک ہاتھ سے اس سے وہ تھیلی چھینی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پہ تھپڑ رسید کرنے والی تھیں کہ اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

”اپنی حد میں رہیں اور ادھر دیں یہ پیکٹ۔“ سرخ آنکھوں سے انہیں گھورتے ہوئے وہ انتہائی غصے سے بولی تو بازغہ کا خون کھول اٹھا۔

”تمیز سے بات کرو۔“

”دیتی ہیں کہ نہیں؟“ ان کی بات نظرانداز کیے اس نے ان کی کلائی مروڑی تو بازغہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔ اس کی وحشت ناک گرفت اور چہرے سے ٹپکتے اشتعال نے بازغہ کو خوف زدہ کردیا تھا۔

انہوں نے تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ اس کے سامنے کردیا۔ انعم نے سرعت سے پیکٹ ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔

”دوبارہ میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔“ تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائے وہ ایک جھٹکے سے انہیں اپنے سامنے سے ہٹاتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

بازغہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی تھیں۔ ان کی بے یقین آنکھیں اوپر جاتی انعم کی جانب اٹھی تھیں۔ جو آخری سیڑھی پہ پہنچ کر ان کی طرف پلٹی تھی۔

”اور... پاپا کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ میں یہ گھر چھوڑنے میں منٹ نہیں لگاؤں گی۔“ ہلکے ہلکے ڈولتے ہوئے وہ رکھائی سے اپنی بات مکمل کرکے لڑکھڑاتے قدموں سے پلٹ کے آگے بڑھ گئی تھی اور پیچھے حق دق کھڑی بازغہ وہیں سیڑھی پہ بیٹھ گئی تھیں۔

انہوں نے بھلا خلیل جہانگیر کو کیا بتانا تھا۔ وہ تو خود ساری زندگی ایسے ہی الٹے سیدھے شوق میں پھنسے رہے تھے۔ لیکن ابھی کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹ رہا تھا۔

”او میرے خدا! میں کیا کروں؟“ بے اختیار انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ساری رات آنسو بہانے کے بعد اجیہ کی آنکھ لگے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ جب تیز روشنی نے اسے آنکھیں کھولنے پہ مجبور کردیا تھا۔ سر اٹھاتے ہوئے اس نے کمرے میں مندی مندی آنکھوں سے اردگرد دیکھا اور زوار کو جائے نماز پہ کھڑا دیکھ کے اس کا نہ صرف خون جل کے رہ گیا تھا۔ بلکہ آنکھیں بھی پٹ سے کھل گئی تھیں۔

تنفر سے ہنکارا بھرتے ہوئے اس نے غصے سے کروٹ بدلی تھی۔ مگر کھولن اتنی شدید تھی کہ اس کی ساری نیند اڑ گئی تھی۔ جل کر سیدھے ہوتے ہوئے اس نے آنکھوں پہ بازو رکھ لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے کھٹ پٹ سنائی دی تو وہ سمجھ گئی کہ زوار نماز پڑھ چکا ہے۔

”منافقوں کی نماز قبول نہیں ہوتی۔“ آنکھوں پہ سے بازو ہٹائے بغیر وہ تلخ لہجے میں بولی تو زوار جو ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اپنی جگہ پہ رک گیا۔ اس کی نظر صوفے پہ لیٹی اجیہ کی جانب اٹھی تھی۔ جو کب بیدار ہوئی تھی اسے پتا نہیں چلا تھا۔

”قبول کرنا نہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ ہاں لیکن بے

نمازیوں سے تو پھر بھی بہتر ہوں۔“ اس کے طنز پہ اجیہ نے ایک جھٹکے سے بازو ہٹاتے ہوئے زوار کی طرف دیکھا تھا۔ جو ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالتا ڈریسنگ روم میں غائب ہوگیا تھا۔

”ہونہہ! بڑا آیا نمازی۔۔۔ اللہ ایسے مکار اور ظالم لوگوں پہ لعنت بھی نہیں بھیجتا۔“ تلملا کر بڑبڑاتے ہوئے اس نے کھینچ کر کمبل سر تک تان لیا تھا۔

زوار چینج کرکے ٹریک سوٹ میں باہر آیا تو نظر بے اختیار ایک بار پھر صوفے کی طرف اٹھ گئی۔

”اگر اٹھ چکی ہو تو سن لو۔ تمہارا شوہر روزانہ اسی وقت اٹھنے کا عادی ہے۔ نماز کے بعد جوگنگ اور ایکسرسائز کے لیے جاتا ہے۔ جہاں سے اس کی واپسی گھنٹے کے بعد ہوتی ہے۔ واپس آکر وہ دو گلاس فریش فروٹ جوس پیتا ہے۔ جو روزانہ عذرا (ملازمہ) تیار کرتی ہے۔ مگر آج وہ اسے منع کردے گا۔ اس کے آنے تک تم جوس تیار رکھنا۔“

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہوکے بال بناتے ہوئے وہ بالکل نارمل لہجے میں گویا ہوا تھا۔ لیکن اجیہ کسی اسپرنگ کی طرح اچھلی تھی۔

”کیا؟؟“ اس نے حیرت سے زوار کی پشت کو گھورا۔ جو ہاتھ میں پکڑا برش واپس رکھتے ہوئے انتہائی سکون سے اس کی جانب پلٹا تھا۔

”میں نے کیا فرنچ بولی ہے جو تمہیں سمجھ میں نہیں آیا؟“ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اتنی سنجیدگی تھی کہ اجیہ چاہ کر بھی اسے کوئی جواب نہ دے سکی تھی۔ اس کی خاموشی پہ وہ بے نیازی سے چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

”ہمارے گھر میں ملازموں کی موجودگی کے باوجود کوکنگ گھر کی خواتین کرتی ہیں۔ اس لیے جوس بنانے کے بعد کمرے میں آنے کی ضرورت نہیں۔ کچن میں رہ کر ناشتا بنانے میں سب کی ہیلپ کرنا۔ اس کے علاوہ باہر نکلنے سے پہلے میرے کپڑے نکال کر اور کمرا سیٹ کرکے نکلنا۔ مجھے بے ترتیبی بالکل پسند نہیں۔“

پلٹ کر اسے چند اور احکامات سناتا وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بنا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا تھا اور پیچھے اجیہ اپنے گرد لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتے جال پہ لب بھینچ کے رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ثانیہ اور فاطمہ بیگم کی دونوں بیٹیوں اریبہ اور علینہ کے ساتھ خاموشی سے آکے کچن میں کھڑی ہوگئی تھی جو علی الصبح اسے وہاں دیکھ کے حیران تو ضرور ہوئی تھیں مگر انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔

اس سے پہلے جب وہ نیچے اتری تھی تو لاؤنج میں سب بڑوں کو نماز اور تلاوت میں مشغول دیکھ کے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔ وہ سب بھی اسے خلاف معمول اتنی صبح اپنے سامنے دیکھ کر چونک گئے تھے۔ سب کو نظرانداز کیے وہ آگے بڑھنے کو تھی۔ جب داؤد صاحب اور بہروز حسن کے شفقت سے پوچھے گئے حال احوال نے اسے رکنے پر مجبور کردیا تھا۔ مگر ان کے علاوہ کسی نے بھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی اسے کچن میں جانے سے ٹوکا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے عذرا سے مطلوبہ چیزوں کی جگہیں پوچھتے ہوئے زوار کے لیے جوس بنانے میں مصروف ہوگئی تھی۔ جو ٹھیک ایک گھنٹے بعد سب کے درمیان موجود تھا۔

اسے زوار کے لیے جوس لاتا دیکھ کے جبین بیگم کا چہرہ بے اختیار تن گیا تھا۔ مگر داؤد صاحب کی وجہ سے انہیں خاموشی اختیار کرنا پڑی تھی۔ جن کا چہرہ اس منظر پہ کھل اٹھا تھا۔

”میں ناشتے میں پراٹھا اور چیز آملیٹ لوں گا۔“ اس کے پلٹنے سے پہلے وہ اپنی سابقہ بے نیازی سے بولا تو اس نئی افتاد پہ اجیہ اپنا غصہ بھول بھال اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اسے کوکنگ نہیں آتی تھی۔ اسی پریشانی میں غلطاں وہ کچن میں چلی آئی تھی۔ جہاں گھر کی باقی لڑکیوں کو موجود دیکھ کر وہ خود کو کمپوز کرتی فریج کی جانب چلی آئی تھی۔ اس کے اندر آتے ہی وہاں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ جسے بری طرح محسوس کرتے

ہوئے اس نے فریج سے انڈے اور چیز نکال تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ انہیں لے جا کے سلیب پہ رکھتی، جبین تیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں اور اگلے ہی لمحے انہوں نے آگے بڑھ کے دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے چھین لی تھیں۔ ان کی اس حرکت پہ اجیہ سمیت تینوں لڑکیاں بھی ساکت رہ گئی تھیں۔

"اپنی اوقات میں رہو اور جا کے اپنے لیے ناشتا بناؤ۔ یہاں تمہارا کوئی نوکر نہیں لگا ہوا ہے۔" سب کے سامنے اس درجہ تذلیل پہ اجیہ کو اپنا چہرہ سرخ اور آنکھیں یکایک جلتی محسوس ہوئی تھیں۔

"خبردار! جو ایک آنسو بھی بہایا۔ مجھے صبح سویرے اپنے گھر میں کوئی تماشا نہیں چاہیے، سمجھیں!" اسے سخت لہجے میں باور کرواتیں وہ آگے بڑھ گئیں تو اجیہ خاموشی سے اپنے آنسو پیتی ناسمجھی کے عالم میں دوبارہ فریج کھول کے کھڑی ہو گئی۔

کاش حالات نے اسے اس قدر مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ کبھی اس رخصتی کے معاملے میں اپنا فیصلہ نہ بدلتی کسی قیمت پہ نہیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ تمہیں پتا تھا؟ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" حبہ کے منہ سے یہ بات سن کے کہ وہ انعم کے بارے میں جانتی تھی۔ بازغہ مارے جھلاہٹ کے چلا اٹھی تھیں۔

"مم۔۔۔ میں ڈر گئی تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے یہ بات کسی کو بتائی تو وہ نہ صرف صاف مکر جائے گی۔ بلکہ ساری بات بھی مجھ پہ ڈال دے گی۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی تو بازغہ نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"احمق لڑکی! ایسے کیسے مکر جاتی وہ۔" انہوں نے خفگی سے بیٹی کی جانب دیکھا۔ "کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ۔"

"پتا نہیں۔۔۔ مجھے تو تقریباً چھ ماہ پہلے پتا چلا تھا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"چھ ماہ! یا اللہ میں کیا کروں؟" بازغہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا تھا۔ انعم نہ جانے کب سے یہ زہر اندر اتار رہی تھی؟

"ممی۔۔۔ آپ کیا پاپا کو بتائیں گی؟" حبہ نے متفکر نظروں سے بازغہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہونہہ! اس آدمی کو بتا کر کیا ملنا ہے۔ میں خود اس بدبخت کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گی۔" انہوں نے تنفر سے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ یہ کریں گی کیسے؟" اور اس سوال پہ تو بازغہ کی پریشانی دوچند ہو جاتی تھی۔ وہ یہ تنہا کیسے کرتی۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☼ ☼ ☼

داؤد حسن کے کہنے پہ ولیمہ کی تقریب بھی رکھی گئی تھی۔ جس کے اگلے روز انہوں نے سب کو اپنے لاؤنج میں بلوایا تھا اور پھر سب کے سامنے انہوں نے ایک فائل اپنے برابر بیٹھی اجیہ کی گود میں رکھ دی تھی۔

"بیٹا! میرے نجیب نے جو کچھ کمایا تھا، وہ اس زندگی میں ہی اس کی آزمائش کی نذر ہو گیا تھا، مگر اس کی چھوڑی ہوئی کوئی بھی چیز میں تمہارے حوالے کرنے میں لمحہ نہ لگاتا۔ ہاں لیکن میرا سب کچھ اب تمہارا بھی تمہارا ہے۔ اس لیے میں نے اپنے حصے کی ساری جائیداد اپنی بیٹی کے نام کر دی ہے۔ امید ہے میری بیٹی کی ناراضی کچھ کم ہو جائے گی۔" اس کے سر پہ ہاتھ رکھے انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو نہ صرف اجیہ سمیت وہاں موجود ہر شخص بھونچکا رہ گیا۔

"لیکن بابا! آپ نے یہ۔۔۔" زوار نے متاسف لہجے میں کچھ کہنا چاہا تھا کہ داؤد صاحب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔

"میرا یہ فیصلہ آج کا نہیں ہے بیٹا اور اس بات سے سب واقف ہیں۔۔۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے بہت سوچ سمجھ کے اور اپنی خوشی سے کہا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم سب میرے اس فیصلے کا احترام کرو گے۔"

انہوں نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے سب کی طرف دیکھا تھا۔ بے اختیار زوار کی تلخ نظریں اجیہ کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ جو پھٹی پھٹی بے یقین آنکھیں اپنی گود میں پڑی فائل پہ جمائے بیٹھی تھی۔ اس کی بے بسی پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ زوار کے لبوں پہ آ ٹھہری تھی۔

"پتا نہیں بابا! آپ کا یہ فیصلہ ٹھیک ہے یا غلط۔ لیکن امید ہے کہ اس کے بعد "لوگوں" کو کم از کم یہ تو پتا چل گیا ہو گا کہ ہم کتنے لالچی اور برے ہیں۔" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ کاٹ دار لہجے میں بولا تو سر جھکائے بیٹھی اجیہ نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ گود میں رکھی فائل سینٹر ٹیبل پہ رکھتی، تیز قدموں سے باہر نکل گئی تھی۔

"زوار! کیا ضرورت تھی یہ بات کرنے کی؟" اپنے پیچھے اجیہ کو داؤد صاحب کی غصیلی آواز بہت واضح سنائی دی تھی۔ اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے اور وہ تقریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیاں طے کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم پکڑو اپنا دین ایمان۔" اجیہ اپنی سوچوں میں گم نجانے کتنی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں کھڑکی میں کھڑی تھی جب زوار کی تلخ آواز نے اسے بے اختیار چونکنے اور پیچھے پلٹنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

اس کے پلٹ کر دیکھنے پہ زوار نے استہزائیہ انداز میں بیڈ کے وسط میں پڑی فائل کی جانب اشارہ کیا تو اجیہ کی خالی نظریں پل بھر کو فائل پہ ٹھہر گئیں لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خاموشی سے چہرہ واپس موڑ لیا تھا۔ زوار نہ چاہتے ہوئے بھی چونک گیا تھا۔

"اپنی پیکنگ کر لو۔ ہمیں شام میں نکلنا ہے۔" سر جھٹکتے ہوئے زوار نے دراز میں پڑا چارجر نکالا۔

"کہاں؟" اس کی آواز پہ اجیہ پلٹنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"کراچی اور پھر آگے۔" وہ بنا اس کی طرف دیکھے گویا ہوا تو اجیہ کی الجھن بڑھ گئی۔

"کس سلسلے میں؟"

"ہنی مون کے سلسلے میں۔" وہ یک لخت اپنی نگاہیں اس کے چہرے پہ جماتا گمبھیر لہجے میں بولا تو اجیہ گڑبڑا گئی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے غصے سے بولی تو زوار دھیرے دھیرے چلتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے بلاوجہ کے نخرے بالکل پسند نہیں۔ ویسے بھی میں نے تمہیں صرف مطلع کیا ہے۔ تمہاری مرضی نہیں پوچھی۔ سیکنڈ! یہ ٹرپ بھی بابا کا ارینج کیا ہوا ہے اس لیے نو اگر مگر۔ اب جا کے پیکنگ شروع کرو۔ شام چار بجے فلائٹ ہے ہماری۔" اس کے چہرے کو تکتا وہ قطعی لہجے میں بولا تو اجیہ جو پہلے ہی خاصی الجھی ہوئی اور پریشان تھی، اس زور زبردستی پہ جھنجلا کے رہ گئی۔

تب ہی اسے کچھ یاد آیا تھا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ آج تو انیس تاریخ تھی۔ "اب۔ اب کیا کروں؟" اس نے پریشانی سے اپنا لب کاٹتے ہوئے سوچا۔

"کیا ہوا؟" اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نے زوار کو ایک بار پھر چونکا دیا تھا۔ مگر اجیہ سرعت سے خود کو سنبھالتی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"کچھ نہیں۔" اس کے جواب پہ زوار کی کھوجتی نگاہیں اجیہ کی پشت پہ جا ٹھہری تھیں۔ جو ڈریسنگ روم میں جا گھسی تھی۔

کچھ تو گڑبڑ تھی۔ کہاں؟ اس بات کا فی الحال اسے اندازہ نہیں تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر اس نے اس الجھن کا سرا بھی پا ہی لینا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب کی موجودگی میں اجیہ کو اپنی پریشانی دور کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ وہ ٹھیک تین بجے ایرپورٹ کے لیے گھر سے نکل گئے تھے اور سوا چار تک جہاز

فلائی کر گیا تھا۔ اس کی پریشانی چہرے سے عیاں تھی۔ لیکن زوار نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے اس پہ نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

کراچی پہنچ کے وہ ٹیکسی کے ذریعے سیدھا "ہوٹل" پہنچے تھے' جہاں داؤد صاحب نے ان کے لیے پہلے سے اریجمنٹ کروا رکھا تھا۔ اپنا خوب صورت کمرا دیکھ کر دونوں کے ہی اعصاب پہ خوش گوار تاثر پڑا تھا۔

فریش ہونے کے بعد زوار نے روم سروس سے کہہ کے کافی اور سینڈوچ منگوائے تھے۔ کیونکہ جہاز میں اجیہ نے کچھ نہیں لیا تھا۔ مگر جب وہ ان پر نظر ڈالے بغیر خاموشی سے صوفے پہ لیٹ گئی' تو زوار اسے ٹوکے بنا نہ سکا۔

"کس بات کا غم منا رہی ہو؟"

"اپنی بربادی کا۔" وہ اس کی طرف دیکھے بنا چیخ کر بولی تو زوار کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"اچھا! حالانکہ تم تو دن بہ دن خاصی آباد ہوتی جا رہی ہو۔" اس کے طنز پہ اجیہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مجھے دولت اور جائیداد کی ہوس ہے تو یہ بہت بڑی بھول ہے تمہاری' مجھے اپنے حق سے زیادہ کی نہ کبھی تمنا تھی اور نہ ہے۔ محبت کے یہ جھوٹے مظاہرے میرا دل تم لوگوں کی طرف مائل نہیں کر سکتے۔" اس کی طرف دیکھتی وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"ہمیں معلوم ہے اجیہ! تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں اگر اپنا خون بھی پلا دیا جائے تا تب بھی وہ آپ کے نہیں بنتے۔ اس لیے بے فکر رہو ہم نے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں پالی۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا تو اجیہ کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"میں جیسی بھی ہوں کم از کم سب کے سامنے ہوں۔ تمہاری طرح پیٹھ پیچھے پلاننگ کر کے دوسروں کی زندگیاں برباد کرنا مجھے نہیں آتا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ جہاں میری عقل ختم ہوتی ہے وہاں سے تمہاری مکاری شروع ہوتی ہے۔ میں تو آج تک نہیں سمجھ سکی کہ تم نے اس نقلی نکاح نامے پہ میرے سائن کیسے حاصل کیے تھے؟" اس کی بات پہ زوار کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"ویری سمپل۔ تمہیں وہ وکالت نامہ یاد ہے جو تم نے' رحمان صدیقی کو اپنا وکیل مقرر کرتے ہوئے سائن کیا تھا۔" اس نے اجیہ کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا تو اس کا سر میکانکی انداز میں اثبات میں ہل گیا۔

"بس میں نے اس کے اسسٹنٹ کو پیسے دے کر اس وکالت نامے کی ایک فوٹو کاپی کروائی تھی اور پھر اس فوٹو کاپی کو ایک پروفیشنل بندے کے حوالے کیا تھا جس نے تمہارے سائن بڑی آسانی اور مہارت سے اس نقلی نکاح نامے پہ کاپی کر دیے تھے۔" اس کی بے یقین آنکھوں میں دیکھتا وہ سکون سے بول رہا تھا۔ اجیہ اس درجہ ہوشیاری پہ پلکیں تک جھپکنا بھول گئی تھی۔

"اتنا بڑا فراڈ! اور وہ بھی صرف اس لیے کہ میں تمہارے بڑوں کو ان کی اصلیت دکھا دی تھی؟" حیرت کے سمندر میں غوطہ زن وہ زہر خند لہجے میں بولی تو زوار کے چہرے کے تاثرات خطرناک حد تک بدل گئے ہو گئے۔

"زبان سنبھال کے بات کرو۔ ان کی اصلیت یہ ہے اگر وقت نے کبھی ظاہر کر دی تو شاید تم خود سے بھی نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہو گی۔"

"ہاں ایسے ہی تو فرشتے ہیں نا۔ کتنے بے ضمیر ہو تم سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی مجھے آنے والے وقت سے ڈرا رہے ہو؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتی مارے غصے کے چلا اٹھی تھی۔

"آواز نیچی رکھو اجیہ!" زوار نے دھیمے لیکن سرد لہجے میں اسے وارن کیا تھا۔ مگر اس پہ تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔

"نہیں رکھوں گی' کیا کر لو گے۔ ہاں؟" وہ یک لخت اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس کے مقابل آ کھڑی

بولی تو اس درجہ بدتمیزی پہ زوار کا ضبط جواب دے گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور ایک نہیں بلکہ دو بار اجیہ کے چہرے پہ پڑا تھا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح دور جا گری تھی۔

"دوبارہ اگر تم نے اس لہجے میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی۔ تو یاد رکھنا اجیہ نجیب! مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" اس کے سسکتے وجود پہ کڑی نظریں جمائے وہ انتہائی غصے کے عالم میں اپنی بات مکمل کرتا کمرے سے باہر نکل گیا اور پیچھے اجیہ دونوں گھٹنوں پہ پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کے روتی چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"دیکھ لیں بہروز صاحب! بابا کے فیصلے کیا رنگ لائے ہیں۔ آج میرا بیٹا ان کی بدولت اس کمینی عورت کی بیٹی کو لیے ہنی مون پہ گیا ہے۔ رفتہ رفتہ زوار بھی نجیب کی طرح اس لڑکی کے حسن کا اسیر ہو جائے گا اور بازغہ کے قدم ایک بار پھر اس گھر میں جم جائیں گے۔" جبین کمزور سے لہجے میں پاس بیٹھے شوہر سے مخاطب ہوئی تھیں' جنہوں نے ان کی بات پہ ہاتھ میں پکڑی فائل نیچے رکھ دی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ زوار نجیب کی طرح کمزور نہیں۔"

"کمال ہے۔ آج آپ نے کیسے اس کی کسی خوبی کا اعتراف کر لیا؟" جبین کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"میں نے اس کی کسی خوبی سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ہاں مجھے اس بات کا اس سے گلہ تھا اور ہمیشہ رہے گا کہ اس نے اس گھر کا سب سے بڑا بیٹا ہونے کے باوجود اپنے بزنس کو نہیں سنبھالا۔ اس کی جاب کے علاوہ تم جانتی ہو کہ ہم دونوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ اجیہ والے معاملے میں مجھے شروع میں اس پہ بہت غصہ تھا۔ مگر بابا کی بات مان کے جس طرح اس نے اپنی غلطی سدھاری ہے۔ اس کے بعد مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں رہا۔" وہ ان کی طرف دیکھتے رسان سے بولے۔

"مگر مجھے ہے۔ اور میں اس کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔" بے تاثر لہجے میں کہتی وہ جائے نماز اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئیں تو بہروز صاحب نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے پاس رکھی فائل واپس اٹھالی۔

جبین کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئی تھیں اور جائے نماز بچھا کر عشاء کی نماز ادا کرنے کھڑی ہو گئی تھیں۔ تبھی ایک طرف رکھا فون بجا تھا اور پھر ایک تواتر سے بجنے کے بعد بند ہو گیا تھا۔

جبین نے سلام پھیر کے سی ایل آئی پہ نمبر دیکھا تو ایک لمبا سا نمبر جگمگا رہا تھا۔ جو اس بات کا غماز تھا کہ آنے والی کال پاکستان سے باہر کی تھی۔

بے اختیار ان کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہیں فون کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ پانچ منٹ بعد اسی نمبر سے فون دوبارہ بجا تو دوسری بیل پہ جبین نے فون اٹھا لیا۔

"کیا بات ہے بازغہ! کیوں فون کر رہی ہو؟" انہوں نے "ہیلو" کے بجائے انتہائی پرسکون لہجے میں کہا تو دوسری طرف ایک پل کو سناٹا چھا گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں' دوسری جانب سے لائن کٹ دی گئی تھی۔ اسی حرکت نے جبین کے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔

لیکن اس حرکت نے ان کا خون کھولا دیا تھا۔ یعنی یہ سارا کھیل ان کے اندازوں کے عین مطابق ان ماں بیٹی کی ملی بھگت تھا جبکہ یہاں اس لڑکی نے یہ تاثر دے رکھا تھا کہ زوار سے نکاح کے بعد اس کی ماں اور ماموں دونوں اسے چھوڑ چکے تھے اور اس کی واپسی کا ہر راستہ بند ہو چکا تھا۔

ان ماں بیٹی کی مکاری پہ ان کا دل چاہا تھا کہ جا کر ساری بات داؤد صاحب اور بہروز حسن کے گوش گزار کریں اور ان سے پوچھیں کہ اب کس کی زندگی برباد ہوئی ہے؟ ان کی لاڈلی کی یا پھر جبین کے بیٹے کی؟ مگر جانتی تھیں کہ اب اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔ ہاں لیکن اگر کسی پہ اس بات سے کوئی فرق

پڑ سکتا تھا تو وہ زوار تھا اور یہ سوچ کر انہوں نے اس کا نمبر ملانے میں لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

بازغہ نے فون بند کرتے ہوئے بے اختیار اپنے دل پہ ہاتھ رکھا تھا۔

یہ کیا ہو گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس نے انہیں کیسے پہچانا تھا؟ بے اختیار ان کی نظریں گھڑی کی جانب اٹھی تھیں۔ جہاں شام کے سات بج رہے تھے۔ یعنی پاکستان میں رات گیارہ بجے کا وقت تھا اور انہیں اچھی طرح یاد تھا انہوں نے اس کے ولیمہ کے اگلے روز رات گیارہ بجے فون کرنے کا بتایا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اجیہ انہیں کال کرے اور بل میں کسی باہر کی کال کی تفصیل مع نمبر کے آجائے۔ انہوں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ انیس تاریخ کو مقررہ وقت پہ کارڈ لیس اپنے پاس رکھے' تاکہ جب وہ فون کریں تو کال وہی ریسیو کرے۔ مگر وہ ایسا کیوں نہ کر سکی تھی اور فون کس نے اٹھا لیا تھا اور نہ صرف اٹھا لیا تھا بلکہ انہیں پہچان بھی لیا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ مگر اس بات نے انہیں خاصا پریشان کر دیا تھا۔ ان کا اتنی مشکلوں سے بننے والا کھیل کہیں بگڑ نہ جائے۔ انہیں شدید ٹینشن نے آن گھیرا تھا۔

اسی کشش وپنج میں مبتلا وہ مسلسل کمرے میں چکرا رہی تھیں۔ جب فون کی اچانک بیل پہ ان کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا وہ متفکر سی آگے بڑھیں۔

نچلا لب دانتوں تلے دبائے انہوں نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔ لیکن دوسری جانب جب جرمن زبان میں ان کا پتا دہرایا گیا تھا' تب انہوں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کال کرنے والے کو اثبات میں جواب دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد انہیں جو کچھ بتایا گیا تھا اس نے بازغہ کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ وہ بے اختیار اپنے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھے' قریب پڑے کاؤچ پہ گر گئیں۔

☼ ☼ ☼

اجیہ نجانے کتنی دیر تک اور کس کس بات پہ روتی رہی تھی۔ اور جب دل کا بہت سا بوجھ آنکھوں کے راستے بہہ گیا تو وہ نڈھال سی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

بہت دیر بعد اس کی خالی نگاہیں یونہی بھٹکتی ہوئی دیوار پہ لگی گھڑی پہ جا ٹھہری تھیں۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور اس نے مارے جھلاہٹ کے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"او میرے خدا میں کیا کروں۔"

ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے ایک بار پھر گھڑی کی جانب دیکھا۔ جہاں رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ یعنی اگر وہ ابھی بھی کسی طرح بازغہ کو فون کر دیتی تو کسی نئی مشکل سے بچ سکتی تھی۔ لیکن یہی تو مسئلہ تھا کہ وہ فون کہاں سے کرتی؟ تب ہی اسے ریسپشن کا خیال آیا تھا اور اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے باتھ روم میں جا کے اپنے چہرے پہ چھپاکے مارے تھے اور اپنا حلیہ درست کرتی پرس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

زوار کے ٹکرا جانے کا خوف حواس پہ سوار کیے وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جب لابی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ اچانک کسی سے جا ٹکرائی تھی۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ اس کے ہاتھ سے پرس بھی چھوٹ کے زمین پہ گر کے کھل گیا اس میں رکھی چیزیں ارد گرد بکھر گئیں۔

"سوری۔ ریئلی سوری بیٹا!" حالانکہ غلطی سراسر اس کی تھی۔ پھر بھی وہ انکل معذرت کرتے ہوئے نیچے جھک کر اس کی چیزیں اٹھانے لگے۔

"ڈونٹ وری انکل اوکے۔ میں اٹھا لوں گی۔" وہ شرمندہ سی پنجوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ اپنا پرس اٹھا کر وہ تیزی سے چیزیں اس میں رکھنے لگی تھی۔ تب ہی ان صاحب نے اس کے ٹکٹ اور بورڈنگ پاس اٹھائے تھے اور پھر جیسے لحظہ بھر کو ٹھٹک گئے تھے۔

"اجیہ نجیب۔" زوار نے چونکہ کہیں بھی اس کے نام کے ساتھ اپنا نام نہیں لگایا تھا۔ اسی لیے اس کے

ٹکٹ اور بورڈنگ پاس پہ اجیہ نجیب لکھا دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے۔

"بیٹا آپ نجیب حسن کی بیٹی ہو؟" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے انہوں نے نرمی سے پوچھا تو اجیہ چونک گئی۔

"جی۔" ان کی طرف دیکھتی وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی تو مقابل کا چہرہ کھل اٹھا۔

"ماشاءاللہ! کتنی بڑی ہو گئی ہو۔" انہوں نے آگے بڑھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اجیہ سٹپٹا گئی۔

"تمہارے پاپا اور میں بہت گہرے تھے بیٹا! بلکہ دوست کیا ہم تو بھائیوں سے بھی بڑھ کے تھے۔ خدا اسے غریق رحمت کرے۔" ان کی آنکھیں یکایک جھلملا اٹھیں تو اجیہ کو احساس ہوا کہ واقعی نجیب حسن کے خاصے گہرے دوست تھے۔

"اور تم سناؤ یہاں پاکستان میں کیا کر رہی ہو؟" وہ خود پہ قابو پاتے ہوئے بولے تو اجیہ جس کے ذہن پہ فون سوار تھا' بات کو سمیٹنے کے لیے مختصراً" بولی۔

"جی میری شادی ہو گئی ہے یہاں۔" اپنی جھونک میں اس نے یہ جملہ بول تو دیا تھا۔ لیکن اس سچائی کو پہلی بار لفظوں میں ڈھال کر اسے بڑا عجیب سا احساس ہوا تھا۔

"ماشاءاللہ۔ یہاں کراچی میں ہوتی ہو بیٹا؟" ان کے اگلے سوال پہ اجیہ اندر ہی اندر جھلا اٹھی تھی۔ مگر بظاہر وہ شائستگی سے بولی تھی۔

"نہیں اسلام آباد میں ہوتی ہوں۔ میرے تایا زاد سے میری۔۔۔" اس کے لیے جملہ مکمل کرنا ممکن نہ ہو سکا تھا۔ لیکن مقابل پہ حیرت کا اتنا شدید غلبہ ہوا تھا کہ وہ اجیہ کا یوں بات کو ادھورا چھوڑنا محسوس ہی نہ کر سکے تھے۔

"تمہاری شادی زوار سے ہوئی ہے؟ لیکن کیسے؟ میرا مطلب ہے تم اپنی ماں کو چھوڑ کے "حسن ولا" کیسے آگئیں۔ تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا بیٹا؟"

وہ بے یقین نظروں سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے بے ربط سے بولے تو اس عرصے میں پہلی بار اجیہ ٹھٹک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ یقیناً" گزرے ہوئے حالات کے بارے میں کافی کچھ جانتے تھے۔ یکایک اجیہ کو ایک خیال سوجھا تھا۔

"کیوں انکل! یہ آپ کو اتنا ناممکن کیوں لگ رہا ہے؟" ان کی جانب گہری نظروں سے دیکھتی وہ قصداً" دھیرے سے مسکرائی۔ تو ان کے چہرے پہ موجود حیرت دوچند ہو گئی۔

"ناممکن؟ یہ تو بہت بڑا معجزہ ہے بیٹا! ورنہ جو کچھ ہوا تھا اور جس دھوکا دہی سے بازغہ تمہیں نجیب سے چھین لے گئی تھی اور پھر ہمیشہ سب سے دور رکھا تھا۔ اس کے باوجود اگر تم نے سچ کو پالیا ہے اور اپنوں میں لوٹ آئی ہو تو بیٹا! یہ کسی انہونی سے کم تو نہیں۔"

اس کی جانب دیکھتے وہ بے یقینی سے مسکرائے تھے۔

"میں تو اس کے انصاف کا قائل ہو گیا ہوں۔ اس نے دیر سے ہی سہی' لیکن میرے دوست کے حق میں فیصلہ کر کے چچا جان کی اتنے سالوں کی تڑپ کا ازالہ کر دیا۔ خدا تمہیں اپنے گھر میں ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔"

انہوں نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کے اس کے سر پہ دوبارہ ہاتھ پھیرا۔ اجیہ کا دل تیزی سے ڈوب گیا۔ یہ وہ کس دھوکے' کس انصاف کی بات کر رہے تھے؟

"ان کی اصلیت کیا ہے اگر وقت نے کبھی ظاہر کر دی تو شاید تم خود سے بھی نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہو گی۔" یک لخت کچھ دیر پیشتر کا زوار کا کہا جملہ اس کے ذہن میں گونجا۔ اجیہ کے اندر بے چینی سے پھیل گئی۔ اس کے دماغ سے فون وغیرہ سب نکل گیا تھا۔ یاد رہا تھا تو صرف اتنا کہ شاید یہ موقع پھر کبھی نہ ملے۔

"سچ کہوں تو انکل! ابھی بھی میرے اندر ایسے بہت سے سوال ہیں جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ ہمارا ٹکراؤ یونہی نہیں ہوا!

تھا۔ آپ میرے خیال میں میرے والدین کی زندگی کے اس لیپے کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کردیں تو میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں گی۔" ان کی طرف دیکھتی وہ اٹکتے ہوئے بولی تو ان کے چہرے پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"تھوڑا بہت نہیں بیٹا! نجیب کے بعد ایک میں ہی تو تھا جو اس لیپے کے ایک ایک پل کا چشم دید گواہ تھا۔" ان کے انکشاف پہ اجیہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟" دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"غفار ملک۔ آؤ ہم کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" اور اجیہ ہر بات بھلائے کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

بازغہ دیوانہ وار گاڑی دوڑاتے اسپتال پہنچی تھیں۔ لیکن آگے سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ ان کی بیٹی نشے کی حالت میں اپنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ رش ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنی جان گنوا بیٹھی تھی۔ اس کرب ناک اطلاع نے ان کا دماغ ماؤف کردیا تھا۔ وہ حبہ کو خود سے لگائے پھوٹ پھوٹ کے روتی چلی گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سچائی تھی یا کوئی قیامت، جس نے اجیہ کے وجود سے اس کی روح ہی کھینچ لی تھی۔ کوئی عورت ہر روپ میں سراپا فریب کیسے ہوسکتی ہے اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"کون۔ کون تھا وہ آدمی۔؟" اس نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا تو غفار صاحب کے غمزدہ چہرے پہ نفرت سی پھیل گئی۔

"خلیل جہانگیر!" اور اجیہ نے مارے اذیت کے سختی سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ ہاں خلیل جہانگیر ہی وہ شخص تھا جو اس کی پھوپھی کا سابقہ منگیتر اور اس کے باپ کا مجرم تھا اور یہ احساس کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کو "پاپا" کہہ کے پکارتی رہی تھی۔ اس کا دماغ ماؤف کیے جارہا تھا۔ دکھ، غم اور اذیت سے اس کی روح تک چھلنی ہوتی جارہی تھی۔ وہ پچھتا رہی تھی۔ اسے اپنے مرحوم باپ پہ ترس آرہا تھا۔ جسے اس کی ماں نے دھوکا دیا تھا۔ اجیہ کو خود سے گھن آرہی تھی۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے زہر کھانے پہ مجبور کردیا تھا۔ لیکن اپنی ماں۔ اپنے محور و مرکز کے لیے اب اس کے اندر کوئی احساس بھی نہیں بچا تھا۔ اسے اس کی کل کائنات نے دھوکا دیا تھا۔ اس بھیانک انکشاف نے حقیقتاً اس کے وجود کو ختم کرڈالا تھا۔

اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ کیسے اس کی ماں نے اس کی عزت کی پروا کیے بنا اسے چند دن پہلے شہر چھوڑنے کا مشورہ دے دیا تھا اور وہ ان کی بات سن کے ہکابکا رہ گئی تھی۔ لیکن چونکہ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنی سچائی ان پہ ثابت کرنا چاہتی ہے اور اسے ان کی معافی کے ساتھ ساتھ مدد بھی درکار ہے تو وہ "محسن ولا" کے مکینوں سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے کر لوٹے گی اور ان کے درمیان رہ کر بازغہ کے کہے پہ چل کر انہیں ان کی ہر چیز سے محروم کردے گی۔ ان کے اس مطالبے نے اسے ساکت کردیا تھا۔ کسی کو دھوکا دینا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ نہ ہی اس بات کو اہمیت دی تھی کہ رخصتی کے بعد زوار اس پہ ہر طرح کا حق جتا سکتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا کی نظر میں وہ ایک شادی شدہ لڑکی کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ اسی لیے اگر رخصتی کے بعد وہ بحیثیت شوہر اس پہ کوئی حق جتاتا بھی ہے تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ ہوگی۔ ان کی بات پہ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ مگر انہوں نے اسے ولیمہ کے اگلے روز فون کرنے کا کہہ کے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

اور اجیہ جو ماں سے مدد کی امید لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے پاس سوائے رخصتی کے فیصلے پہ سر جھکانے کے دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ مگر اپنی ماں کے اس رویے کے بعد اسے چپ سی لگ گئی تھی۔ رہی سہی کسر داؤد صاحب نے اپنے حصے کی جائیداد اس کے نام کرکے پوری کردی تھی۔ وہ حقیقتاً الجھ گئی تھی۔ لیکن جو کچھ اب اس کے علم میں آیا تھا۔ اس نے تو اس کی پوری ہستی کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ غفار صاحب کے سامنے اس نے کیسے خود کو بکھرنے سے بچایا تھا، یہ وہ جانتی تھی یا اس کا خدا۔ مگر وہ ان سے ایک آخری احسان لے کے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جس کی بلیغار کرتے ہی اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ خود کو ملنے والے ہر دھوکے اور چھن جانے والے ہر رشتے پہ ٹوٹ کر روئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زوار نے تنے چہرے اور بھینچے ہوئے لبوں کے ساتھ موبائل بند کرتے ہوئے جیب میں ڈالا تھا۔ اجیہ سے بحث کے بعد وہ گھر سے نکل کر بے مقصد سارے شہر کی سڑکیں ناپتا پھر رہا تھا اور نجانے کتنی دیر تک اسی شغل میں مصروف رہتا اگر جبین بیگم کی کال اس کی مصروفیت میں خلل نہ ڈالتی۔

ماں کی بات سن کے وہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ اس کے اندر غصے کی شدید لہر کے ساتھ نجانے کیوں دکھ کی کیفیت بھی بڑی شدت سے جاگی تھی۔ اس کا خون مارے غصے کے کھول اٹھا تھا۔ آج اجیہ نجیب کو اس کے قہر سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنسو بہاتی اجیہ نے سختی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور پرس میں رکھا غفار صاحب کا موبائل نکالا تھا جو اس نے آخری احسان کے طور پہ ایک کال کے لیے ان سے مانگا تھا۔ بازغہ کا پرسنل نمبر ملاتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا تھا۔ چند سیکنڈ کے انتظار کے بعد دوسری طرف سے اسے بازغہ کی بھاری اور بوجھل آواز سنائی دی تو اجیہ کا جو جذبات کی شدت کے باعث سرخ اور تنفس تیز ہوگیا۔

"ہیلو!" اس کے بولنے کی دیر تھی کہ دوسری طرف بازغہ نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔

"ہیلو! ہیلو اجیہ!" بے قراری سے اسے پکارتی وہ زور زور سے رونے لگی تھیں۔ "اجیہ! انعم۔ انعم۔ ہمیں چھوڑ کے چلی گئی۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اجیہ!" اس اطلاع پہ اجیہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو گرنے لگے تھے۔ آج شاید واقعی انصاف کی رات تھی۔

"آپ۔ آپ کو پتا ہے مسز خلیل۔ آج میں بھی آپ کو چھوڑ کے چلی گئی ہوں۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بمشکل تمام بولی تھی۔ اسی وقت زوار دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تھا۔ اجیہ کی چونکہ اس کی طرف پشت تھی اس لیے وہ اسے اور زوار اس کے آنسو نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کے زوار کا دماغ گھوم گیا تھا۔ یہ موبائل اس کے پاس کہاں سے آیا تھا؟ اور وہ کس سے بات کررہی تھی؟ وہ قصداً دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔

"فرق صرف اتنا ہے کہ وہ زمین کے اندر چلی گئی ہے اور میں اپنی محبت گنوا کر اور اپنے واحد رشتے کی لاش لیے زمین کے اوپر کھڑی ہوں۔" بات کرتے کرتے وہ اچانک رو پڑی تو زوار چونک گیا جبکہ بازغہ کے آنسو ایک پل کو تھم گئے۔

"یہ۔ یہ کیسی باتیں کررہی ہو اجیہ؟" ان کے استفسار پہ وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"شکر کریں کہ میں بولنے کے قابل ہوں۔ ورنہ جب اس غیر آدمی نے مجھے میری ماں کی بدکرداری اور مکاری کی داستان سنائی تھی نا تب مجھے لگا تھا کہ اب میں کبھی ایک لفظ نہیں بول پاؤں گی۔"

"کس۔ کس کی بات کررہی ہو تم؟" بازغہ کی آنکھیں مارے خوف کے پھیل گئی تھیں۔

"غفار ملک کی بات کررہی ہوں۔ یاد ہے آپ کو یا اس واحد گواہ کو بھی بھول گئیں آپ؟" وہ تلخ لہجے میں گویا ہوئی تھی اور زوار کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ یہ غفار انکل اجیہ کو کہاں ٹکرا گئے تھے اور انہوں نے اسے پہچانا کیسے تھا؟ جبکہ دوسری طرف بازغہ کا دل اس تیزی سے ڈوبا تھا کہ انہیں بے اختیار پاس رکھے بینچ کا سہارا لینا پڑا تھا۔

"تم اس بند کرو اجی۔ میں کسی غفار ملک کو نہیں جانتی۔ یہ آدمی یہ کہانی سب ان مکار لوگوں کی سازش

ہے۔ انہوں نے جان بوجھ کر اسے گھر بلوایا ہے تاکہ تمہیں۔۔۔"

"ایک عجیب بات بتاؤں مسز خلیل! میں اس وقت اس گھر میں تو کیا اس شہر میں بھی نہیں ہوں۔ میں ایک اجنبی شہر کے ایک اجنبی ہوٹل میں ہوں۔ وہاں اس انجان آدمی سے میری ملاقات بالکل اچانک ہوئی تھی۔ پہچان کا مرحلہ بھی بڑے عجیب طریقے سے طے ہوا تھا اور گفتگو بھی بڑے حیران کن طریقے سے آگے بڑھی تھی۔ اس سب کے پیچھے پتا ہے کس کا ہاتھ ہے؟" ان کی بات کاٹتے ہوئے وہ یک لخت عجیب سے انداز میں گویا ہوئی تو دوسری طرف بازغہ کو سانپ سونگھ گیا۔

"اس کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے، جس کا خوف آپ کو اپنے شوہر کی عزت داؤ پہ لگاتے ہوئے بھی نہیں آیا، جس کا ڈر آپ کو تب بھی محسوس نہ ہوا جب آپ نے خود کو بچانے کے لیے بے راہ روی کا الزام اپنے شوہر پہ لگا دیا تھا۔ جس کی موجودگی کا احساس آپ کو تب بھی نہ ہوا تھا جب آپ نے مجھے میرے باپ سے چھین کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میرے سامنے میرے باپ کی کردار کشی کرتے ہوئے بھی وہ آپ کو یاد نہ آیا تھا۔ میں نے آپ کے سامنے ساری زندگی باپ کی محبت کو ترستے ہوئے گزار دی۔ آپ کو تب بھی اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ مگر "وہ" آپ کو ہر ہر لمحہ یاد رکھے ہوئے تھا مسز خلیل۔۔۔ اور آج اس کی جانب سے آپ کو ملنے والی مہلت کی حد ہونا تھی، تب ہی یہ انہونی وقوع پذیر ہوئی ہے۔ اس نے آپ سے ایک نہیں، بیک وقت دو اولادیں چھینی ہیں۔ ایک نیک اور چاہنے والے شوہر کو چھین کر ایک بدکردار اور بدقماش آدمی ساری زندگی کے لیے آپ کے سر پہ مسلط کر دیا ہے۔ یہ سزا نہیں تو اور کیا ہے؟"

شدت جذبات سے اس نے یک لخت بلند آواز میں استفسار کیا تو جہاں بازغہ کی سسکی نکل گئی وہیں زوار اپنے رب کی حکمت اور دانائی کا قائل ہو گیا۔ بے شک وہ سب سے بڑا منصف ہے۔ اس نے جس طرح ایک باپ کی سچائی ایک بیٹی پہ عیاں کی تھی، اس بارے میں تو زوار نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

"آپ نے تو میری عزت تک کی پروا نہ کی۔ میرے سچائی بتانے پہ میری مدد کے بجائے مجھے رخصتی کا مشورہ دے دیا تاکہ میں آپ کے اشاروں پہ چل کے ان بھلے لوگوں کو بدلے کے نام پہ لوٹ سکوں۔ تب میرا دل پہلی بار آپ کی طرف سے خراب ہوا تھا۔ کوئی ماں اتنی بے حسی کا مظاہرہ کیسے کر سکتی تھی؟ میں نے رخصتی آپ کے کہنے پہ نہیں، بلکہ آپ کی طرف سے دل برداشتہ ہو کے کروائی تھی کہ اس کے علاوہ میرے پاس حقیقتاً کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ مگر دیکھ لیں اس عزتوں کے رکھوالے نے نہ صرف میری عزت کی حفاظت کی بلکہ ان سب کی اور اس شخص کی سچائی بھی مجھ پہ واضح کر دی۔۔۔ میں واقعی ان سب کی گنہگار ہوں۔ میں نے ان کا بہت دل دکھایا ہے اور یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ آج کے بعد میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں۔ لوگوں کی مائیں ان کا غرور ہوتی ہیں۔ مگر آپ کا حوالہ زندگی کے ہر مقام پہ میرے لیے سوائے ذلت اور تکلیف کے اور کچھ بھی نہیں۔۔۔ سنا آپ نے مسز خلیل! کچھ بھی نہیں۔"

وہ آنسوؤں کے درمیان ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے بولی تو بازغہ کے رونے میں شدت آگئی۔

"میں آپ کو اپنے باپ اور اپنی ماں دونوں کے قتل کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ مرتے دم تک نہیں۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے دوزانو زمین پہ گر گئی تھی۔ اسے یوں بلک بلک کے روتا دیکھ کے زوار کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ تیزی سے دروازہ دھکیل کے اس کی جانب بڑھا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کے وہ اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

"اجیہ!" اسے پکارتے ہوئے اس نے نرمی سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو اپنے دھیان میں آنسو بہاتی اجیہ نے چونک کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے تھے اور اپنے سامنے زوار کو بیٹھا دیکھ کے وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ میں۔۔۔"

"شش۔۔۔ میں نے سب سن لیا ہے۔" اس کے شانے کو دھیرے سے دباتے ہوئے اس نے نرم لہجے میں کہا تو اس کی نظریں زوار کے چہرے پہ آٹھہریں۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر بلک کے رو پڑی تو زوار نے آہستگی سے اسے خود سے لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دو زوار! میں نے واقعی بابا اور سب بڑوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں۔۔۔ تم سب کی۔۔۔" آنسوؤں کی یلغار نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی اور اس کے سینے سے لگی وہ زار و قطار روتی چلی گئی تھی۔ زوار نے بھی اسے کھل کے رونے دیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے خود ہی اپنی عجیب سی پوزیشن کا احساس ہو گیا تھا۔

آہستگی سے آنسو صاف کرتی وہ شرمندہ سی اس سے الگ ہوتی سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ اس کے روئے ہوئے چہرے پہ خفت کے رنگوں نے ایک انوکھی کشش پیدا کر دی تھی۔ جس کے زیر اثر زوار کو اپنے دل میں وہی پہلی سی میٹھی میٹھی سی کیفیت کروٹیں لیتی محسوس ہوئی تھی۔

"میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ یہ رشتہ حالات کی وجہ سے قائم ہوا اور بابا کی وجہ سے آگے بڑھا۔ مگر اب میں مزید خود کو تم پہ مسلط نہیں کرنا چاہتی۔ نہ ہی میں سب کے درمیان جا کے رہنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ اس لیے پلیز مجھے آزاد کر دو۔ میں یہاں سے دور بہت دور چلی جانا چاہتی ہوں۔" نظریں جھکائے وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی تو زوار کے لبوں پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"یہی تو افسوس ہے کہ تم پہلے بھی کچھ نہیں جانتی تھیں اور اب بھی کچھ نہیں جانتی ہو۔ پہلے بھی تمہارے ہر درد کا درماں تمہاری دسترس میں تھا، مگر تم نے بنا رکھے صرف ایک طرف کی بات پہ آنکھیں بند کر کے یقین کیا۔ اور اب بھی تمہاری ہر تکلیف کا ازالہ تمہارے سامنے ہے، مگر تم اس سے منہ موڑ کے جانا چاہتی ہو۔"

"کیا مطلب؟" اس نے الجھ کر زوار کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ گھر چلتے ہیں۔ جہاں سب میرے تمہارے لوٹ آنے کے منتظر ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے تو اجیہ کے چہرے پہ اضطراب در آیا۔

"مگر میں۔۔۔"

"پلیز اجیہ اب اور نہیں۔ میں تم سے محبت کا دعوے دار تو نہیں، مگر بچپن سے تم سے مانوس ضرور ہوں۔ آنے والے وقت میں، میں نہ صرف تم سے محبت کا وعدہ کرتا ہوں بلکہ اپنی عزت اور وفا کا بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ اب کہو تمہیں یہ رشتہ منظور ہے کہ نہیں؟" اور اجیہ کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی صورت گرنے لگے۔

"ہے۔ دل و جان سے منظور ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھتی بمشکل تمام مسکرائی اور زوار نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ نرمی سے اسے خود میں سمیٹ لیا۔
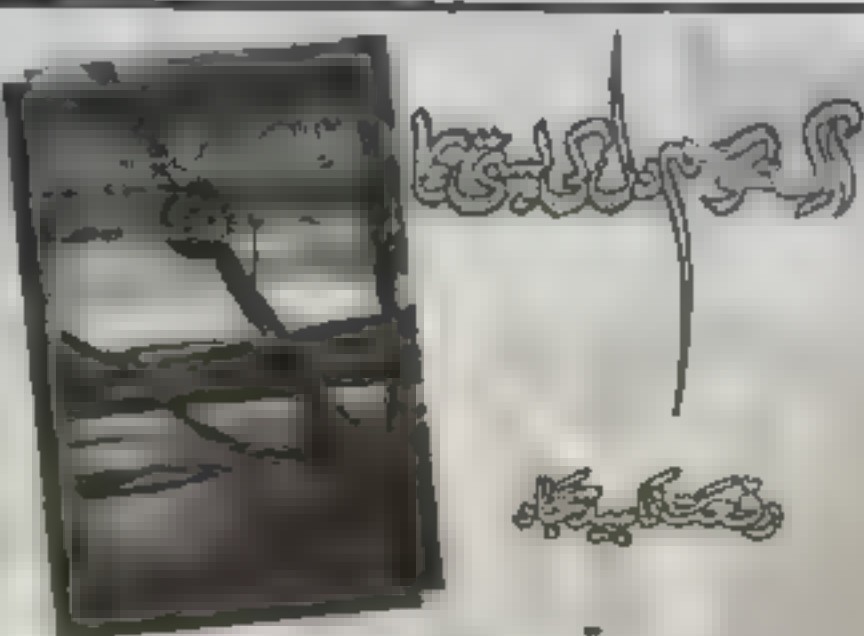
رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی، عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظمیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظمیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔
حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ مجبور ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔
وہاں اس کی نیت خراب ہو جاتی ہے۔ زبیر اسی مکان میں عاصمہ اور اس کی بے ہوش بیٹی اریبہ کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ بہت دیر بعد لٹی پٹی عاصمہ، اریبہ کو اٹھائے باہر نکلتی ہے۔ وہیں اسے عدیل مل جاتا ہے۔ عدیل اچھے وقتوں میں لیے گئے پلاٹ کی فروخت کے سلسلے میں ادھر آتا ہے اور راستہ بھٹک جاتا ہے۔ عدیل ہمدردی میں عاصمہ کو اس کے گھر تک چھوڑنے جاتا ہے۔
بروقت مطلوبہ رقم نہ ملنے پر زاہدہ بیگم، فوزیہ کو طلاق بھجوا دیتی ہیں۔ نسیم بیگم کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ پر الزام لگا دیتی ہیں کہ وہ شوہر کے مرنے کے بعد بے حیائی پر اتر آئی ہے۔

چھٹی قسط

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں حمیدہ خالہ!" عاصمہ کے چہرے کا رنگ ایک دم سے فق ہو گیا۔ وہ بہت دیر بعد بول پائی تھی۔
"بی بی! میں خود سے جوڑ کر یہ کہانی نہیں کہہ رہی۔ سارا محلہ ہی باتیں کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے میں جانتی ہوں تمہارا مالک مکان جانتا ہے یا دو چار اڑوس پڑوس کے گھر اور جانتے ہوں گے کہ تم جلد سے جلد اپنا گھر خرید کر اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کسی چھت کا بندوبست کرنا چاہتی ہو۔ لیکن سارا محلہ تو نہیں۔ تم کل شام میں اس زبیر کی گاڑی میں بیٹھ کر گئیں اور رات میں... میں تو گہری نیند سو گئی تھی۔ کم بخت اس بار ڈاکٹر نصراللہ نے جو دوائی دی ہے مجھے معدے کی' اس میں نیند کی گولی بھی ڈال دی ہے اس نے۔ کھاتے ہی ہوش جاتے رہتے ہیں۔ مغرب کے بعد ہی سو گئی تھی۔ رات میں اچانک پیاس سے آنکھ کھلی تو پانی پینے باہر نکلی۔ اسی وقت تمہارے گھر کے آگے گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ یہ ساتھ تو دیوار جڑی ہے۔ میں نے تو صرف یہی سوچ کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا کہ پوچھوں' عاصمہ! گھر پسند آگیا۔ پر وہاں تو گاڑی چلانے والا کوئی اور ہی تھا۔ میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اوپر سے وہ مالک مکان کی بیوی بھی دیکھ رہی تھی۔ سامنے والی فردوس اپنے بیمار بچے کو چپ کرانے کے لیے صحن میں ٹہلا رہی تھی۔ اب بتاؤ! کون کون چپ رہتا' میں اگر نہ بھی بولتی تو؟" وہ نان اسٹاپ بولتے ہوئے بمشکل رکی تھیں۔
"زبیر بھائی کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ زبیر جیسے شیطان کو بھائی بولتے ہوئے جیسے اس کی زبان حلق تک کڑوی ہوئی تھی' یہ صرف وہی جانتی تھی۔
انہوں نے فون کر کے اپنے کسی دوست کو بلوایا... خود انہیں دیر ہو گئی تھی۔ پیچھے مین روڈ پر ہی اتر کر کار لے کر چلے گئے تو وہ صرف مجھے گھر کے آگے۔" عاصمہ بولتے ہوئے بھی جانتی تھی کہ اس کی کہانی کتنی کمزور اور بودی ہے لیکن اسے کچھ تو کہنا تھا۔ حمیدہ خالہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔
عاصمہ سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ وہ نظریں جھکا کر یونہی اپنے ناخن کھرچنے لگی۔

"بھئی! ہمارا کام تو تمہیں سمجھانا تھا۔ بلکہ سمجھو خبردار کرنا۔ خیر سے بچوں والی ہو۔ پھر اللہ بخشے تمہارے شوہر کے ساتھ تو ہمارا بہن بھائی والا رشتہ تھا۔ اسی کی لاج کھائے جاتی ہے۔ لوگ تمہاری طرف انگلیاں اٹھائیں گے تو کیا ہمیں خوشی ہو گی۔ دکھ سے رات سے سمجھو! میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے اور اوپر سے دن چڑھے پورے محلے میں چہ مگوئیاں۔ کوئی اور کہے تمہیں۔ میں نے سوچا خود ہی تمہیں جا کر نرم لفظوں میں سمجھاؤں... کم از کم عدت کے دن کتنی کے ہوتے ہیں۔ وہ تو عورت پر اس کے مرے ہوئے مرد کا حق ہوتا ہے... اور کچھ نہیں تو اس غریب کا یہ حق تو نبھا دو۔ باقی پھر جو تمہارے جی میں آئے ہم کرتا۔ ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے۔" کہہ کر چادر ٹھیک کر کے بغیر سلام دعا کے چلی گئیں۔
عاصمہ کا جی چاہا' وہیں زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ جہاں بیٹھی ہے' وہاں سے کبھی اٹھ ہی نہ سکے۔ یہ محلے کی وہ عورت تھی' جو جب بھی آتی' عاصمہ سے محبت و شفقت سے پیش آتی۔ جیسے عاصمہ کی ماں ہو۔ اس سے اپنے گھر کی بہوؤں کی بیٹیوں اور بیٹیوں کی ہر چھپانے والی اور نہ چھپانے والی بات کر جاتی اور آج اس کی نظروں میں جتنی حقارت اور ہلکا پن تھا عاصمہ کے لیے' وہ اس کے لیے ڈوب مرنے کو کافی تھا۔
پر کیا کیا جائے کہ ڈوب مرنا بھی تو آسان نہیں تھا۔ وہ تو سو بار مرنے کے طریقے سوچ چکی تھی۔ مگر پیروں میں پڑی چار زنجیریں۔
"مما! یہ حمیدہ آنٹی کو کیا مسئلہ تھا' جو اتنا اونچا اونچا آپ سے بولے جا رہی تھیں اور کس طرح کی باتیں کر رہی تھیں وہ۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا اور آپ پلیز! ان سے کہہ دیں' ہمارے گھر نہ آیا کریں۔ مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" واثق معلوم نہیں کب سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ حمیدہ خالہ کے جاتے ہی اس کے پاس آکر بولا۔
"تم کیوں چھپ کر باتیں سن رہے تھے۔ تمہیں یہ گندی عادت کہاں سے پڑ گئی؟" وہ الٹا اس کو جھڑکنے لگی۔
واثق حیران نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔
"مما! میں چھپ کر باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ خود اتنا اونچا بول رہی تھیں۔ سب کو صاف سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ اوپر والی آنٹی بھی کھڑکی میں کھڑی سن رہی تھیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔" پہلے وہ وضاحت دینے لگا۔ پھر اس نے بھی برملا اپنے جذبات کا اظہار کر ڈالا۔
عاصمہ نے کن انکھیوں سے اوپر مالک مکان کے پورشن کی ادھ کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اب وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ مگر کھڑکی کے کھلے ہونے کا مطلب تھا' کچھ دیر پہلے وہاں کوئی موجود تھا۔
انسان کبھی اتنا بھی مجبور ہو سکتا ہے' عاصمہ نے سوچا نہیں تھا۔ وہ دوبارہ سے واثق کو جھڑک نہیں سکی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے خود کو اور بھی چادر میں چھپانے لگی۔
"مما! کل آپ کو وہ گھر پسند آگیا تھا' جو آپ زبیر انکل کے ساتھ دیکھنے گئی تھیں؟" ماں کو خاموش دیکھ کر واثق کو وہ پوچھنے والی بات یاد آئی' جو وہ کل ماں کے آتے ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر عاصمہ کے عجیب و غریب رویے نے اسے کچھ پوچھنے ہی نہیں دیا تھا۔
وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔
"مما! آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔" وہ ماں کا کندھا ہلا کر اصرار سے بولا۔ عاصمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
"نہیں۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
"کیا نہیں... آپ کو اچھا نہیں لگا وہ گھر؟" وہ ناسمجھی سے بولا۔
"نہیں... بالکل بھی اچھا نہیں تھا وہ گھر اور اب تم مجھ سے مزید کوئی سوال' جواب نہیں کرو گے۔ جا کر اپنا ہوم

ورک کرواور دونوں بہنوں کو بھی کراؤ۔" وہ اب کے ذرا سخت لہجے میں بولی۔

"مگر مما! آج تو ہم اسکول ہی نہیں گئے۔ کل جو ہوم ورک ملا تھا، وہ ہم نے کل شام میں کر لیا تھا۔" دانق بولا۔ تو پڑھنے کو اور کچھ نہیں ہے؟ جاؤ! جا کر پڑھو کچھ۔ کرو جو دل کرتا ہے۔ مگر میرے سر پر کھڑے ہو کر یوں انکوائری نہیں کرو۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کریدتے رہتے ہو۔ زہر لگنے لگی ہیں مجھے تمہاری یہ عادتیں۔" وہ غصے میں بولی تو بولتی ہی چلی گئی۔

دانق کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے مزید کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا اور بند کر لیا۔ وہ سست روی سے اٹھ کر جانے لگا۔ اسے پھر سے کوئی خیال آیا تو رک گیا۔

عاصمہ آہستگی سے چادر ہٹا کر اپنی کلائی کو دیکھ رہی تھی۔

مما! وہ انکل زبیر آئیں گے آج؟" وہ وہیں رک کر پوچھ بیٹھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے اور مت نام لینا آئندہ اس شخص کا۔ ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تم یاد کرو گے۔ چلے جاؤ اب یہاں سے۔ دن بہ دن ڈھیٹ ہوتے جا رہے ہو۔ خود وہ مر گئے۔ میرے لیے یہ چار عذاب چھوڑ گئے اس سے اچھا تو میں بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئی ہوتی۔" وہ شدید غصے میں بولتی ہوئی خود ہی اٹھ کر اندر چلی گئی۔

دانق شاکڈ سا ماں کو یوں غصے میں چلاتے اور پھر جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

"مما کو کیا ہو گیا ہے انہیں اس طرح تو کبھی غصہ نہیں آیا۔ بلکہ مما کو تو کبھی بھی غصہ نہیں آتا تھا اور انہوں نے یہ کیوں کہا کہ اس انکل زبیر کا نام دوبارہ ان کے سامنے نہیں لوں؟ کیا مما کا ان سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ جھگڑا اگر کہیں ہو گا اور انکل نے تو بس پاپا کے آفس کی رقم مما کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروانی تھی۔ شاید اسی لیے گھر والا معاملہ آگے چلا گیا ہو۔ مجھے زبیر انکل سے فون کر کے بات کرنی چاہیے۔" وہ سوچتے ہوئے خود سے کہنے لگا۔

"لیکن اگر مما کو پتا چل گیا کہ میں نے زبیر انکل سے۔۔۔ اور حمیدہ خالہ بھی کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں۔ مما رات کو کسی اور انکل کی گاڑی میں واپس آئی تھیں۔" اسے اس نئی سوچ نے پہلے سے بھی زیادہ پریشان کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا ذہن اتنی بڑی گتھی سلجھانے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے سنیں باتیں امی کی عدیل؟ حد ہوتی ہے کسی بات کی بھی۔ امی اور عمران نے کیا نہیں کیا۔ اس سے زیادہ وہ کیا کرتے اور امی سے الٹا احسان مند ہونے کے شکریہ ادا کرنے کے کیسے اتنے برے انداز میں اتنی بڑی بات کہہ ڈالی۔" بشریٰ سخت غصے میں تھی۔ عدیل مثال کو پاس لٹائے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

بشریٰ کی طرف یوں دیکھنے لگا۔ جیسے اسے بشریٰ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"اور آپ نے بھی امی سے کچھ نہیں کہا۔ عمران اور امی کتنے شرمندہ ہوئے۔ چاہتے تو فوراً انہیں کوئی بھی سخت جواب دے دیتے۔ مگر یہ بات یوں کسی کو ذلیل کرنا ہماری فیملی کا شیوہ نہیں "آپ لوگوں کی طرح۔" وہ غصہ میں ہماری اور تمہاری کی حدود جتا گئی۔

عدیل کے ماتھے پہ بل سے پڑ گئے۔

"اچھا! اب تم مجھ سے حساب کتاب شروع کر دو۔ میرا دماغ پہلے ہی پچی ہو گیا ہے اس ساری بک بک سے۔ اور امی اس وقت کتنی حساس ہو رہی ہیں۔ تمہیں تو کم از کم اندازہ ہونا چاہیے۔ وہ بیماری کے تکلیف دہ مرحلے

سے گزری ہیں۔ پھر فوزیہ کو ملنے والی طلاق۔"

"معاف کیجیے گا۔ اس سارے میں کم سے کم میرا یا میری ماں بھائی کا کوئی قصور نہیں۔ پھر بھی بار بار آپ کی امی صاحبہ ہمیں قصوروار ٹھہرائے چلی جا رہی ہیں۔ میں نے سارا زیور دے دیا۔ عمران نے ساتھ ستر ہزار روپے دیے اور کیا کرتے ہم؟" وہ ماں اور بھائی کی ذلت کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔

"پلیز! اب تم اس ٹاپک کو چینج کرو گی یا نہیں؟" وہ چڑ کر بولا۔ مثال ڈری ہوئی نظروں سے باری باری کبھی بشریٰ کو دیکھتی اور کبھی عدیل کو۔ اس کا ننھا سا دل دھڑکنے لگا کہ جیسے ابھی مما پاپا میں لڑائی شروع ہو جائے گی اور۔۔۔ اسے لڑائی جھگڑے سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جان! لیٹ جاؤ نا۔ آپ کو نیند آ رہی ہے۔" عدیل نے اسے پکڑ کر لٹانا چاہا۔

"مما۔۔۔ پلیز پاپا سے لڑائی نہیں کریں۔" اس نے نرمی سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ بشریٰ کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"میں کر رہی ہوں لڑائی؟ جتنی مرضی تمہارے ساتھ جان مار لوں۔ تم بھی تو باپ اور دادی کی نکلو گی۔ کتنی محبت کرتے ہیں نانی اور ماموں۔ تمہاری ہر فرمائش منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کرتے ہیں اور تم پھر بھی ان ہی لوگوں کی سائیڈ لینا۔ ماں کو بھی برا بھلا کہنا۔" وہ غصے میں بغیر سوچے سمجھے بولتی چلی گئی۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں بشریٰ؟" عدیل کو بھی غصہ آ گیا۔

"میں پاگل ہو گئی ہوں؟ دوسروں کا قصور آپ کو نظر نہیں آتا؟ اور یہ ہماری اپنی بیٹی، کیسے جان سے پیاری ہے مجھے۔ اور مجھے کہہ رہی ہے کہ میں جھگڑا کر رہی ہوں۔ فساد ڈال رہی ہوں۔"

"سو۔۔۔ سوری مما! میں نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ پلیز سوری۔" مثال ڈر کر رو دینے کو تھی۔

"جاؤ یہاں سے دادی اور باپ کی چمچی! پہلے ان کی فیور کرتی ہو پھر میرے ساتھ ڈرامے کرتی ہو۔" بشریٰ غصے میں بالکل بے قابو ہو رہی تھی۔

"بشریٰ! تم ہوش میں تو ہو ناں۔ بچی کے ساتھ کس لہجے اور زبان میں بات کر رہی ہو۔ اس نے تم سے ایسا کیا کہہ دیا ہے۔ صرف یہی تو کہا ہے کہ جھگڑا مت کرو۔" عدیل کو بھی غصہ آ گیا وہ مثال کو اپنے ساتھ لگا کر بولا۔

"میں جھگڑتی ہوں۔ میں لڑائی کرتی ہوں۔ آپ کی ماں اور بہن کچھ نہیں کرتیں؟" وہ اور بھی غصے میں چلانے لگی۔ عدیل کو بھی شدید غصہ آ گیا۔

"چلاؤ مت۔ امی اور فوزیہ کو بیچ میں کیوں گھسیٹ رہی ہو۔ ان کا یہاں کیا ذکر۔۔۔ اپنی بات کرو۔" وہ بھی بغیر سوچے سمجھے بولتا چلا گیا۔

"اپنی بات۔۔۔ میری بات رہ ہی کون سی گئی ہے۔ ہر بات میں میں تمہاری ماں بہن موجود ہوتی ہیں۔ انہوں نے ہمارا کچھ رہنے دیا ہی نہیں۔ ان کی خوشی سے جیو ان کی خوشی سے مرو۔ اس کی مرضی سے سانس لو۔ ان کی اجازت سے بولو۔ سب کچھ وہی دونوں تو ہیں۔ میں ہوں کہاں۔ نہ میری مرضی نہ میری خوشی۔ میری کسی بات کی بھی پروا ہے آپ کو۔ آپ کی ماں نے اتنی بڑی بات بول دی۔ میری امی دل کی مریضہ ہیں ان پر کیا بیتے گی۔ ایک لمحے کو بھی سوچا انہوں نے؟ ان کی بیٹی کو طلاق ہوتی ہے تو یہ اس کا نصیب۔ وہ چاہتی ہیں کہ ساری دنیا کی لڑکیوں کو طلاق ہو جائے۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔ میں تنگ آ گیا ہوں تمہاری اس بک بک سے۔ مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آتا تم چاہتی کیا

ہو۔ کون سی خوشی' کون سی مرضی تمہاری میں نے پوری نہیں کی۔ اس کے باوجود تم اس طرح کی بات کرو تو تم سے بڑا ناشکرا انسان اور کوئی نہیں ہے۔ یہ تو میرا حوصلہ ہے جو میں تمہیں' تمہاری اس ضدی فطرت کو اتنے سالوں سے برداشت کر رہا ہوں۔" عدیل کی کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

مثال اڑی رنگت اور خوف زدہ نظروں سے دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے بیڈ سے بھی اتر گئی تھی اور اب بیڈ کے کونے میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ وہ دونوں چیختے ہوئے ابھی ایک دوسرے کو اور پھر مثال کو پیٹنا شروع کر دیں گے۔

"تم مجھے برداشت کر رہے ہو۔ میری ضدی طبیعت کو تم برداشت کر رہے ہو؟" وہ جیسے کل ہو جانے کو تھی۔

"ہاں' تم جیسی عورت کو دنیا کا کوئی مرد برداشت نہیں کر سکتا سوائے میرے۔" وہ بھی دوبدو بولا۔

"تو مت کرو مجھے برداشت' چھوڑ دو۔ دفعان کر دو مجھے اپنی زندگی سے یہی چاہتی ہے نا تمہاری ماں کہ تم مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہاری زندگی سے اور اس جہنم جیسے گھر سے چلی جاؤں تو نکال دو مجھے' چھوڑ دو۔ تمہاری ماں' بہن کے کلیجے میں بھی ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ مجھے طلاق ہو جائے گی تو انہیں سکون مل جائے گا۔ بلکہ تم کیوں مجھے چھوڑو گے میں خود تم جیسے ماں کے غلام اور بہن کے اشاروں پر چلنے والے مٹی کے مادھو کو چھوڑتی ہوں اور میرے بعد اس گھر میں کوئی عورت اگر تمہارے ساتھ گزارہ کر جائے' تمہاری بدزبان بد اخلاق ماں بہن کو جھیل پائے تو میرا نام بدل دینا۔" وہ غصے میں بولتی اپنی الماری سے کپڑے نکال کر بیڈ پہ پھینکنے لگی۔

"کیا کہا تم نے۔ کیا بکواس کی تم نے ابھی۔۔۔ کیا سمجھتی ہو تم خود کو۔۔۔ اور میں تمہیں بتا رہا ہوں تم نے میری اجازت کے بغیر اس گھر سے کیا' اس کمرے سے بھی قدم باہر نکالا تو خدا کی قسم میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔ پھر تم مجھے الزام نہیں دو گی۔" وہ بھی غصے میں پاگل ہو گیا۔ بیڈ سے اچھل کر اس کے مقابل آکر کپڑے چھین کر پھینکتے ہوئے چلانے لگا۔

"تم مجھے چھوڑو گے؟ میں خود تمہیں چھوڑ رہی ہوں اور میں تمہیں ابھی اور اسی وقت یہاں سے جا کر دکھاؤں گی۔ تم قسم کھا رہے ہو تو اپنی ماں کے ہوتے پوری کرو میں بھی دیکھتی ہوں تمہیں۔۔۔ کتنا دم ہے تم میں۔" وہ ذرا نہیں ڈری۔ اسے میرے دھکا دے کر بیگ میں کپڑے ڈالتے ہوئے بولتی چلی گئی۔

"تم یہاں سے جاؤ گی؟" وہ خونخوار لہجے میں بولا۔

"ہاں' ہاں۔ میں جا رہی ہوں ابھی اور اسی وقت۔۔۔ اور میں دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ چلو مثال!" اس نے الٹے سیدھے دو چار جوڑے بیگ میں رکھے۔ بیگ کی زپ بھی بند نہیں کی اور مثال کا بازو کھینچتے ہوئے لے جانے لگی۔

"مثال کو تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتیں۔ چھوڑو اسے۔" وہ غصے میں مثال کو کھینچتے ہوئے بولا۔

"مثال میرے ساتھ جائے گی۔ میں اسے تمہاری پھاپھا کٹنی ماں بہن کے درمیان چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" وہ ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے جواباً" مثال کو کھینچتے ہوئے بولی۔

مثال دونوں کی کھینچا تانی سے پہلے تو ڈری پھر بے اختیار ہو کر رونے لگی' اسے اب دونوں کی کوئی بھی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"مما۔۔۔ مما' پاپا۔۔۔ پاپا۔" وہ روتے ہوئے بولنے لگی مگر وہ دونوں سن کب رہے تھے۔

عدیل نے ایک زوردار تھپڑ بشریٰ کے منہ پر جڑ دیا۔

"تم نے میری ماں بہن کو پھاپھا کٹنی کہا۔ تمہاری ماں۔۔۔ وہ کیسی ہے؟ مکار' جادوگرنی اور تم نے اپنی ماں جیسی۔" اس نے بھی ساری مروت' لحاظ درمیان میں سے اٹھا دیا۔

بشریٰ کو تو عدیل سے اس نو سالہ ازدواجی زندگی کے پہلے تھپڑ نے ہی ہلا کر رکھ دیا تھا کجا یہ خطاب۔ وہ تو جیسے گال پر ہاتھ رکھے ہی پتھر کی ہو کر رہ گئی۔

"اور تمہارے خیال میں میں اپنی بیٹی کو تمہاری اس عیار ماں کی صحبت میں جانے دوں گا۔ کبھی نہیں۔" اسے بشریٰ کے پتھر ہو جانے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح چلا کر بولا۔

"اب تو میں یہاں اس گھر میں ایک لمحہ کیا' ایک پل بھی نہیں رکوں گی اور مثال تو میرے ساتھ جائے گی۔ میں اسے بھی یہاں تم جیسے لوگوں کے درمیان نہیں چھوڑوں گی۔۔۔ آو مثال چلو میرے ساتھ۔" عدیل کے اس تھپڑ نے بشریٰ کے دل میں جو رہی سہی محبت کا احساس تھا' وہ بھی ختم ہو گیا۔

وہ بڑی مضبوطی سے آگے بڑھی اور مثال کا بازو کھینچ کر بولی۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ تم اس کمرے سے بھی قدم باہر نہیں نکالو گی۔" عدیل پھر سے اسے دھمکا کر بولا۔

"اور تمہارے خیال میں میں اب یہاں رکوں گی؟ میں جا رہی ہوں۔ تم سے جو ہو سکتا ہے کر لو۔" وہ اسے سامنے سے پرے دھکیل کر دروازے کی طرف جانے لگی۔

عدیل نے یوں دھکیلے جانے پر برافروختہ ہو کر اسے دیکھا۔

بشریٰ نے عدیل کو نہیں' اس کی مردانگی کو دھکا دیا تھا۔ دھتکارا تھا۔ وہ پھنکارتے ہوئے پلٹا اور بشریٰ کو بالوں سے کھینچ کر زور سے بیڈ پر کسی گیند کی طرح اچھال کر پھینک دیا۔ بشریٰ کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔

اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے بیڈ پر نہیں ہزاروں فٹ کی بلندی سے اچھال کر پھینکا ہو۔ اور اس کا جسم جیسے شیشے کا بنا تھا' ایک ہی جھٹکے میں چکنا چور ہو کر رہ گیا۔

اس نے ایک چیخ کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری اور پھر وہ گٹھڑی بنتی ہوئی چیختی چلی گئی۔

"ارے کیا ہو گیا۔ کیا قیامت آگئی۔ گھر کو تم لوگوں نے کیا اکھاڑہ سمجھ لیا' کس طرح جنگلی جانوروں کی طرح لڑ رہے ہو۔ غضب خدا کا' سارا محلہ تم دونوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں سن رہا ہے۔ شرم کرو۔ کل کے بچے ہو دونوں۔"

نسیم بیگم مسلسل بولتے ہوئے دروازہ پیٹتے ہوئے بولیں جبکہ دروازہ پہلے ہی کھلا تھا۔ ایک ہی جھٹکے سے پورا کھل گیا۔

اندر کا منظر کم از کم ان کے لیے واقعی کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔

مثال منہ کے آگے دونوں ہاتھ رکھے اپنی چیخوں کو روکتے ہوئے بھی روئے جا رہی تھی۔ عدیل کا شدید غصے میں لال بھبھوکا چہرہ اور بیڈ پر گٹھڑی بنی پیٹ کو دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑی بشریٰ دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں بند کیے چیختے جا رہی تھی جیسے اسے کوئی ذبح کر رہا ہو۔

نسیم بیگم کے قدم وہیں جیسے زمین کے ساتھ جکڑے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

باہر رات کالی تھی اور لمبی بھی بہت تھی۔

وہ بہت دیر سے ٹکٹکی باندھے اندھیرے میں روشنی کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی کہ شاید دن کی کرن کہیں سے

منور ہو مگر نہ رات ختم ہو رہی تھی نہ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔ بوسیدہ گھڑی کا پٹ رک رک کر بج رہا تھا۔ یہ اس گھر کا سب سے پرانا اور خستہ حال کمرا تھا۔ شاید کبھی اسٹور رہا تھا یا اس ٹائپ کی کوئی جگہ جہاں جب کوئی آلتو فالتو سارا سامان اکٹھا کر کے اس کمرے میں پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ بھی تو اس گھر کا آلتو فالتو سامان تھی۔ جب اس سامان کو استعمال کرنا ہوتا جھاڑ پونچھ کر گھر کے اندر رکھ لیا جاتا اور جب اس کی ضرورت تمام ہو جاتی اسے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ اس بوسیدہ کمرے میں پھینک دیا جاتا۔

اس نے خود بھی اس کمرے کی حالت سنوارنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اسے تو یوں بھی اب کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ نہ چیزوں کو سنوارنے میں نہ بگاڑنے میں۔ اس زندگی میں سب کچھ پہلے ہی کچھ اس بری طرح سے بگڑ چکا تھا کہ اس میں مزید بگاڑ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مگر یہ رات اتنی لمبی کالی سیاہ رات ختم کیوں نہیں ہوتی۔

وہ بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگائے اکڑ سی گئی تھی مگر لیٹی نہیں کیونکہ دیوار جتنی بے آرام تھی اس کا ٹوٹا پھوٹا بیڈ اور اس پر بچھا پرانا بستر اس سے بھی زیادہ بے آرام تھا۔

اسے دن کا انتظار اس لیے نہیں تھا کہ اس سیاہ رات کے بعد شاید ہی کوئی امید بھرا دن طلوع ہو گا۔ اسے تو بس اس کھیل میں مزا آتا تھا۔ گھنٹوں بیٹھی گھڑی کی آگے پیچھے بھاگتی دونوں سوئیوں کو دیکھتی رہتی اور بہت دیر بعد اسے احساس ہوتا کہ ٹائم تو گزر ہی نہیں رہا۔ وہیں ٹھہرا ہوا ہے۔

جیسے یہ رات!

اس بار مہینہ اکتیس کا تھا۔ یوں اسے یہاں پندرہ کی بجائے سولہ دن رکنا پڑ گیا۔

یہ اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں جانے کی مدت میں چوبیس گھنٹوں کی توسیع ہو گئی تھی۔ کل کا دن طلوع ہو گا اور جب شام کے بعد رات آئے گی تو اس کا سرا ایک اور ایسے ہی بے آرام کمرے میں ہو گا۔

اس کمرے میں گھٹن ہے بوسیدگی ہے اور ٹھہرے ہوئے پانیوں جیسا گدلا پن ہے۔

لیکن اس کمرے میں۔۔۔ اس کمرے میں ان تین چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے۔ خوف! اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔

☆ ☆ ☆

"حمیدہ خالہ۔۔۔ حمیدہ خالہ جلدی کریں۔ پلیز میرے ساتھ آئیں۔ دیکھیں پتا نہیں مما کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ اٹھ ہی نہیں رہیں۔ میری کوئی بات بھی نہیں سن رہیں۔" واثق حمیدہ خالہ کو بازو سے پکڑے کھینچتا ہوا گھر کے اندر لاتے ہوئے حواس باختہ سا کہے جا رہا تھا۔

"اے لڑکے! دم تو لینے دے مجھے۔ چپلیں تک تو نے مجھے ٹھیک سے پیروں میں پہننے نہیں دیں۔ آ رہی ہوں ذرا رک تو سہی۔ ایسی کیا آفت آ گئی۔" حمیدہ خالہ پریشان سی گھبراہٹ زدہ اس کے ساتھ کھنچتی چلی آ رہی تھیں اور کمرے تک پہنچتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئیں۔

کندھے سے ڈھلکتی چادر کو ٹھیک کرنا بھول کر وہیں کھڑی رہیں۔

عاصمہ کا سر تکیے سے لڑھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور دور سے نظر آ رہا تھا اس کی سانسیں بہت خفیف چل رہی ہیں۔

"آئیں نا۔ آ بھی جائیں۔ رک کیوں گئی ہیں۔" واثق انہیں یوں کھڑے دیکھ کر جھنجھوڑ کر بولا۔

"مما! مما۔۔۔ انھیں کیا ہوا ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آپ کو کیا ہوا ہے؟" واثق ماں کو ہلاتے ہوئے بے اختیار رونے لگا۔

ساڑھے گیارہ سال کا بچہ اس سے زیادہ ہمت نہیں دکھا سکتا تھا۔

حمیدہ خالہ تم صم آگے بڑھ کر عاصمہ کے سینے اور منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر آتی جاتی سانسوں کو ٹٹولنے لگیں۔

"جلدی سے جا۔ میرا بیٹا بشیر گھر پر ہی ہے۔ اس کو بلا کر لا۔۔۔ وہ کسی ایمبولینس کو فون کر کے بلائے گا ابھی سانسیں چل رہی ہیں۔ کیا کھا لیا اس نے۔۔۔ ان معصوم جانوں کا بھی تجھے خیال نہیں آیا عاصمہ!" حمیدہ خالہ بہتے آنسوؤں کو چہرے سے رگڑ کر روتے ہوئے بولیں۔

"ایمبولینس کو فون تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے نمبر پتا ہے اخبار میں آتا ہے' دادا نے مجھے بتا رکھا ہے۔" واثق جلدی سے کہہ کر ماں کے سرہانے پڑا سیل فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

"م۔۔۔ میری امی۔۔۔ بس وہ بے ہوش ہیں۔ بری کنڈیشن ہے ان کی۔ ایڈریس میں بتاتا ہوں۔ خالہ! آپ ایڈریس بتائیں انکل کو۔" اس نے کانپتے ہاتھوں سے سیل حمیدہ کو تھما دیا۔

حمیدہ خالہ خود کو سنبھالتے ہوئے بمشکل ایڈریس بتانے لگیں۔

فون بند کر کے وہ عاصمہ کو پھر سے جھنجھوڑنے لگیں۔

مگر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ اب تو اس کے منہ کے کنارے سے سفید جھاگ سی بھی نکلنے لگی تھی۔

"یا اللہ خیر۔ رحم فرمانا ان معصوموں پر۔ ان یتیموں کا کیا بنے گا اگر ماں بھی چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ تو رل جائیں گے۔ تو اس کی جان بخشی کرنا۔ اس کی حفاظت فرمانا' رحم کرنا۔" وہ گڑگڑا کر لبوں میں دعا مانگتے ہوئے پاس سہمی ہوئی کھڑی اریبہ اور ارشہ کے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

اسی وقت باہر ایمبولینس کے ہوٹر بجنے لگے۔

چند منٹوں میں ایمبولینس میں موجود عملے نے عاصمہ کو ایمبولینس میں منتقل کر دیا اور اس کے اندر اسے ابتدائی طبی امداد بھی دینا شروع کر دی۔

واثق اور حمیدہ ساتھ گئے۔
تینوں بچیوں کو حمیدہ نے اپنے گھر بھجوا دیا۔
عاصمہ کی پل پل بگڑتی حالت ان کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجائے جا رہی تھی۔
"ضرور کوئی بڑی بات ہوئی ہے، جو عاصمہ جیسی برداشت اور صبر والی عورت نے یہ آخری حد پار کی۔ یقیناً یہ ہوا ہے ایسا۔ وہ آدمی جو عرفان کا دوست تھا۔ جس کا روز کا آنا جانا تھا۔ عاصمہ نے سارے معاملات اس کے سپرد رکھے تھے۔ اب دو تین دن سے وہ غائب ہے۔ آخری بار جب شام میں یہ اس کے ساتھ گئی تھی اور رات گئے اس کے ساتھ واپس آئی۔۔۔ تو دروازے کی درز سے میں نے خود دیکھا تھا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ سی تھی اور چادر لباس مسلا ہوا۔ بال بکھرے ہوئے کہیں۔" وہ سوچتے سوچتے بے اختیار سینہ تھام کر رہ گئیں۔
اور خوف زدہ نظروں سے بے سدھ آخری منزل کو جاتی عاصمہ کو دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

اوٹی کے باہر ٹہل ٹہل کر عدیل کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔
وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس معمولی سے جھگڑے کو ان دونوں کا غصہ اس حد تک بڑھا دے گا کہ بشریٰ کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔
نسیم بیگم ابھی اتنی بڑی بیماری سے اٹھی تھیں۔ وہ خود اس پریشانی کو جھیلنے کی حالت میں نہیں تھیں مگر ضد کر کے وہ بھی عدیل کے ساتھ آگئی تھیں اور اب صوفے پر تھکی تھکی سی سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھیں۔
ذکیہ اور عمران بھی پہنچے تھے۔
"کیا ہوا۔۔۔ کیا ہو گیا بشریٰ کو؟ صبح تو میری بات ہوئی ہے! اچھی بھلی اس نے مجھ سے بات کی۔ کچھ بھی نہیں تھا اسے تو۔" ذکیہ تو سخت حواس باختہ تھیں۔
نسیم نے عدیل کی طرف دیکھا۔
"ہم نے تو بہن! گھر میں دو نوکرانیاں بھی لگا کر دے رکھی ہیں جو ہلکے بھاری سب کام کرتی ہیں۔ بشریٰ کو تو صرف کچن میں کھانا وانا ہی دیکھنا ہوتا ہے۔ اللہ جانے باتھ روم میں ٹب میں سرف میں کون سے کپڑے بھگو رکھے تھے کہ ایک دم سے پاؤں پھسلا اور۔۔۔"
وہ رونے لگیں۔
ذکیہ دل تھام کر رہ گئیں۔
"وہ۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے نا۔ کوئی زیادہ مسئلہ تو نہیں ہوا؟" وہ جانتی تھیں کچھ مسئلہ ہو چکا ہے۔ تب ہی تو دونوں ماں بیٹے کا رنگ اڑا ہوا ہے مگر پھر بھی خود کو دھوکا دینے کو پوچھنے لگیں۔ نسیم کچھ بول ہی نہ سکیں۔
"عدیل۔۔۔ عدیل بیٹے! تم کہاں تھے؟ کیوں تم نے اسے غسل خانے میں ایسا کام کرنے دیا۔" وہ دہائی دے کر بولیں۔
"سنتی کہاں ہے وہ کسی کی۔ جب کوئی کام کرنے پر اتر آتی ہے تو۔" نسیم نے دھیمے سے مجرمانہ لہجے میں کہا۔
"ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں۔" عمران نے عدیل سے پوچھا۔
"ابھی کچھ نہیں بتا رہے۔" وہ نظریں چرا کر ہولے سے بولا۔
بار۔ بار۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ کریہہ منظر آ رہا تھا جب اس نے وحشی جانوروں کی طرح بشریٰ کو اٹھا کر بیڈ پر پٹخا تھا جبکہ وہ اس کی کنڈیشن سے واقف بھی تھا۔

مگر پھر بھی جانے کیسے۔ شیطان نے اس غصے نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ اس کی عقل' دل' دماغ سب کو ماؤف کر دیا۔

اسے ایک لمحے کو بھی یاد نہیں آیا کہ اس غصے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح بھی وہ اس غصے کا انتقام خود اپنے آپ سے لے سکتے ہیں۔

وہ نڈھال سا صوفے پر گر گیا۔

بشریٰ کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ ان کا ناقابل تلافی نقصان ہو چکا ہے مگر پھر بھی خود کو دھوکا دینے کو اللہ کی رحمت کی امید پر وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا ہی چلا جا رہا تھا۔

"اس کا بچہ بچ جائے۔ اسے کچھ نہ ہو۔ بشریٰ ٹھیک ہو' وہ زندگی میں کبھی ایسی جہالت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ ایسا پاگل غصہ کبھی نہیں کرے گا۔ غصہ اسی لیے تو حرام ہے کہ سب سے زیادہ نقصان وہ کرنے والے کا کرتا ہے' میں یہ بات کیسے بھول گیا۔" وہ پیشانی مسلے جا رہا تھا۔

"مشال گھر پر ہے؟" ذکیہ کچھ دیر بعد بولیں۔

نسیم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دل میں شکر بھی ادا کیا کہ مشال گھر پر ہے ورنہ اگر وہ نانی کو اصل بات بتا دیتی تو ابھی کے ابھی اسپتال کو میدان جنگ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اسی وقت باہر کے برآمدے کی طرف سے شور سا اٹھا۔

اور کچھ لوگ ایک اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے دوسرے برآمدے کی طرف تیزی سے بھاگنے لگے۔

اسٹریچر عین عدیل کے پاس سے گزرا اور وہ لمحے کے آخری حصے میں شاکڈ سا رہ گیا۔

اسٹریچر پر بے ہوش حالت میں وہی عورت تھی' جسے اس رات اس نے اس ویران سوسائٹی سے لفٹ دی تھی اور وہ عجیب و غریب حالت میں اپنے گھر کے آگے ننگے پاؤں اتری تھی۔

ذکیہ اسٹریچر کے پیچھے گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد واپس آگئیں۔

"ہائے ہائے! غضب خدا کا۔ کیا زمانہ آگیا۔ قرب قیامت ہے اور کچھ بھی نہیں۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے واپس کر بولیں۔

"کون تھی یہ ذکیہ بہن! آپ کی کوئی واقف؟" نسیم ملامت سے بولیں۔ جانتی تھیں ہوش میں آنے کے بعد اگر بشریٰ نے سب کچھ بول دیا تو پھر کیا ہو گا۔

"چار بچوں کی ماں ہے۔ چند ہفتے ہوئے شوہر اور سسر کا ایک ڈکیتی میں قتل ہو گیا۔ بے چاری کسمپرسی میں زندگی گزار رہی تھی۔ اب اللہ جانے کیا افتاد پڑی کہ نیند کی گولیاں کھا لیں یا کوئی زہر پھانک لیا۔ ہمسائے تو یہی کہہ رہے ہیں کہ کھانے میں کوئی زہریلی چیز کھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب ڈاکٹرز کہاں ہاتھ میں ڈالیں گے ایسے کیس میں۔"

وہ پھر سے بیٹھ کر آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔

"یہ کم بخت ڈاکٹرز کچھ بتا کیوں نہیں دیتے آکر۔ عمران! تم جا کر کہیں سے معلوم تو کرو۔ میرا تو دل ہولے جا رہا ہے۔" وہ خیال آتے ہی پھر سے گھبرا کر بولیں۔

"امی! ظاہر ہے اور کوئی کچھ کیسے بتا سکتا ہے کہ ڈاکٹرز اندر بیٹھے ہیں۔ باہر آئیں گے تو کچھ بتائیں گے۔" عمران سستی سے بولا۔

اور عدیل تو جیسے کچھ سن نہیں رہا تھا۔

اس کا دھیان بار بار اسٹریچر پر پڑی اس نیم مردہ عورت کی طرف جا رہا تھا۔ چار بچے۔۔۔ بیوہ عورت' شوہر اور سسر کا قتل۔۔۔ اس رات اس کے ساتھ کیا بیتی' وہ شاید ابھی کوئی بھی نہیں جانتا۔۔۔ مگر میری چھٹی حس۔

اگر اس بے چاری کو بھی کچھ ہو گیا تو اس کے معصوم بچوں کا کیا بنے گا۔

جیسے مشال کا۔۔۔ اللہ نہ کرے' اگر بشریٰ کو کچھ ہو گیا تو میری مشال کا کیا ہو گا۔۔۔ باپ' دادی' نانی دوسرے رشتہ دار لاکھ جان نچھاور کرنے والے ہیں ماں سے بڑھ کر تو کوئی بھی نہیں۔ اللہ نہ کرے۔ میں ایسی بے ہودہ باتیں کیوں سوچ جا رہا ہوں۔" اس نے دل میں لاحول پڑھتے ہوئے پھر سے بشریٰ اور بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔

"وہ جو گیارہ بارہ سال کا بچہ اسٹریچر کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہ اس بے چاری کا اکلوتا بیٹا ہے اور سب سے بڑا۔ باقی تین چھوٹی بچیاں ہیں۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ اس کو کچھ نہ ہو۔ ورنہ اس کے بچے تو رل جائیں گے۔" ذکیہ اور نسیم باتیں کر رہی تھیں۔

اسی وقت او ٹی کا دروازہ کھلا اور دو لیڈی ڈاکٹرز باہر آگئیں۔ نسیم اور ذکیہ اپنے بھاری جسموں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پھرتی سے اٹھ کر ان کے پاس گئیں۔

ڈاکٹر صاحب! ہماری بچی۔۔۔ میری بشریٰ ٹھیک تو ہے نا؟ کیسی ہے اب اس کی طبیعت؟ اس کا بچہ تو ٹھیک ہے نا؟"

ذکیہ ایک ہی سانس میں پوچھتی چلی گئیں۔

عدیل اور نسیم دونوں پریشان نظروں سے ڈاکٹرز کو دیکھ رہے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے' مریضہ ٹھیک ہے۔ اس کی حالت اب تسلی بخش ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا۔

عدیل نے دل میں لاکھ بار شکر ادا کیا۔

"اور ڈاکٹر صاحبہ! بچہ۔۔۔ میرا مطلب ہے' وہ ٹھیک ہے ہر طرح سے۔" نسیم اٹک اٹک کر پوچھنے لگیں۔

دونوں ڈاکٹرز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ہمیں افسوس ہے۔ ہم بچے کو نہیں بچا سکے۔ اتنے عرصے کے بعد کنسیو (conceive) کیا تھا انہوں نے تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ تقریباً گیارہ ہفتوں کا حمل تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی۔ مگر شاید اللہ کو اس کی زندگی منظور نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب بشریٰ کو روم میں شفٹ کر دیں گے آپ ان سے مل لیجیے گا۔ ابھی بھی اسے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ پلیز ان کی کیئر فل۔ ابھی اسے بچے کے بارے میں نہ بتائیے گا۔ کم از کم آج کا دن رکیے۔" ڈاکٹر نرمی سے کہہ کر چلی گئیں۔

اور برآمدے میں جیسے موت کی خاموشی چھا گئی۔

عدیل بمشکل دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ سکا۔

نسیم اور ذکیہ بھی سناٹے میں رہ گئیں۔

اور عدیل کو لگا' وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکے گا۔ اپنے بچے کے قتل کے لیے وہ کبھی خود کو معاف نہیں کر سکے گا اور اگر بشریٰ نے بھی اسے معاف نہ کیا تو۔۔۔ وہ کیسے بشریٰ سے نظریں ملا سکے گا۔

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ نسیم عدیل کو دیکھے جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اسے لگا اس نے آج تک اس ونیس کے جتنے بھی پنسل اسکیچ بنائے ہیں' وہ بالکل بوگس اور بے کار ہیں۔ محض ردی سے کاغذ کے ٹکڑے۔

حقیقت میں تو وہ ویسی اس کے تصور اس کے خیال سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔

مگر نہیں۔۔۔ خوب صورتی سے زیادہ اس کے چہرے پر جو گہری اداسی اور آنکھوں میں ہلکورے لیتی دبیز خاموشی سارا جادو ان خاموش افسردہ آنکھوں اور اس گمبھیر چپ والے چہرے میں ہے۔

اس نے ایک کے بعد ایک اسکیچ نکالا۔ انہیں کئی کئی بار غور سے دیکھا۔ لیکن کوئی ایک خاکہ بھی اس اصل کے آس پاس نہ گیا جو وہ کچھ دیر پہلے دیکھ چکا تھا۔

اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر کے اس فسوں خیز اداس حسن کو سوچنا چاہا۔۔۔ اس کے لوچ دار جسم کی خوشبو اور اس کے اڑتے پیراہن کی باس اور اس کی نرم زلفیں! آہستگی سے اس نے سیاہ جلد والی ڈائری کھول کر اس بال کو نکال کر دیکھا جو اس نے کسی قیمتی خزانے کی طرح سنبھال رکھا تھا۔ وہ یک ٹک اس سنہری بال کو دیکھے جا رہا تھا۔

"ایسا کب تک چلتا رہے گا۔ میں اس کو اپنے اتنے قریب محسوس کرتا ہوں۔ جیسے وہ بالکل میرے سامنے اس کرسی پر بیٹھی ہو اور اسے شاید میرے احساس کی خبر تک نہیں۔۔۔ اور اگر اس بے خبری میں وہ مجھ سے دور بہت دور چلی گئی تو اس بھاری پتھر کی سی بوجھل زندگی کا بوجھ میں کیسے اٹھا پاؤں گا۔ پھر میرے پاس اس بے کار جیتے رہنے کا کیا جواز بچے گا۔"

وہ مغلوب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ آج ہی۔۔۔ یا کل۔۔۔ یا جب بھی وہ مجھے دوبارہ ملتی ہے۔ میں اپنے اس جنون کو روگ نہیں بننے دوں گا۔ وہ میری ہے۔ صرف میری اور اسے اس کا علم ہونا چاہیے۔" وہ ایک اسکیچ کو دیکھے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ نمبر ہے حمیدہ آنٹی! میں ڈائل کر دوں؟" واثق نے موبائل حمیدہ کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ حمیدہ نے چشمہ اتار کر موبائل کو قریب کر کے نمبر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"میرا بچہ! ملا دے ذرا جلدی سے۔" دونوں اسپتال کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ عاصمہ آئی سی یو میں تھی۔ ابھی تک ڈاکٹرز اس کی زندگی سے پر امید نہیں تھے۔

واثق حوصلہ دکھاتے دکھاتے بھی کئی بار حمیدہ کی گود میں سر چھپا کر رو چکا تھا۔

اس کا دل یہ سوچ کر ہی بند ہونے لگتا تھا کہ اگر مما بھی پاپا اور دادا کے پاس چلی گئیں تو وہ اکیلا تینوں بہنوں کے ساتھ کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا؟"

وہ بار بار حمیدہ کے کہنے پر ماں کی زندگی کے لیے بہت دعائیں مانگے جا رہا تھا۔

"حمیدہ آنٹی! بات کریں۔" اس نے شاید کال ریسیو ہونے پر سیل حمیدہ کے کان پر لگایا۔

"ارے! تو تم خود پہلے بات کر لیتے نا ماموں سے۔" حمیدہ خالہ فون کو ٹھیک سے کان سے لگاتے ہوئے بولیں۔

دوسری طرف ہاشم نے کال ریسیو کی تھی۔

حمیدہ نے اپنا تعارف کرانے کے بعد ہاشم کا پوچھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد حمیدہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئیں۔ ہاشم کو خدانخواستہ ہو جانے والے حادثے کے لیے کیسے تیار کرے۔

"اے ہاشم بیٹا! تم جس طرح بھی ہو سکے۔ جلد سے جلد پاکستان آ جاؤ فوراً" ہی۔" وہ یہی کہہ سکیں۔

"خیریت تو ہے نا آنٹی! عاصمہ تو ٹھیک ہے نا؟" ہاشم گھبرا کر بولا۔

حمیدہ خالہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"بس یہی سمجھ لو بچے! اس وقت اسے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ اس وقت بہت اکیلی ہے۔ اگر اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھو ورنہ۔۔۔" وہ صاف لفظوں میں کہہ نہیں پا رہی تھیں۔

"ورنہ کیا خالہ۔۔۔ پلیز! صاف بات کریں مجھ سے۔" ہاشم اور بھی پریشان ہو گیا۔

"واثق کہاں ہے؟ اس سے کہیں مجھ سے بات کرے۔ بلکہ عاصمہ سے بات کروائیں میری۔" اس نے حمیدہ خالہ کی باتوں اور انداز سے خائف ہو کر کہا۔

"وہ بچہ بے چارہ تم سے کیا بات کرے گا۔ خود کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے خود کو سنبھال رکھا ہے۔ پر ہے تو بچہ ہی نا! تم بس کسی بھی طرح جلد سے جلد آ جاؤ۔ عاصمہ کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔" وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بولیں۔

"میں آپ کی کوئی بھی بات بالکل نہیں سمجھ پا رہا۔ دو دن پہلے میری عاصمہ سے بات ہوئی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک تھی اور اس نے مجھے بالکل بھی آنے کے لیے نہیں کہا۔" وہ اب کے دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"تو میاں! حادثہ تو پل بھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ وہ مر جائے گی تو آؤ گے؟" وہ ایک دم سارا ضبط کھو کر بول پڑیں۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"وہ مر رہی ہے۔ ضرورت ہے اسے تمہاری۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسے تم بہنوئی کے جنازے کو کندھا نہ دے سکے تو بہن بھی۔۔۔ تمہاری۔۔۔ اس کے بچے تو اتنے سمجھ دار بھی نہیں کہ ماں کو آخری کندھا دے سکیں۔" حمیدہ کا خود پر ضبط کھو گیا۔ اس نے ہاشم کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

واثق بھی رو رہا تھا۔

حمیدہ خالہ نے بے اختیار اس چھوٹے سے معصوم بہادر بچے کو اپنی آغوش میں چھپا لیا اور دونوں رونے لگے۔ آئی سی یو کے اوپر ابھی تک سرخ بتی جل بجھ رہی تھی۔ حمیدہ خالہ واثق کو تھپکتے ہوئے اس بتی کو دیکھے جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

عدیل بشریٰ کے بیڈ کے پاس کھڑا تھا اور بشریٰ نے مستقل اس کی طرف سے رخ پھیر کر ماں کی طرف چہرہ کر رکھا تھا۔ عمران کے ساتھ بیٹھی نسیم نے بھی کئی بار مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ مگر بشریٰ نے ساس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

"یہ کم بخت ضرور بھانڈا پھوڑے گی۔ پھر اس کی فسادن ماں کیا طوفان اٹھائے گی؟ اسپتال میں تماشا لگانے سے بہتر ہے فی الحال گھر ہی چلا جائے۔" نسیم بیگم نے دل میں سوچا۔

وہ کئی بار عدیل کو بھی آنکھوں آنکھوں میں یہ سمجھانے کی کوشش کر چکی تھیں۔ مگر وہ تو ماں کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

"اور بھی جورو کا غلام ہو جائے گا یہ عدیل تو۔" وہ غصے میں بڑبڑائیں۔

"میرا خیال ہے ذکیہ بہن! اب تو بشریٰ کی طبیعت کافی بہتر ہے۔ آپ گھر چلی جائیں۔ کافی دیر سے آئی ہوئی ہیں۔ تھک گئی ہوں گی۔ میں اور عدیل ہیں نا بشریٰ کے پاس۔" نسیم نے محبت بھری نظروں سے بشریٰ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بشریٰ نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"ارے نہیں بہن! اللہ آپ کو زندگی دے۔ اتنی بڑی بیماری سے تو آپ اٹھی ہیں۔ آرام کی تو آپ کو ضرورت ہے۔ میرے خیال میں تو آپ گھر چلی جائیں۔ میں اور عمران ہیں بشریٰ کے پاس۔" ذکیہ نے نسیم کے دل کی بات

کہہ دی۔
نسیم تو فوراً" جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔
"ہاں! بہت دیر سے طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔ دوپہر میں تو دوائی لینا بھی بھول گئی تھی۔ دوا کی تو ڈاکٹر نے اس قدر تاکید کی ہے کہ کھانا کھانا بھول جاؤں' دوائی کھانا نہیں بھولنا۔ چلو پھر عدیل بیٹا! ہم چلتے ہیں۔ شام میں آجائیں گے۔ ذکیہ بہن اور عمران ہیں یہاں۔"
عدیل نے بشریٰ کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔
"ٹھیک ہے امی! میں آپ کو چھوڑ کر آجاتا ہوں واپس۔" عدیل نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔
"عمران! تم پلیز گھر جا کر ذرا مشال کو لے آؤ۔ اس سے ملنا ہے مجھے۔" بشریٰ روکھے لہجے میں عمران سے بولی۔
"ہاں تو اگر عدیل واپس آرہا ہے... تو وہ آتے ہوئے مشال کو لے آئے گا۔ تم مل لینا۔ بچی بھی ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گی۔" ذکیہ بھی فوراً" ہی بولیں۔
"میں نے کہا ناں عمران! تم جا کر مشال کو لے آؤ ابھی۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔" وہ نروٹھے پن سے عمران سے بولی۔
"اُفوہ آپی! عدیل بھائی جا رہے ہیں نا۔ لے آتے ہیں واپسی پہ مشال کو بھی۔ مجھے ابھی ایک ضروری کام کے لیے نکلنا ہے۔ گھنٹے بھر میں واپس آجاؤں گا۔" عمران کہہ کر عدیل سے پہلے اسپتال سے نکل گیا۔
عدیل اور نسیم بھی مزید بحث کیے بغیر عمران کے پیچھے نکل گئے۔
"تم باتھ روم سے کیسے پھسل گئی تھیں بشریٰ؟ تمہیں اپنی حالت کا پتا نہیں تھا کہ تمہیں کتنی احتیاط کی ضرورت ہے؟" ذکیہ ان دونوں کے جاتے ہی بولی تو بشریٰ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔
"باتھ روم سے۔" اس نے زیر لب دہرایا۔
"یہی بتا رہی تھیں نا تمہاری ساس اور عدیل... باتھ روم سے ہی پھسلی تھیں نا تم؟" ذکیہ کو بشریٰ کے چونکنے پر کچھ شک سا ہوا تو دہرا کر پوچھنے لگی۔
"امی! ڈاکٹر بچے کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ بچہ ٹھیک ہے نا؟" وہ کچھ بے چین سی ہو کر بولی۔
ذکیہ سے فوری طور پر کچھ بولا ہی نہ گیا۔
کیسے کہتی کہ جس بچے کی آس وہ ابھی تک لگائے بیٹھی ہے' وہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس سے روٹھ کر چلا گیا ہے۔ اس کی ساری دعائیں' سارے جتن بے کار گئے۔ وہ سوچتی رہ گئیں۔
"امی! آپ کچھ بول نہیں رہیں۔" وہ ماں کی خاموشی سے پھر سے بولی۔
"بشریٰ! تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔ تمہیں ڈرپ لگی ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہیں آرام کی بھی سخت ضرورت ہے میری بچی! اب اور کچھ نہیں سوچو۔ آنکھیں موند لو کچھ دیر کو۔" ذکیہ بیگم دکھی دل سے بیٹی کا سر سہلانے لگیں تو بشریٰ نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ماں سے اس جھگڑے کو شیئر نہ کر سکی جو اس کے اور عدیل کے بیچ بہت دوری لے آیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆ ☆ ☆

عاصمہ نے آنکھیں کھولیں تو لمحہ بھر کو جیسے ساکت سی رہ گئی۔
یہ تو اس نے نہیں سوچا تھا۔
اسے لگا یہ کوئی خواب ہے۔

اس کے سامنے نو سال پہلے باہر جانے والا بڑا بھائی ہاشم کھڑا تھا۔
وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔
ہاشم نے آگے بڑھ کر عاصمہ کے سر پر ہاتھ لگایا ہی تھا کہ وہ ایک دم سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔
اس کے اتنے مہینوں سے اندر رکے ہوئے گھٹے ہوئے آنسو بھائی کے محبت بھرے ہاتھ کا لمس پاتے ہی پھوٹ نکلے۔
ہاشم اسے جتنا سنبھالتا' جتنا سمیٹتا جا رہا تھا' وہ اتنی ہی بکھرتی جا رہی تھی۔
"میری بچی! بس کر ابھی تو تو موت کی دہلیز کو ہاتھ لگا کر آئی ہے۔ ابھی تو تیری حالت ایسی بھی نہیں کہ تو اٹھ کر بیٹھ سکے۔ یوں روئے گی تو خدانخواستہ تیری طبیعت بہت زیادہ نہ بگڑ جائے۔" حمیدہ کو آگے بڑھ کر اسے سنبھالنا پڑا۔ مگر وہ تو جیسے اپنے آپ میں ہی نہیں تھی۔ ہاشم سے لپٹی اونچا اونچا روئے جا رہی تھی۔
اس کی زندگی کے سارے پیارے رشتے اس کی عزت آبرو سب کچھ تو چھن گیا۔ اسے صبر آتا بھی تو کس طرح۔
"صبر کر میری بہن۔۔۔ حوصلہ کر۔ میں آ گیا ہوں ناں۔ میں پہلے ہی نہیں دو تین راتوں سے سو نہیں سکا تھا۔ کبھی ابا خواب میں آتے تو کبھی اماں بے چین سی پریشان گھبرائے ہوئے ہوتیں۔ بار بار کہتے ہمیں عاصمہ کی طرف جانا ہے' وہ بہت پریشان ہے' وہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نیند سے اٹھ اٹھ جاتا۔ اگر حمیدہ خالہ آپ کا فون نہیں بھی آتا تو یقین کریں۔ میں نے اس ہفتے پاکستان ضرور آنا تھا۔ میرے دل کو ایک پل کا قرار نہیں تھا۔ یہی احساس جرم کم نہیں تھا کہ میں عفان اور فاروق انکل کے جنازوں کو کندھا نہ دے سکا کہ اب یہ بار بار اماں ابا کے حوالے سے عاصمہ کے خواب۔۔۔ مجھے تو جیسے نہ دن میں قرار تھا نہ رات کو چین۔۔۔ آنا تو تھا ہی مجھے۔"
وہ بکھری ہوئی بہن کے بال سمیٹتے اس کی چادر ٹھیک کرتے کہہ رہا تھا' وہ ابھی تک روئے جا رہی تھی۔
"ہوا کیا تھا میری بہن! کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ کہ تم نے یہ انتہائی قدم اٹھا لیا۔ وہ دونوں تو اپنے خالق کی آواز پر لبیک کہتے بادل ناخواستہ چلے گئے مگر تم تو سمجھ دار تھیں۔ اپنے اکیلے رہ جانے والوں بچوں کا آخری سہارا بھی۔۔۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ اسے ساتھ لگائے ہوئے اس کی دکھتی رگ چھیڑ بیٹھا۔
"نہیں ہوتا کوئی انسان کسی کا بھی آخری سہارا۔۔۔ انسان سے بودا' نکما اور گھٹیا ناقابل بھروسا سہارا کوئی نہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے کا سہارا بھی بن نہیں سکتا۔ یہ شرک ہے۔ یہ کفر ہے۔ یہ ایمان کی خرابی ہے۔ ایمان کو ریت کی طرح چاٹ جانے والی خرابی۔۔۔ خدا کے سوا سارے سہارے جھوٹے دوغلے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا سہارا نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں بھائی! مجھ سے ہی غلطی ہوئی۔ میں نے انسان کو سہارا جانا۔ میں نے انسان پر بھروسا کیا۔۔۔ میں نے اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ میں خود ہوں اپنے ساتھ زیادتی کرنے والی۔ مجھے مرنا چاہیے تھا مجھے مرنے دیں۔ مجھے کیوں نہیں مرنے دیا آپ لوگوں۔ اب میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔"
وہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی ہاشم کی بانہوں میں جھول گئی۔
حمیدہ اور ہاشم پریشان سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

"نہیں امی! مجھے عدیل کے گھر نہیں' آپ کے ساتھ جانا ہے۔ آپ کی طرف۔" اسپتال سے چھٹی ہو گئی تھی۔ اور کچھ دیر پہلے ڈاکٹر نے بشریٰ سے بات کرتے اس کے بچے کی موت کا بتا دیا تھا۔ اس کے بعد سے بشریٰ کسی بت کی طرح ساکت تھی۔ پھر جیسے ہی ذکیہ بیگم آئیں تو وہ فوراً بستر سے اترتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں بولی۔
"بشریٰ! ہم گھر جا رہے ہیں۔ آنٹی بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہیں۔" عدیل نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑتے

ہوئے کہا۔
"ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔۔۔ تم تمہارے ساتھ جاؤں گی' نہیں کبھی نہیں۔۔۔ اگر تم نے میرے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تو میں چیخ چیخ کر سارے اسپتال کو اکٹھا کر لوں گی۔ سب کو بتاؤں گی کہ تم اصل میں کیا ہو۔ تمہارا چہرہ ایک قاتل کا چہرہ ہے۔ اپنے ہی بچے کے قاتل کا چہرہ۔" وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ عدیل کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
نسیم بیگم نے اڑی رنگت کے ساتھ سمدھن کی طرف دیکھا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو تم بشریٰ" ذکیہ بیگم نے بیٹی کو ساتھ لگا کر سنبھالتے ہوئے کہا۔
"سچ۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں جو اتنے دنوں سے صرف اس لیے چھپا رہی تھی کہ میں بد قسمت سمجھ رہی تھی کہ میرا بچہ ابھی زندہ ہے مگر وہ تو اپنے باپ کی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکا اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی۔۔۔ امی! وہ مر گیا۔ وہ روٹھ گیا مجھ سے ہم سے اس ظالم شخص نے اسے مار ڈالا۔ مار ڈالا میرے بچے کو۔"
وہ ماں کے گلے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی۔
"یہ کیا کہہ رہی ہے نسیم بہن! کیا ہوا تھا کیا چھپایا تھا آپ لوگوں نے ہم سے؟" ذکیہ بہن پریشان ہو کر الجھے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگیں۔
"بہن! میں تو خود ٹھیک سے نہیں جانتی کہ کیا ہوا۔ دونوں میاں بیوی کا آپس کا کوئی جھگڑا تھا۔ میں نے چیخ وپکار سنی' ان کے کمرے میں گئی تو بشریٰ کی طبیعت خراب ہو چکی تھی۔ کیا ہوا کیسے ہوا۔ مجھے تو یہ پوچھنے کا ہوش بھی نہیں رہا۔ بس فوراً اسے اسپتال لے کر آ گئی لیکن قدرت کو منظور نہیں تھا اس بچے کی زندگی۔ ہماری جلدی بھی کچھ کام نہ آ سکی۔" وہ لہجے میں زمانے بھر کی مظلومیت بھر کر رندھی آواز میں بولیں۔
"جھوٹ بولتی ہیں یہ۔ یہ سب کچھ جانتی تھیں۔ انہوں نے عدیل کو بھڑکایا تھا۔ اس نے مجھے مارا تشدد کیا اور میرا بچہ۔۔۔ امی! میرا بچہ چلا گیا امی!" وہ ماں کے ہاتھوں میں بکھر گئی۔ عمران نے عدیل کا گریبان پکڑ لیا۔
ذکیہ بیگم نے بے ہوش ہوتی بیٹی کو دیکھا اور دوسری طرف بیٹے کے ہاتھ میں داماد کا گریبان۔
ذکیہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
بیٹی کو جیسے تیسے بیڈ پر لٹا کر عمران کو پرے دھکا دیا' جو گالیاں بکتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ عدیل کو بھی غصہ آ چکا تھا' وہ بھی ابل رہا تھا۔ نسیم بیگم بھی بیٹے کا ساتھ دے رہی تھیں۔
ذکیہ بیگم کو لگا نسیم بیگم کی کہی وہ بات پوری ہونے جا رہی ہے' جو اس نے اسپتال کے بستر پر بیٹھے سنی تھی۔ انہوں نے بے ہوش بیٹی کو دیکھا اور گالیوں کے جواب میں گالیاں بکتے عدیل کو۔ کہانی بگڑ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ حلقے جلیے میں کمرے میں بیٹھی تھی۔
اس کے اردگرد گھر کا آدھے سے زیادہ سامان بندھا پڑا تھا۔ مگر وہ جیسے ہر چیز سے بے نیاز کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔
اس وقت بیرونی دروازہ کھلا اور ہاشم تھکا ہوا ہاتھ میں پکڑی فائلوں کے ڈھیر کے ساتھ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔
"کس وقت جانا ہے ہم نے یہاں سے بھائی؟" وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔
"شاید کبھی نہیں۔" ہاشم نے فائلوں کا ڈھیر اس کے آگے پھینک دیا۔ عاصمہ حیران سی دیکھنے لگی۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

آسیہ مقصود

"محبت کی ہے تو اس کے لیے کوئی قربانی تو دینی ہی ہوگی۔" گلاب کی نازک پتیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے وہ بہت طنطنے سے بولی۔

"کچھ قربانی؟ اب تو صرف میری قربانی باقی رہ گئی ہے۔" وہ آہستہ لہجے میں بڑبڑایا۔ مگر بھلا ہو اس موبائل نیٹ ورک کی "صاف اور واضح آواز" کا۔ مشائم نے ایک ایک لفظ باآسانی سن لیا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟" اس کی مترنم چیخ کو سننے کے لیے طلال کو سیل ایک لمحے کے لیے کان سے ہٹانا پڑا تھا۔

"اف مشائم! آہستہ بولو پلیز۔" اس نے اپنا کان سہلایا۔

"کیوں آہستہ بولوں، آواز میری اپنی ہے اور سیل فون بھی۔" مشائم نے اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کو غصے میں مزید پھیلایا۔

"تم بھول رہی ہو سننے والا کان میرا ہے۔ ذاتی۔"

"اس کی خیر ہے۔" مشائم کی بات پر وہ مسکرایا۔

"اچھا تو پھر آ رہے ہو نا؟" اسے خاموش پا کر مشائم نے اپنا سوال دہرایا۔

"مگر ان مشائم! میں کسی پارک میں شل نہیں رہا۔ یونو یہ آفس ٹائم ہے۔" اب کے وہ کسی قدر جھنجلایا۔

"تو کیا ہوا؟ ہاف لیو لے کر آجاؤ۔" وہ اپنی ہی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"روز روز یہ بھی ممکن نہیں۔ باس میری مستقل چھٹی کر دیں گے۔" اپنے دھیمے لہجے کو مزید دھیما کرتے ہوئے اس نے کھسیانی سی مسکراہٹ اپنے کیبن کے پاس سے گزرتے عاصم کی طرف اچھالی جو خاصی مشکوک نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں گارنٹی دیتی ہوں۔" وہ ہنوز مطمئن تھی۔

"دو روز قبل بھی تم نے گارنٹی دی تھی اور میں ٹرمنیٹ ہونے سے بال بال بچا تھا۔"

"بچ تو گئے نا؟" وہ معنی خیزی سے مسکرائی۔ "لیکن اس بار بالکل نہیں بچ سکتے۔ اگر آدھے گھنٹے میں مجھے پک کرنے نہ پہنچے تو۔" وہ بہت وثوق سے کہہ رہی تھی۔ لیکن بہت مہارت سے پھیلائے اس کے اس جال میں پھنسنے سے پہلے ہی طلال کال منقطع کر چکا تھا۔

"ہونہہ! بدھو کہیں کا۔" ایک اور نمبر ملاتے ہوئے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"طلال صاحب! سر محی آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

ابھی اس نے اپنے سامنے رکھے فائلوں کے ڈھیر میں سے سب سے پہلی فائل کھولی ہی تھی کہ ریاض باس کا بلاوا لے کر آدھمکا۔

"یار! ایک بات تو بتاؤ' تم یہاں چپڑاسی ہو یا ملک الموت کی ڈیوٹی پر؟" پین ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس نے بے زار لہجے میں کہا۔

"ہی ہی ہی۔" دانت نکوستا ہوا ریاض اسے شدید زہر لگ رہا تھا۔ مجبوراً" فائل بند کر کے اٹھ گیا۔

"کیا ضرورت تھی مجھے مشائم کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے غنی گروپ آف کمپنیز کو جوائن کرنے کی۔ پاگل ہوں نا' دماغ ہی تو گھوم گیا تھا میرا۔"

وہ جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ جانتا تھا واپس سیٹ پر آنا آج کی تاریخ میں ممکن نہیں۔

"تو پاگل پن کا کوئی علاج ہی کروایا ہو نا۔"

"کیا؟" طلال اپنے خیالات سے چونکا تھا۔ ریاض کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر اسے شدید غصہ آگیا۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟" دل تو چاہا مکا مار کر اس کے پان آلود کالے پیلے دانت توڑ ہی ڈالے۔ مگر ہائے ری بے بسی۔ یہ بھی غنی صاحب کا چہیتا تھا۔ لہٰذا دھیمے لہجے میں صرف غرا کر رہ گیا اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر بال درست کرتے ہوئے باس کے آفس کی طرف چل پڑا۔

"سر! آپ نے بلایا تھا؟" تھوڑی دیر بعد وہ نہایت مئودب بنا سر غنی کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمہیں؟" اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے اسے گھورتے ہوئے انہوں نے اپنی یادداشت پر زور دیا۔

"نہیں' بالکل نہیں۔"

"مگر وہ ریاض تو۔۔۔ میں جاؤں سر؟" اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

"ظاہر ہے۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔ "اب میرے آفس میں بیٹھ کر تو تم کام نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر کام سے جی چرانے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہو جیسا کہ تم خود کو کام چور تو ثابت کر ہی چکے ہو۔ تو کھول کر سن لو! اب مزید ایسا میں ہونے نہیں دوں گا۔ مسٹر طلال! یاد رکھو تم یہاں ایک سفارشی ہو۔" اس کی خوبیاں گنوانے کے بعد انہوں نے اس کی حیثیت یاد دلانا بھی ضروری سمجھا۔ ریاض کے خلاف دل ہی دل میں تاؤ کھاتے ہوئے وہ واپس مڑا ہی تھا کہ سر غنی پکار اٹھے۔

"ہاں! یاد آیا۔"

وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یادداشت کے خزانے کو ایک بار پھر ٹٹول رہے تھے۔ (جو عام طور پر خالی ہی پایا جاتا تھا۔ ان کے بالوں کے بغیر سر کی طرح۔)

"ڈرائیور سے چابی لے کر میری گاڑی لے جاؤ۔ مشی کو کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔"

"یس سر! او کے سر۔" اس نے بس کھسکنے کی کی۔

☼ ☼ ☼

"یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ لڑکی میری بہو نہیں بن سکتی۔" گہرے سرخ رنگ کی بنارسی ساڑھی میں ملبوس ادھیڑ عمر کی عورت کڑک دار آواز میں کہہ رہی تھی۔ وہ بھاری بھرکم زیورات سے یوں لدی ہوئی تھی کہ نین نقش بھی واضح نہیں ہو پا رہے تھے۔ اور موجود دو ڈھائی درجن لوگ حیرت میں ڈوبے جہاں کے تہاں سنگی مجسمے بن گئے تھے۔ واحد متحرک چیز بیک گراؤنڈ میوزک تھا۔ جو مسلسل ڈھن ڈھن کے بھونڈے انداز میں بجتے ہوئے سماعتوں پر قہر ڈھا رہا تھا۔ (سنگی مجسمے بھی شاید اسی لیے سہم گئے تھے۔)

ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے رخسار بھی بت بنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں حیرت' منہ کھلا ہوا' ایک ہاتھ میں چپس کا پیکٹ' دوسرا ہاتھ پیکٹ کے اندر لیکن نکالنا بھولی ہوئی تھی۔

مسلسل پندرہ منٹ تک تمام حاضرین کے چہرے

بار بار دکھانے کے بعد کیمرے کو جوش آتا ہے اور وہ ہیروئن کو ذرا سا آگے کھسکانے کے خیال سے نیچے جھک جاتا ہے۔ جہاں ایک سانولی سلونی دوشیزہ عروسی لباس پہنے فرش پر نیم دراز روانی سے نیر بہا رہی ہے۔ کیمرے کو منظر ایسا بھاتا ہے کہ وہ گول گول گھومتے ہوئے اس دوشیزہ کے گرد چکر لگانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اگلے دس منٹ تک گلیسرین ضائع کرتے ہوئے ڈرامے کا بجٹ ہی بڑھاتی رہتی ہے۔

ادھر رخسار ہیروئن کا ساتھ دیتے ہوئے حقیقی آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہی تھی۔ بات اگر آنسوؤں تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا' مگر دو درجن کیلے اور چھ پیکٹ چپس بھی اس نذرانے کی نذر ہو چکے تھے۔

"او یہ کیا' پھر قسط ختم؟" رخسار نے بمشکل آنسو پونچھتے ہوئے ٹی وی اسکرین کو بے یقینی سے دیکھا۔ "کیا مصیبت ہے پچھلی چار اقساط سے یہی سین چلا آرہا ہے۔ دکھاتے ہی نہیں کہ آخر ہونا کیا ہے۔" وہ منہ بسورتے ہوئے کیلے کے چھلکوں کے نیچے دبا ریموٹ نکال کر چینل بدلنے لگی۔

"لاکھ درجے اچھے ہیں ہمارے ڈرامے ان سے۔ تیرہ' چودہ اقساط میں رومانس' شادی اور بچے پیدا ہو کر جوان بھی ہو جاتے ہیں۔" اس نے ایک پاکستانی چینل لگایا اور انہماک سے دیکھنے لگی۔ اتنے میں واپڈا والوں کو جوش آگیا اور بجلی چلی گئی۔

"چلو! خیر ہے۔ اس کی کہانی تو میں نے ڈائجسٹ میں پڑھ رکھی ہے۔ یہ لوگ بھی ڈائجسٹ کے دم سے زندہ ہیں۔" اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔

"اب گیٹ کون پیٹنے لگا۔" پہلی بار اس کی توجہ بیرونی دروازے پر ہوتی مسلسل دستک کی طرف گئی تھی۔

"کون ہے منحوس! سانس تو لے لو۔۔۔ آتی ہوں۔"

اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ عجلت میں ذرا تیز چل کر بیرونی دروازے تک آنے میں وہ ہانپنے لگی۔

"ہماری گیند آئی ہے آنٹی!" گیٹ کھولنے پر ایک چھوٹا سا معصوم صورت بچہ بے صبری سے بولا۔

"تو میں کیا کروں؟" چھوٹے بچے کو دیکھ کر غصہ تو کچھ کم ہوا تھا مگر لہجہ کھردرا ہی تھا۔

"گیند دے دیں نا آنٹی کپا! " گلی کے بچے اور کچھ من چلوں نے موٹاپے کے باعث اس کا نام رکھا ہوا تھا جو بچے کے منہ سے بے دھیانی میں پھسل گیا تھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے' کوئی گیند وید نہیں ملے گی۔" رخسار کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

"منہ توڑ دوں گی اگر دوبارہ آئے تو۔" وہ چلا رہی تھی اور دیوار کی اوٹ میں چھپے باقی بچوں کا ٹولہ اب سامنے آکر قہقہے لگا رہا تھا۔ رخسار نے دھاڑ سے دروازہ بند کیا اور اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"شاپنگ کا تو صرف بہانہ تھا۔" مشائم نے مسکرا کر طلال کی طرف دیکھا۔ جو اس کی خریدی ہوئی اشیا کے آٹھ دس بیگ اٹھائے ہوئے تھا۔ کچھ اتنے ہی بیگ خود اس کے اپنے ہاتھ میں تھے۔

"دراصل دل چاہ رہا تھا تمہیں دیکھنے کو' تم سے ملنے کو اور تمہارے ساتھ گھومنے کو۔" محبت بھری نظروں میں شرارت کی ہلکی سی چمک لیے وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"اپنے دل کا علاج کرواؤ میڈم! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے ڈیڈ کو حقیقت معلوم ہو جائے۔ مجھ غریب کی گردن تو پہلے ہی خاصی پتلی ہے۔"

"اچھا! واقعی' دکھاؤ تو۔" وہ چہکی۔

"سدھر جاؤ لڑکی! ابھی بھی وقت ہے۔" طلال اٹکھیلیاں کرتی اس ہرنی کو دیکھ کر مسکرایا۔

"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" گاڑی میں سامان رکھتے ہوئے وہ گنگنانے لگی تھی۔

"میں سنجیدہ ہوں۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

میں بھی اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے مشائم مسکرائی۔

"یہ تو سراسر زیادتی۔"

"کیا؟ سنجیدہ ہونا؟"

"نہیں! بار بار بلیک میل کرنا۔ ایک تو اپنے ڈیڈ کے آفس میں جاب دلوا کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ دن میں دس بار مجھے سفارشی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ میری ساری ڈگریاں، ساری ذہانت گئی بھاڑ میں۔"

اسے واقعی افسوس تھا اپنے اس فیصلے پر۔ ورنہ اتنے اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ اسے ملازمت تو کہیں بھی مل سکتی تھی۔

"سکندر اعظم کو بھی محبت لے ڈوبی تھی۔" حسب عادت وہ اپنی ہی سوچ پر مسکرایا۔

"تو پرابلم ان کا یہ رویہ عارضی ہے۔ جب معلوم ہوگا کہ تم ہی ہو ان کی اکلوتی بیٹی کا انتخاب تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اب اگلا مسئلہ بتاؤ۔"

چیونگم چباتے ہوئے اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"دوسرا یہ تمہاری روز روز کی ضد۔ کیا ہم شام میں نہیں مل سکتے۔ آفس ٹائم میں ایسی مشکوک حرکات کرنا ضروری ہیں کیا۔" وہ جھنجلایا۔

"بہت ضروری ہے۔ بلکہ مجبوری ہے۔" طلال حیرت سے اس کی طرف مڑا۔

"شام میں تم اپنی آپا کے بغیر کہیں جا نہیں سکتے۔" مشائم نے اپنی ضروری مجبوری بیان کی۔

"ہاں! یہ تو ہے۔" اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔ "دراصل مشائم آپا..."

"رات کو دیر تک اکیلی نہیں رہ سکتیں۔ اندھیرے سے ڈرتی ہیں (جبکہ اندھیرے کو ان سے ڈرنا چاہیے۔) اس لیے شام کے بعد ہر جگہ انہیں ساتھ لے جانا تمہاری مجبوری ہے۔"

اس کے ہزار بار کے کہے جملے مشائم نے حرفوں کے توں دہرا ڈالے۔

"سب جانتی تو ہو تم۔" طلال نے نظریں چرائیں۔ وہ منہ بسور کر باہر دیکھنے لگی۔

"مگر یہ نہیں جانتیں کہ وہ میرے لیے صرف آپا نہیں ہیں۔ بلکہ میرا خون کا ہر رشتہ ان کی ذات سے شروع ہوتا ہے۔" وہ ایک دم بہت سنجیدہ ہو گیا۔

"اماں کا انتقال ہوا تو میں بہت چھوٹا تھا۔ تب سے میری ماں بن گئیں اور میری محرومیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ کالج میں تھا، جب ابا رخصت ہوئے۔ اس عمر میں باپ کی مورل سپورٹ کی کتنی ضرورت ہوتی ہے، یہ صرف ایک نوجوان ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن آپا ایک بار پھر باپ کا روپ دھار کر تقدیر کے فیصلے کے آگے آکھڑی ہوئیں۔" دکھ کی روشنائی دھیرے دھیرے اس کے لہجے میں گھل رہی تھی۔

"انہوں نے صرف اور صرف میرے اکیلا رہ جانے کے خیال سے شادی نہیں کی۔ میں ان قربانیوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔" خاموشی کا ایک مختصر لمحہ ان دونوں کے درمیان رک کر چلا گیا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے۔ تم کبھی بھی مجھے مجبور نہیں کرو گی، کسی ایسے کام کے لیے، جو ان کے لیے دکھ کا باعث بنے۔" طلال نے بہت مان سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"چلو جی۔ گل ای مک گئی۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

٭ ٭ ٭

"کل میرا بچہ گیند لینے آیا تو تم صاف مکر گئیں۔ کچھ تو شرم کرو۔ میرے چھوٹے سے بچے سے ہیر لگا رکھا ہے۔" سامنے والی پڑوسن، بانو ایک ہاتھ کمر پر رکھے اور دوسرے سے اپنے بیٹے کا بازو تھامے جھگڑا کرنے کو تیار کھڑی تھی۔

"اچھا! تو یہ تمہارا بیٹا ہے۔ بڑا بدتمیز ہے۔ کیسی تربیت کی ہے تم نے اس کی؟" رخسار بھی کہاں چپ رہنے والی تھی۔

"ہائے ہائے، میرے ننھے سے بلونگڑے نے کیا بدتمیزی کر دی تمہارے ساتھ رخسار آپا!" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

"تمام درندے پہلے بلونگڑے ہی ہوتے ہیں اور یہ آپا تم نے کس کو کہا؟ تم تین بچوں کی اماں ہو اور میں ابھی کنواری لڑکی۔" رخسار نے اپنا گدگدا سا ہاتھ نچایا۔

"بڑی کمزور یادداشت ہے تمہاری۔ بادام کھایا کرو۔ پورے پانچ سال چھوٹی ہوں تم سے۔" اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے بانو نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"تم تو اب آدھے محلے کی آپا ہو۔ تمہاری ہم عمر لڑکیاں تو اب بڑے بڑے بچوں کی مائیں ہیں۔ تمہاری ہی شادی نہیں ہو پائی تو اس میں ہمارا کیا قصور۔" وہ مسلسل پتھر برسا رہی تھی۔

"اپنی محرومیوں کا بدلہ تم ان چھوٹے چھوٹے بچوں سے لیتی ہو۔ جن کے باپ بھی تم سے چھوٹے ہیں اور تمہیں آپا ہی کہتے ہیں۔"

رخسار کے ہونٹوں پر قفل لگ گئے۔ الفاظ تھے کہ کہیں کھو گئے تھے۔ آنسو بہا کر وہ خود کو کمزور ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ضبط کرنا بھی ایک کڑی آزمائش تھا۔ کرسی کی پشت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ لرز رہے تھے۔

مقابل اگر کمزور پڑ جائے تو کم ظرف چڑھ دوڑتا ہے اور باظرف پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ مگر بانو کو اعلیٰ ظرف سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

٭ ٭ ٭

بانو کے جانے کے بعد ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے اور رخسار کے نینوں میں رکی بدلی دیر تک برستی رہی تھی۔ جب مطلع صاف ہوا تو اس نے بھیگے چہرے کو رگڑ کر پونچھا اور وہی ستارے والا چینل لگا کر بیٹھ گئی۔ جس پر آج بھی کل والا ساس بہو کا ڈراما ایک ہی سین میں مستقل مزاجی کے ساتھ اونگھ رہا تھا۔

صحن سے طلال کے باتیں کرنے کی آواز آئی تو وہ متوجہ ہوئی۔ وہ غالباً اپنے پاس موجود اضافی چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

"لگتا ہے آج پھر وہ ہیروئن، مس نازک حسینہ میرے بھائی کو چپکی ہوئی ہے۔" کان کھجاتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگی۔

"کیا پکایا ہے آپا! بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔" طلال نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی چھوٹے بچوں کی مانند بھوک بھوک کا شور مچا دیا۔

"السلام علیکم آپا!" مشائم نے بھی آگے بڑھ کر ذرا جھجکتے ہوئے اسے سلام کیا۔

"واہ بھئی! آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں ہمارے دسترخوان کو رونق بخشنے۔" رخسار نے اسے دیکھتے ہی ابرو اچکائے۔

"سچ کہتا ہے طلال، یہ مجھے ساس کی کمی تو ہرگز محسوس نہیں ہونے دیں گی۔"

وہ کھسیانی سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دونوں بہن بھائی باتوں میں مصروف ہو گئے تو وہ خود ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ رخسار بھائی سے کچھ کہہ رہی تھی اور جواباً وہ "جی، جی" کی گردان کر رہا تھا۔

"اگر کبھی طلال کی غیر موجودگی میں یہ مجھ سے جھگڑ پڑیں تو... تو میرا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" نرم و نازک سی مشائم نے دو نشست کے صوفے پر اسے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھے دیکھ کر جھرجھری لی۔

"تمہارا کیا خیال ہے مشائم؟" طلال شاید اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں! کس بارے میں؟" وہ اپنے خیالات سے چونکی۔

"دراصل آپا نے آج آلو کا بھرتہ بنایا ہے اور ساتھ ابلے چاول تو... ان کا خیال ہے کہ تمہیں پسند نہیں آئیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کھا لوں گی۔" مشائم جھٹ

سے بولی۔ طلال کی ہچکچاہٹ سے وہ سارا معاملہ بھانپ گئی تھی۔

"نہیں نہیں مشائم! اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے۔ جب طلال ہمیں باہر کھانا کھلانے لے جا ہی رہا ہے تو ہم کیوں کفرانِ نعمت کریں۔" آپا کے منہ میں تو تصور ہی سے پانی بھر آیا تھا۔

"ہم، مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ لوگ بنائیں آؤٹنگ کا پروگرام، میں چلتی ہوں۔" وہ طلال کو گھورتے ہوئے اٹھ گئی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم میری مہمان ہو اور میں تمہیں کھانا کھلائے بغیر ہرگز نہیں جانے دوں گی۔" وہ دیوارِ چین کی مانند اس کا رستہ روکے کھڑی تھی۔

"اگر یہ نہ رکی تو اتنے اچھے موسم میں گھر بیٹھ کر آلو کا بھرتہ ہی کھانا پڑے گا۔" اس نے للچائی ہوئی نظروں سے اسے یوں دیکھا۔ جیسے بچہ مٹھائی کو دیکھتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"کنّے کنّے جانا اے بلو دے گھر، ٹکٹ کٹاؤ نا لے لین بناؤ۔" ریاض لہک لہک کر گاتا ہوا اس کے کیبن میں داخل ہوا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" کمپیوٹر سے نظریں ہٹا کر طلال نے اسے گھر کا۔

"مجھے کیا پتا، یہ تو آپ ابرارالحق سے ہی پوچھیں۔" وہ باچھیں پھیلائے اسے دیکھنے لگا۔

"آج کل تم کچھ زیادہ ہی چہکنے لگے ہو۔"

"جبکہ باری آپ کی ہے۔" اس نے طلال کی تیوری کو نظر انداز کر کے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ آئے کیوں ہو؟"

"گویا آپ کو اب تک معلوم نہیں ہو سکا؟ باقی سب کو تو پتا ہے۔" اپنی بتیسی کی نمائش سے وہ اب بھی باز نہیں آیا تھا۔

"کیا مطلب؟" اس سے پہلے کہ طلال اٹھ کر اس کا گلا دبوچتا وہ "سر غنی یاد فرما رہے ہیں۔" کہہ کر بھاگ گیا۔

طلال نے کھسیانی سی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور اس کی طرف کوئی متوجہ نہ تھا۔ لیکن کچھ فاصلے سے ریاض کے گانے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

"ٹکٹ کٹاؤ، لین بناؤ، کنّے کنّے جانا اے بلو دے گھر۔"

طلال نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ آج تو وہ غلطی سے بھی باس کے آفس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وجہ مشائم کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ کہاں وہ روز سرکشی کے درپے ڈرون حملے کرواتی تھی اور اب بغیر کسی معاہدے کے مکمل سیز فائر تھا۔ دوسرے الفاظ میں اطمینان تھا بھی اور نہیں بھی۔ اس کی خاموشی ہمیشہ کوئی نیا طوفان لے آتی تھی۔

دو روز قبل وہ مشائم کو آپا سے ملوانے گھر لے گیا تو اور ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوئی۔ سدا کی چٹوری آپا نے جھٹ سے باہر کھانا کھانے کا پروگرام بنا لیا۔ آپا کی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا مگر مشائم۔ ایک طرف کھائی اور دوسری طرف۔۔۔

مشائم کے لاکھ انکار کے باوجود آپا نے اسے جانے نہ دیا۔ راستے بھر پچھلی سیٹ پر اسے یوں دبوچ کر بیٹھی رہی۔ گویا وہ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دے گی۔ (یہ اور بات کہ مشائم کے چہرے کے تاثرات اس سے کچھ مختلف نہیں تھے)۔ وہ بیک ویو مرر میں چور نظروں سے اسے دیکھ کر لاحول پڑھتا رہا۔ کھانے کے بعد آپا نے آئس کریم کی فرمائش کر دی اور پھر لانگ ڈرائیو۔

"آئی ایم سوری۔" شام ڈھلے اسے گھر کے گیٹ پر اتارتے ہوئے طلال نے سرگوشی کی۔ مگر وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

"ایک منٹ، میں اگلی نشست پر آ جاتی ہوں۔ آخر کب تک تم ڈرائیور بنے رہو گے۔" آپا کو اچانک اس سے ہمدردی ہو گئی۔

"بہت جلدی خیال آ گیا۔" اس نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم سر!" وہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔" انہوں نے ایک پل کے لیے فائل سے سر اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"چائے پیو گے؟" ابھی بھی ان کی نظریں میز پر دھری فائل پر تھیں۔ طلال کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

"ایک کپ چائے لاؤ بھئی۔" اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر انہوں نے انٹرکام پر آرڈر دیا۔ طلال اپنے مستقبل کے سسر کی چمکتی چندیا کو بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

"کہیں یہ نادان دل خوشی سے بند ہی نہ ہو جائے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر رکی ہوئی سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔

ریاض نے چائے لا کر میز پر اس کے سامنے رکھی اور اپنے میلے بھدے دانتوں کی زیارت کا شرف بخشتے ہوئے باہر چلا گیا۔ غنی صاحب مسلسل فائل میں سر دیے ہوئے تھے۔ اس ادائے بے نیازی پر اسے جی بھر کر پیار آ رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" چائے کی پیالی اس نے اپنی طرف سرکائی ہی تھی کہ وہ گرج دار آواز میں دھاڑے۔

"س۔۔۔ سر۔۔۔ چا۔۔۔ ئے۔" الفاظ اس کے حلق سے جا چپکے۔

"یہ تو میں نے اپنے لیے منگوائی ہے۔ تمہیں بیٹھنے کی اجازت کس نے دی؟ یہ میرا آفس ہے برخوردار! تمہارے باپ کی جاگیر نہیں۔" وہ اپنی جون میں لوٹ آئے تھے۔

"گیٹ اپ، اسٹینڈ اپ!" حکم صادر ہوا اور وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"لعنت ہے میری ڈگریوں پر اور اس آفس والوں پر۔ آج ہی ریزائن نہ کیا تو میرا نام بھی طلال رضا خان نہیں۔" ان کی گنجی چندیا پر ٹھونگیں مارنے کی خواہش کو دل میں دباتے ہوئے اس نے مٹھیاں بھینچیں۔

"مشائم کو کب سے جانتے ہو؟" اگلے سوال نے اس کے دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کو روک لیا۔

"جج۔۔۔ جی، یونیورسٹی میں ساتھ تھے۔" اس نے نظریں فرش پر جما لی تھیں پھر بھی ان کی موٹے شیشوں والی عینک سے نکلنے والی ایٹمی شعاعیں اسے صاف محسوس ہو رہی تھیں۔

"یہ ڈگری تمہاری اپنی ہے؟" اپنے سامنے پڑی فائل اٹھا کر انہوں نے طلال کی نظروں کے سامنے کی۔

"تو جناب اتنی دیر سے میری سی وی حفظ فرما رہے تھے۔"

"یقیناً سر!" اس نے بجھے دل سے کہا۔

"ہوں، بریلینٹ۔" ان کے لہجے میں ستائش تھی۔ مگر اعتبار کرنے کو طلال کا دل نہیں مانا۔

"ایک چیز کی شدت سے کمی ہے اور وہ ہے خود پر اعتماد۔" انہوں نے طلال کو سر سے پاؤں تک یوں گھورا۔ گویا وہ کسی مداری کا لباس زیبِ تن کیے ہوئے ہو۔

"کمی نہیں، زیادتی ہے آپ کی بیٹی میں ضد کی۔" وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔

"اگر سفارش نہ کرواتے تو میرٹ پر میں تمہیں سلیکٹ کر ہی چکا تھا۔" غالباً انہوں نے اپنی برخاستگی کی وجہ بتائی تھی۔ "یہ دونوں فیصلے بھی میں میرٹ کی بنیاد پر لے رہا ہوں۔ لہٰذا کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔"

"خوش فہمی اور آپ سے متعلق؟" اس نے مسکین سی شکل بنا کر انہیں دیکھا اور چپ رہا۔

"یہ ہے تمہارا پروموشن لیٹر۔" ایک کاغذ انہوں نے طلال کی طرف بڑھایا۔

"یہ کر ظالم! اب کے تو ہارٹ ضرور فیل ہو جائے

گا۔" طلال نے پہلے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کہیں وہ کسی اور سے تو مخاطب نہیں۔ پھر آگے بڑھ کر کچھ جھجکتے ہوئے لیٹر تھام لیا۔

"ہاں! کل شام چائے پر میں تمہارے گھر والوں کا منتظر رہوں گا۔" طلال ابھی یقین نہیں کرپایا تھا کہ پروموشن لیٹر واقعی اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کے پکڑنے سے پہلے واپس نہیں کھینچ لیا گیا۔ جب انہوں نے ایک اور دھماکا کیا۔

"ہم۔ مگر کیوں سر؟" وہ گرنے کو تھا۔

"احمق شخص! اب بیٹی کا رشتہ بھی میں لیٹر کی صورت ہاتھ میں پکڑا دوں؟"

وہ زیر لب مسکرائے تھے۔ مگر طلال ان کی میز پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیسے مزاج ہیں عباسی صاحب؟" کاؤنٹر پر گاڑی کی چابی اور اپنا موبائل فون رکھتے وہ وہاں موجود شخص سے مخاطب ہوئے۔

"اللہ کا کرم ہے' لیکن سر! آپ نے بہت دن بعد چکر لگایا؟"

"کچھ مصروفیات تھیں جن کے باعث وقت نہیں نکل پایا۔" انہوں نے کتابوں کے ایک ریک کی طرف سرسری نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ کی دلچسپی کی کچھ نئی کتابیں آئی ہیں۔" اس نے تین کتب غنی صاحب کے سامنے رکھیں۔

"ہاں! ٹھیک ہے۔ تینوں دے دو۔" انہوں نے کچھ صفحات الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یاد آیا' میں ایک کتاب تبدیل کروانے لایا تھا۔ اس میں کچھ صفحات آگے پیچھے ہیں اور کچھ سرے سے غائب ہیں۔" انہوں نے دائیں بائیں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

"غالباً کتاب میں گاڑی میں بھول آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں سر! میں لڑکا بھیج کر منگوا لیتا ہوں۔ الیاس۔ او الیاس۔"

وہ اپنے مستقل گاہک کی خوشنودی کے لیے ...ہو رہا تھا مگر الیاس نامی شخص منظر سے غائب تھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں عباسی صاحب! میں خود ... ہوں۔" دھیل چیئر پر بیٹھے عباسی صاحب کو ... شرمندگی سے بچانے کے لیے وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے' رکے' واپس مڑ کر کاؤنٹر سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور پہلے سے زیادہ تیز رفتاری سے باہر کی طرف لپکے۔ اسی لمحے گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوتی ایک بھاری بھرکم خاتون ان سے آن ٹکرائی۔

"معذرت چاہتا ہوں محترمہ!" نیچے گرے شاپنگ بیگ اور دو عدد کتابیں اٹھا کر خاتون کو واپس دیتے ہوئے انہوں نے نہایت مہذب لہجے میں اپنی بات کا آغاز کیا۔ مگر مکمل نہ کرپائے تھے کہ بھرپور جوابی حملے نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا۔

"زیادہ ہمایوں سعید بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی عمر دیکھو بزرگو!" وہ اس غیر متوقع جواب پر بھونچکے رہ گئے۔

"کمال کرتی ہیں خاتون! میں غلطی نہ ہونے کے باوجود معذرت کر رہا ہوں اور آپ ہیں کہ بد تمیزی کا مظاہرہ کیے چلی جا رہی ہیں۔" انہوں نے پہلی بار مقابل کو بغور دیکھا۔ پھولے ہوئے لال ٹماٹر جیسے گال اور چھوٹی سی ناک' جس کے نتھنے غصے سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ مٹھیاں بھینچے ان کے سامنے کسی چٹان کی طرح کھڑی تھیں۔ مگر اس کی گوشت میں دبی ہوئی سی آنکھوں میں اداسی کی ایک واضح پرچھائیں تھی۔

"نہ تم فواد خان ہو اور نہ میں ماہرہ خان۔ لہٰذا یہ ڈرامہ بند کرو۔ ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔" وہ سابقہ لہجہ میں غرا رہی تھی۔

"فوراً۔ فوراً میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

"اوہ! تو راستہ روک رکھا ہے میں نے۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ گاڑی سے مطلوبہ کتاب لے کر آتے ہوئے اور پھر بل ادا کرکے اپنی خریدی ہوئی کتب کے ساتھ دکان سے نکلتے ہوئے بے اختیار ان کی نظر اس غصیلے چہرے اور اداس آنکھوں والی خاتون پر پڑی تھی۔ جو اب ارد گرد سے بے نیاز کتابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"طلال! رکو۔ بات تو سنو۔ میں ٹھیک تو لگ رہی ہوں نا۔" خود سے دو قدم آگے چلتے ہوئے طلال کو روک کر وہ ایک بار پھر پوچھ رہی تھی۔

"آپ ٹھیک بھی لگ رہی ہیں اور ٹھاک بھی اب چلیں؟" طلال نے رک کر کوئی اٹھارہویں مرتبہ ان کی تسلی کروائی۔

"میرا مطلب ہے' پہلی بار مل رہے ہیں۔" وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ طلال کی طرف سے بار بار کروائی گئی تسلی سے بھی وہ مطمئن نہ ہوئی تھی۔

"اتنے امیر لوگ ہیں۔ جانے کتنے نخریلے ہوں۔" رخسار نے پیچھے مڑ کر پورچ میں موجود تین عدد لش پش کرتی گاڑیوں کو دیکھا اور سب سے آخر میں کھڑی اپنی مہران کو جو ان کے مقابلے میں کسی گندے میلے چھوٹے سے بچے کی مانند لگ رہی تھی۔

"آپا! اب آ بھی چکیں۔" وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر رک کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بددلی سے چلتی طلال کے برابر آ گئی۔

"آپا! بس لمبی چھوڑنے مت بیٹھ جانا' ہم جو ہیں۔ اسی پر قائم رہنا۔" وہ رخسار کی مرعوبیت سے خائف ہو رہا تھا۔

"اچھا' اچھا! زیادہ سبق رٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اسے ایک دھپ لگا کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ڈرائنگ روم میں مشائم اور اس کے والد استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھے۔ سر غنی ہونے والے داماد سے بہت گرم جوشی سے ملے۔

"اوہ! تو آپ ہیں حسنات غنی۔" رخسار کے پہلے جملے پر ہی مشائم اور طلال دونوں چونک گئے۔

"کیا رخسار آپا انہیں جانتی ہیں؟" جبکہ رخسار کے ذہن میں ایک روز ہونے والی حسنات صاحب سے اتفاقیہ ملاقات گردش کرنے لگی تھی۔

"جی! بندہ ناچیز کو حسنات غنی کہتے ہیں۔" غنی صاحب نے خوش اخلاقی کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے طلال اور مشائم کو حیران کر دیا۔

"غالباً" آپ کا نام تو خوشبو' گلشن یا بہار ہونا چاہیے۔" انہوں نے رخسار آپا کو بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے رخسار آپا کو گڑبڑانے پر مجبور کر دیا۔

"کیونکہ ان تینوں چیزوں کے لیے جگہ کی کوئی قید نہیں۔" مشائم بڑبڑائی۔

"سر غنی اور اس قدر میٹھا لہجہ۔!!!" طلال حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔

"کہیں یہ خواب تو نہیں۔" اس نے آنکھیں مسلیں اور خود کو چٹکی کاٹی۔

"آں' آ' آم۔" اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ہرگز نہیں' میرا نام رخسار ہے۔ رخسار رضا خان۔" آپا کا وہی لٹھ مار لہجہ۔۔۔۔

"یہ بھی نہایت مناسب نام ہے اور آپ کی شخصیت نے تو اسے مزید جلا بخش دی ہے۔" وہ چہرے پر نہایت باوقار سی مسکراہٹ سجائے کہہ رہے تھے۔

"یقیناً" یہ خواب نہیں۔" طلال نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

☼ ☼ ☼

"کتنا خوب صورت ہے یہ سوٹ۔" ایک دکان کے ڈسپلے میں لگا یہ سفید کامدار سوٹ مشائم کو پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اسے لینے کی۔ ہمارے ہاں نئی نویلی دلہنیں سفید رنگ نہیں پہنتیں۔" رخسار نے اس کی خود کلامی کا جواب دیا تھا۔ جس دن سے مشائم اور طلال کی شادی کی خریداری کا آغاز ہوا تھا' وہ اپنا فرض منصبی احسن طریقے سے نبھا رہی تھی اور مشائم یہ سوچ سوچ کر کڑھتی تھی کہ اس نے طلال سے اکٹھے شاپنگ کرنے کی بات ہی کیوں کی۔

"مگر مجھے پسند۔" اس کی بات مکمل ہونے سے

پہلے رخسار بازو سے پکڑ کر اسے ایک دوسری دکان میں گھس گئی تھی۔

"آپا! مہندی اور ابٹن کے جوڑے تو ہم لے چکے ہیں۔" اسے گہرے پیلے رنگ کا شوخ سا سوٹ نکلواتے دیکھ کر مشائم نے یاددہانی کروائی۔

"معلوم ہے۔ اتنے زیادہ کام والا سوٹ مہندی یا ابٹن کے لیے لوں گی کیا؟ یہ تو میں نے چوتھی کے فنکشن کے لیے پسند کیا ہے۔ دیکھو! کتنا کھلتا ہے یہ رنگ تم پر۔" آپا نے دوپٹا اس کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"مگر آپا! مجھے یہ رنگ پسند نہیں۔"

"بس فائنل ہو گیا۔ آپ پیک کر دیں اور وہ سرخ اور نیلے رنگ کے امتزاج والی ساڑھی دکھائیں۔" اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے وہ دکاندار کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ مشائم نے بے بسی سے طلال کی طرف دیکھا وہ نظریں چرا کر باہر دیکھنے لگا۔

مشائم تھی کہ رو دینے کو تیار۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ سب کچھ من چاہا ملا تھا۔ جس چیز کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتی' اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جاتی۔ شاہین بیگم کے انتقال کے بعد غنی صاحب اس کے لیے مزید حساس ہو گئے تھے۔

"اگر ڈیڈ کو معلوم ہو جائے کہ میری ہی شادی کی شاپنگ پر میرے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے تو یقیناً" کے ٹو کے اس پہاڑ کا یہیں کام تمام ہو جائے۔"

دکان سے نکل کر اپنے سامنے چلتی رخسار کی پشت کو اس نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"مسٹر غنی نے جیسے "آناً" "فاناً" مجھے اپنی فرزندی میں لینا قبول کرتے ہوئے اس پہلی ملاقات میں ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی تھی اس پھرتی کا مظاہرہ شادی سے انکار کی صورت میں بھی کر سکتے ہیں۔ اگر آپا اور مشائم کے درمیان یہ صورت حال برقرار رہی تو۔۔۔" آپا اور مشائم کے درمیان چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

"پھنسوا دیا یار اس محبت نے۔" کان کھجاتے ہوئے اس نے دونوں کو باری باری دیکھا۔

"مشائم! کیا سوچ رہی ہو؟" دو قدم رک کر وہ اس کے برابر ہو گیا۔

"خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ڈیڈ کا پولیس میں خاصا اثر و رسوخ ہے۔"

"کیا مطلب؟" طلال نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"مطلب یہ کہ اگر ایک دو قتل کر بھی ڈالوں تو وہ مجھے باآسانی چھڑوا سکتے ہیں۔"

"مشائم ڈیئر۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"آج کے لیے اتنی ہی خریداری کافی ہے۔" رخسار ایک دم پیچھے مڑی تھی۔ "باقی کل یا پھر پرسوں پر رکھ لیتے ہیں۔ فی الحال سامنے والے فاسٹ فوڈ سینٹر چل کر کچھ کھا لیتے ہیں۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ دوبارہ آگے آگے چل دی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" طلال نے مشائم کی دل جوئی کے خیال سے پوچھا۔

"یہی کہ آئیڈیا میرا بھی برا نہیں۔" کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼
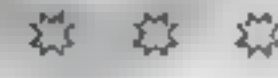
روشنیوں میں نہائے طویل ہال میں بوفے میزیں دائروں کی صورت میں لگی تھیں جن پر بیٹھے مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ داخلی دروازے سے لے کر اسٹیج تک سرخ مخملیں قالین بچھا تھا۔ جس پر خراماں خراماں چلتے ہوئے' سکھیوں کے جھنڈ میں وہ دلہن بنی اسٹیج کی جانب بڑھ رہی تھی۔ قالین کے دونوں اطراف میں کھڑی لڑکیاں اس پر گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ جوں جوں اسٹیج قریب آ رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ رہی تھی۔ اسٹیج پر عین اس کے سامنے طلال کامدار شیروانی اور کلاہ پہنے بیٹھا ایک جذب کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچی۔ طلال اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھا۔ اور اس کا حنائی ہاتھ تھام لیا۔

"بہت حسین لگ رہی ہو۔" صوفے پر اپنے پہلو میں بٹھاتے ہوئے وہ خواب ناک لہجے میں بولا

"رکو طلال! یہاں میں بیٹھوں گی۔ تم سائیڈ والے صوفے پر ہو جاؤ۔" اچانک کہیں سے رخسار نمودار ہوئی۔ اس کے قدموں کی دھمک سے اسٹیج بھی تھرتھرا اٹھا ہے اور اس کا دل بھی۔ طلال کو ایک طرف دھکا دے کر وہ اس کے ساتھ صوفے پر دھنس کر بیٹھ گئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

"طلال! مجھے بچاؤ طلال" وہ پکارتی ہے۔ مگر طلال اس کی طرف دیکھے بغیر اسٹیج سے اتر کر واپس چل پڑا۔

"طلال! تم کہاں جا رہے ہو۔ رکو طلال! مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ پلیز طلال' طلا۔۔۔ل" اس کی آنکھ کھل گئی۔ پسینے سے شرابور چہرے کو دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تیزی سے دھڑکتا ہوا دل اور وہ گھٹن کا احساس ابھی تک باقی تھا۔

"مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا ورنہ طلال۔۔۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر ایک خیال نے جیسے اسے مطمئن کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"ڈیڈ! آپ کو معلوم ہے رخسار آپا کو بھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے؟" رخسار کے کندھے سے جھول کر لاڈ کا اظہار کرتے ہوئے وہ حسنات غنی سے مخاطب تھی۔ وہ بھی پورے ذوق و شوق سے متوجہ تھے۔

آج خریداری کے لیے نکلنے سے پہلے مشائم نے فون پر طلال سے کہہ دیا تھا کہ وہ خود ہی مارکیٹ آ جائے گی۔ لہٰذا وہ اسے پک کرنے نہ آئے۔ مقررہ وقت پر جب وہ طے شدہ جگہ پہنچی تو حسنات غنی اس کے ہمراہ تھے۔ جنہیں منانے کے لیے اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی تھی۔ ایک تو چھٹی کا دن تھا دوسرے۔

"اور ڈیڈ" آئس کریم فلیور میں بھی ان کی پسند وہی ہے جو آپ کی ہے۔" وہ جب سے آئی تھی' کسی خفیہ مہم میں جتی ہوئی تھی۔

"یعنی بہت باذوق واقع ہوئی ہیں مس رخسار۔" غنی صاحب نے بہت دیکھ بھال کر شاندار سا شاٹ کھیلا تھا۔ جس پر رخسار کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔

"انہیں کیوں ساتھ لے آئیں؟" طلال نے نظروں ہی نظروں میں پوچھا تھا۔

"یہ میری قسمت کا آخری اور فیصلہ کن میچ ہے۔ اس لیے آفریدی کی طرح ایک گیند کھیل کر باقی کا میچ پویلین میں بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتی۔" وہ کندھے اچکا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"سرحد پار والوں کی طرح یا تو خود جیتوں گی۔۔۔ نہیں تو کسی دوسرے کو بھی کھیلنے نہیں دوں گی۔" اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"کیوں نہ پہلے آئس کریم ہی کھالی جائے۔" ڈیڈ نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔

"لو یو ڈیڈ۔" اس نے ممنونیت سے حسنات غنی کی جانب دیکھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ شاپنگ کو دیر ہو جائے گی۔" رخسار نے مچلتے دل کو ڈانٹ کر چپ کرایا تھا۔

"ہو جائے گی شاپنگ بھی آپا! آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ بس آئیں' آئس کریم کھاتے ہیں۔"

رخسار کو بھی شاید آئس کریم پارلر والے کی کمائی کا خیال آ گیا تھا۔ جب ہی رضامندی ظاہر کرتی چل دی۔ ورنہ اس کے مضبوط تنے جیسے بازو پر مشائم ساری کی ساری لپٹ کر بھی انہیں قابو نہ کر سکتی تھی۔

"اوہ! مجھے تو اپنے درزی کو کچھ ضروری ہدایات دینی ہیں۔" وہ لوگ ابھی پارلر آئے ہی تھے کہ مشائم نے نیا شوشا چھوڑ دیا۔

"مگر بیٹا!" غنی صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے۔

"کم ان ڈیڈ! یہاں قریب ہی تو ہے۔ ہم پندرہ بیس منٹ میں واپس آ جائیں گے۔ جب تک آپ لوگ آئس کریم انجوائے کریں۔ چلو طلال۔۔۔" اپنے نام پر

طلال سٹپٹایا تھا۔
"میں چلتی ہوں۔" رخسار نے اٹھنا چاہا۔ مگر مشائم ان سنی کر کے طلال کو بازو سے کھینچتے ہوئے باہر نکل گئی۔
مشائم جاتے ہوئے شاید آرڈر کر گئی تھی۔ اس لیے ویٹر دو کپ آئس کریم لے آیا تھا۔ چاکلیٹ فلیور دیکھ کر رخسار کا منہ بن گیا۔
"میں تو مر کے بھی نہ کھاؤں۔ یہ کالی سڑی ہوئی آئس کریم۔ اس جیسے خالی سر کے لوگ ہی اسے کھا سکتے ہیں۔" غنی صاحب کو رغبت سے کھاتا دیکھ کر وہ کڑھ رہی تھی۔
"اچھا! مجھے کیا چاکلیٹ فلیور پسند ہے' واقعی؟ ہاں' شاید۔" غنی صاحب ذہن پر زور دیتے ہوئے سوچ رہے تھے۔
"یہ مشائم کو کس نے بتایا کہ مجھے چاکلیٹ آئس کریم پسند ہے۔ اب کیسے کہوں۔ کیا سوچیں گے کتنی ندیدی ہوں میں۔" اس نے غنی صاحب اور آئس کریم کو باری باری گھورا۔
"بڑے میاں کی پسند بھی بس۔" وہ دل مار کر آئس کریم کھانے لگی۔
"چلو ٹھنڈی تو ہے اور تھوڑی بہت میٹھی بھی۔"

☆ ☆ ☆

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو مشائم! ایسا ممکن نہیں ہے۔" مشائم کی بات سن کر ہی اس کا منہ کھل گیا تھا۔
"کیوں؟ کیوں ممکن کیوں نہیں ہے۔" جوس کا سپ لیتے ہوئے وہ بہت بے صبری سے بولی۔
"اگر آپا کو پتا چل جائے کہ تم جھوٹا بہانہ کر کے مجھے یہاں لائی ہو۔ وہ بھی اس بات کے لیے تو غضب ہو جائے۔" طلال نے گھبرا کر اردگرد یوں دیکھا جیسے رخسار اچانک کسی کونے سے نمودار ہو کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لے گی۔
"اف! میرے خدا! کیا تم عمر بھر ایک ہاتھ کا انگوٹھا منہ میں ڈالے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی آپا کی انگلی پکڑے ہی چلتے رہو گے؟" مشائم نے دونوں ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا تھا اور طلال تصور کر کے مسکرا رہا تھا۔
"تمہیں ہنسی آرہی ہے؟" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔
"ٹھیک ہے ہنستے رہو لیکن ایک بات میں صاف صاف بتا دیتی ہوں۔ تمہاری آپا کی دادا گیری میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ساری زندگی گھٹ گھٹ کر میں نہیں جی سکتی۔ اس لیے میں شادی سے انکار کر رہی ہوں۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر ریستوران سے باہر نکل گئی۔
"م۔ مشائم۔ مشی! میری بات تو سنو!" وہ بھاگتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔
"کیا جی لو گی میرے بغیر؟" وہ راستہ روک کر اس کے مقابل کھڑا براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"ہاں! جی لوں گی۔ ساتھ رہ کر بھی تنہا ہونے سے بہتر ہے نا۔" مشائم نے نظریں جھکائی تھیں۔
"مگر میں۔ میں مر جاؤں گا مشی۔" وہ گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔
اسے ایک طرف دھکیل کر وہ آگے بڑھی۔
"رکو! اچھا بابا کچھ سوچتے ہیں نا۔" اور مشائم رک گئی۔
"مرنے سے ڈر گئے؟"
"نہیں' تمہارے بغیر جینے سے۔"
"تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ ان کے لیے جو تم نہ کر پائے' وہ میں نے کر دکھایا۔" وہ مسکرا رہی تھی۔
"آخر میرے ڈیڈ میں کمی کیا ہے؟"
"یوں تو کمی میری آپا میں بھی نہیں ہے' مگر وہ دونوں نہیں مانیں گے۔"
"ڈیڈ سے میری بات ہو چکی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ اپنی آپا سے تم خود بات کر لو۔" وہ آخری بال گنگلی کروا کر آگے بڑھ گئی تھی اور طلال وہیں کھڑا سوچ رہا تھا۔
"ہمت کروں تو کیچ چھوڑ دوں تو بولڈ۔"

☆ ☆ ☆

دو لہناپے کا روپ اور کسی چاہنے والے کا ساتھ ہر لڑکی کے دل کی اولین خواہش ہوتی ہے مگر اسے کوئی خواہش کرنے کا وقت ہی کب ملا تھا۔ بیٹیوں کی خواہش کو سینت سینت کر رکھنے والی ماں اور ان کی تکمیل کے لیے تگ و دو کرنے والے باپ کی ہستیاں اس کی زندگی میں ایک ہلکی سی چھب دکھا کر منظر سے غائب ہوگئی تھیں۔ اور وہ گڑیوں سے کھیلنے کی عمر میں زندگی کی کٹھن ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے لگی۔ ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے دائیں بائیں بکھرے خوابوں پر دھیان کرنے کی اسے فرصت ہی کب ملی تھی۔

"اب مگر اب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بے یقین تھی۔

"طلال سچ کہہ رہا ہے؟ کیا حسنات غنی واقعی مجھ سے شادی کے خواہش مند ہیں؟" اس نے آئینے سے سوال کیا تھا مگر جواب سے دماغ متفق نہیں ہو پا رہا تھا۔

عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ مرد کی نظر کے زاویے سے سوچ کا مفہوم پڑھ لیتی ہے۔ اس نے حسنات غنی کی آنکھوں میں جو کچھ پڑھا تھا دل چپکے چپکے اس کی گواہی دے رہا تھا۔

"خیر! بڑے میاں اب اتنے برے بھی نہیں ہیں۔" آئینے سے کوئی بولا تھا۔ "اگر ہیر اسٹائل تبدیل کرلیں اور ان موٹے اداکاروں کی طرح شوخ رنگ کی ٹی شرٹ پہن لیں تو فیصل قریشی نہ سہی نعمان اعجاز تو لگ ہی سکتے ہیں۔"

وہ اپنی سوچ پر خود ہی ہنس دی۔ "مگر میرا موٹاپا۔"

"ارے! نہیں بھئی اب میں اتنی بھی موٹی نہیں ہوں۔" اس نے آئینے کو گھورا۔

"بس حسنات کچھ زیادہ ہی اسمارٹ ہیں۔ پھر بھی چلے گا۔ ...شش میں یہ کیا سوچنے لگی۔" وہ جھینپ کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

رخسار کے "ہاں" کہتے ہی جیسے سب پھر سے جی اٹھے تھے۔ مشائم خاص طور پر قلانچیں بھرتی پھر رہی تھی۔ "شادیوں" کی تیاریاں نئے سرے سے شروع ہوگئی تھیں۔ لیکن اب مشائم کو کوئی فکر نہیں تھی کہ رخسار اپنی تیاریوں میں اس پر نظر رکھنا بھول چکی تھی۔ اس نے طلال کے ساتھ جا کر اپنے لیے عروسی جوڑا منتخب کیا۔ طلال کے لیے بھی اپنی پسند سے لباس بنوایا۔ غرض ہر چیز یا ہی مشورے سے لی۔

دونوں مہندیوں کا اکٹھے انتظام کیا گیا تھا۔ پھر اگلے روز سینئر جوڑے کا نکاح ہونا تھا۔ اس کے بعد طلال کی بارات اور آخر میں دونوں جوڑوں کا ولیمہ بھی ایک ہی دن ہونا طے پایا۔ یہ تمام دن خوشی سے بھرپور تھے۔ کئی ایک مواقعوں پر طلال کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے مشائم کو اپنے اس بھیانک خواب کی یاد آئی تو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"ہوں تو جناب یہ وجہ تھی آپا اور انکل کی شادی کروانے کی۔" شادی کی رات جب اس نے طلال کو اپنا خواب سنایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"انی وے' تھینکس فور یور پلان' کیونکہ آپا بہت خوش ہیں اور مجھے ان کی خوشی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔" طلال نے اسے ممنون نظروں سے دیکھا۔

"وہ احساس جرم جو اپنی شادی کی بات کرتے ہوئے میں نے ہمیشہ اپنے دل میں محسوس کیا تھا۔ آج اس سے رہائی مل گئی ہے۔ تھینکس ونس اگین۔"

وہ اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں اپنی محبت کی پہلی نشانی پہناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنکھ کھلی تو ایک انوکھی اور بہت خوب صورت صبح اس کی منتظر تھی۔ شاور لینے کے بعد وہ بیڈ روم میں آکر بال بنانے لگی۔ آئینے سے اس نے ایک نظر طلال پر ڈالی' جو اب تک خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔

"طلال! اب اٹھ بھی جاؤ۔" مشائم نے قریب آکر کمبل کھینچا تو وہ ذرا سا کسمسایا۔

"سونے دو نا جان!" خمار آلود آواز میں کہہ کر اس نے کروٹ بدل لی تھی۔ آج نیند کا بھی اپنا ہی مزا تھا۔ محبت بھی میسر تھی اور بے فکری بھی۔ اچانک کسی کونے سے آپا کے پکار لینے کا اندیشہ نہیں تھا۔

"طلال! دیر ہو جائے گی بھول گئے' آج ہم نے ہنی مون کے لیے نکلنا ہے۔"

مشائم نے ذرا سا جھکتے ہوئے اپنے گیلے بالوں کو جھٹکا تو پانی کے کئی قطرے اس کے چہرے پر آگرے۔

"اٹھو' مشی کی بچی۔" وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اور مشائم ہنستی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

"کتنا سکون' کس قدر اطمینان ہے۔ اب میری زندگی میں کسی آپا کی حکمرانی کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں۔" اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے ارد گرد دیکھا اور گنگناتے ہوئے ناشتا بنانے باورچی خانے میں چلی گئی۔

بیرونی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔

"مشائم پلیز! باہر دیکھنا۔ میں واش روم جا رہا ہوں۔" طلال نے کمرے سے آواز لگائی۔

"اچھا! لیکن جلدی کرو' ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" اس نے چین سے آملیٹ پلیٹ میں نکالا اور آگ بند کر کے باہر آگئی۔

گھنٹی بجانے والا بہت بے صبرا تھا۔ شاید وہ بٹن سے ہاتھ اٹھانا ہی بھول گیا تھا۔

"یہ اتنی صبح کون آگیا' پڑوس سے کوئی خاتون آئی ہوں گی مبارک باد دینے' اف! اب یہ گھنٹہ بیٹھیں گی۔ ہم پہلے ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔" وہ خود ہی جوڑ توڑ کرتی دروازے تک آئی تھی۔

"ڈیڈ... آپا... آپ لوگ! (اتنی صبح کیا ایمرجنسی ہوگئی) ارے! بہت اچھا کیا' آپ لوگ آگئے۔" ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیتے ہوئے وہ مروت سے بولی۔

"آپ شاید رسم نبھاتے ہوئے ہمارے لیے ناشتا لائی ہیں۔" آہستہ آہستہ چل کر لاؤنج تک آتے ہوئے اس نے ان کی آمد کی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ لیکن ادھر ادھر نظر دوڑانے پر خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ دونوں خالی ہاتھ تھے۔

"ہم نے سوچا اچانک جا کر سرپرائز دیتے ہیں۔" ڈیڈ نے آپا کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیسا سرپرائز؟" مشائم کے پلے کچھ نہیں پڑا۔

"تم لوگ آج ناردرن ایریاز کے ٹرپ پر جا رہے ہو نا؟" ڈیڈ نے رخسار کے گرد بازو حائل کرتے ہوئے گفتگو میں وقفہ دیا۔

"تمہاری ممی کہنے لگیں' جانا تو ہمیں بھی ہے۔ پھر کیوں نا اکٹھے چلیں' کمپنی بھی رہے گی اور اس طرح ہم' تم لوگوں کی دوری سے اداس بھی نہیں ہوں گے۔"

"کیا...!!! یعنی آپا کے ساتھ ساتھ اب ڈیڈ بھی... یک نہ شد دو شد... نہیں ای ای ای..."

چکرا کر گرتی مشائم کو کمرے میں داخل ہوتے طلال نے بھاگ کر اپنی بانہوں میں سمیٹا تھا۔
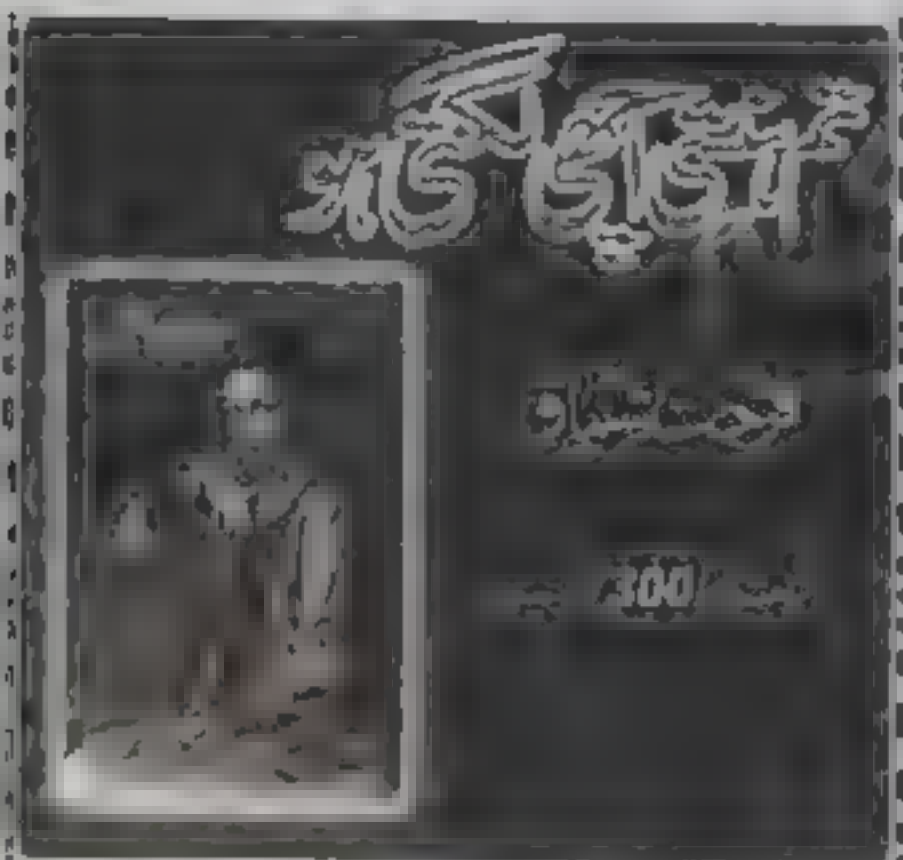
☼

عالیہ بخاری

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دل دار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے بنا بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے۔ جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ کچی تڑاکی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو۔ رفاہی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعاگو ہیں۔

۶۳

تریسٹھویں اور آخری قسط

کمرے میں نیلاہٹ مائل ہلکی سی روشنی تھی!

اور اس ٹھنڈے، معطر ماحول میں وہ ان کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے انہوں نے اس کی
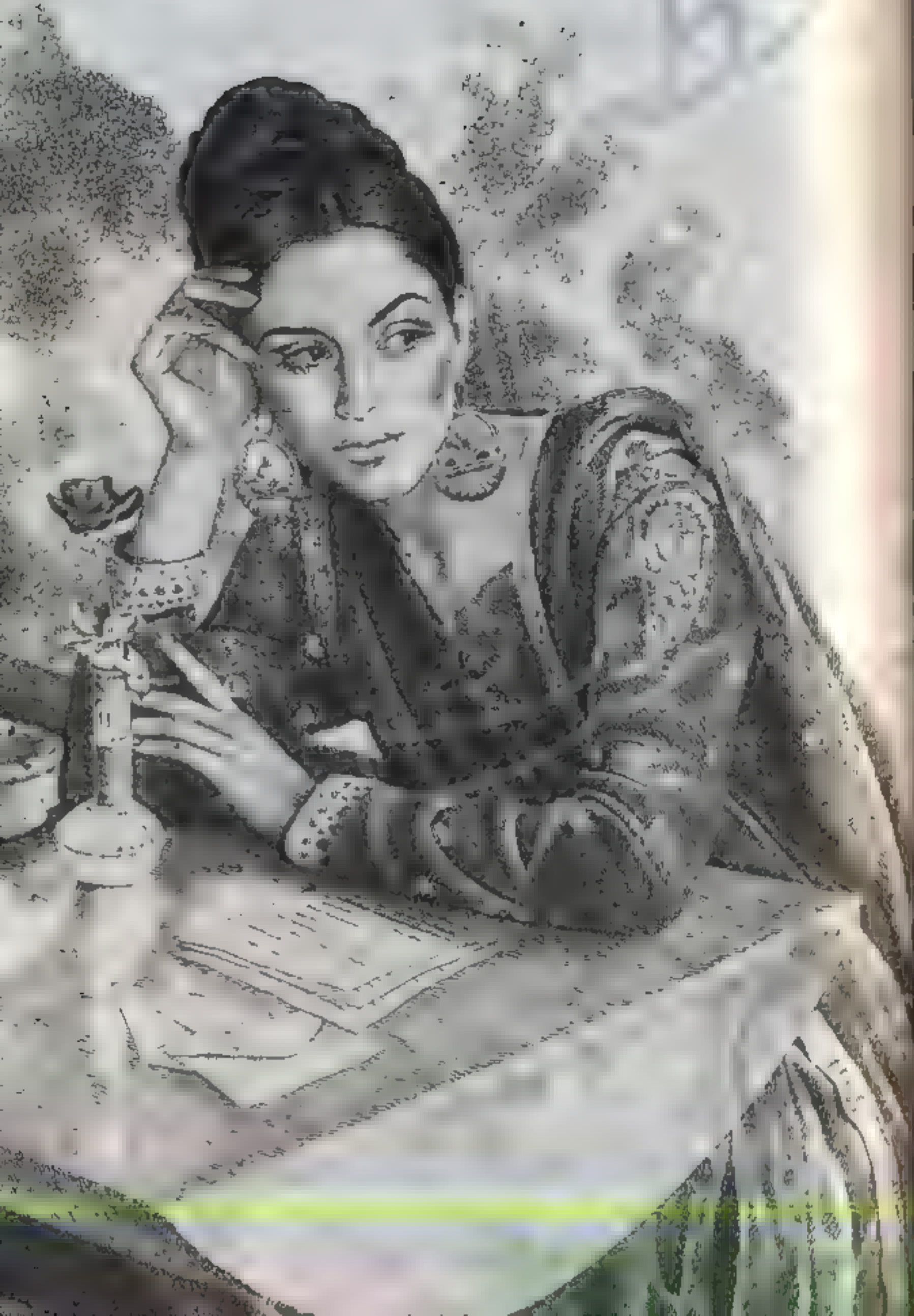
سمت دیکھا۔ دل بہت زور سے دھڑکا۔ مگر نیم اندھیرے سے نگاہ مانوس نہیں ہو رہی تھی۔

"شاید اب دن میں بھی خواب دکھائی دینے لگے ہیں۔"

دکھے ہوئے دل کے ساتھ 'وہ اپنے حال پر رحم کھا کر پھر سے آنکھیں بند کرنے لگی تھیں کہ اس نے پھر سے انہیں پکارا۔

"تائی۔۔۔ تائی اماں میں ہو خیام۔" اس بار وہ ان کے قریب بیٹھا تھا اور ان کا کمزور سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما تھا۔

"آپ کا خیام۔"

وہ حیرت اور خوشی کی آخری حد کے بھی پار آ کر کھڑی ہوئیں۔

"میرا خیام۔۔۔ میرا۔۔۔"

وہ بے تابی سے اٹھیں اور الفاظ ٹوٹ کر ان کی زبان سے ادا ہوئے۔

خیام بے اختیار ان کے گلے سے لگا۔

تائی کا کمزور وجود ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

خیام کا دل شرمندگی اور احساس جرم کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔

کتنی گہری اور مسلسل تکلیف کا سبب بنا تھا وہ ان کے لیے۔

یہ وہ کب تھیں 'جو بد ترین حالات اور ناقابل برداشت دکھ کو جھیل کر بھی پورے وقار کے ساتھ ہمیشہ کھڑی رہیں۔ جن کے فن کا ڈنکا زمانے میں بجا اور جنہوں نے عروج سے زوال کے سفر میں اپنی وضع داری اور شرافت دونوں ہی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔

خیام نے ان کے آنسوؤں سے اپنی قمیص کا گریبان گیلا ہوتا محسوس کیا تھا۔

"اور یہ محض اس کی نالائقی کا رونا کب تھا۔" اس نے بے حد دکھ کے ساتھ سوچا۔

شاما تائی کے پاس پانی کی ٹھنڈی بوتل رکھنے آئی تھی۔ اندر کا منظر دیکھ کر الٹے قدموں دوڑی تھی۔

کمرہ آہستہ آہستہ بھرتا چلا گیا۔

سب سے پہلے دوڑی بھاگتی نگینہ آئی تھی۔ حواس باختہ سی اور پھر صندل 'استاد فراغت بیگ اور خیام کے پیچھے آنے والے یوسف کمال۔

آج پہلی بار وہ تائی ستارہ کے چوبارے پر فخر سے سر اٹھا کر کھڑے تھے۔

خیام واپس آ گیا۔

پورے محلے کے لیے آج کی سنسنی خیز خبر یہی ٹھہری تھی۔

☼ ☼ ☼

سرخ پتھر کے فوارے سے سفید موتی جیسا پانی 'یکساں رفتار سے بہے چلا جا رہا تھا۔

وہ دونوں تھوڑی دیر پہلے ہی ٹھیک اس کے سامنے پڑی بینچ پر آ کر بیٹھے تھے۔ یہ اس وسیع و عریض اسپتال کے اطراف میں پھیلے ان گنت چھوٹے چھوٹے خوب صورت سبزہ زاروں میں سے ایک تھا۔

جویا نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔

فضا میں سبزے اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو تھی۔

معاذ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "بالکل ایسا نہیں لگ رہا ہے۔ جیسے ہم دونوں یہاں ڈیٹ پر آئے ہیں۔

زمانے سے چھپ کر ایک پر فضا مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ سچ پوچھو تو میری بڑی پرانی آرزو تھی یہ کہ میں اور تم کہیں بالکل اکیلے گھومنے جائیں۔ سو آج یہ بھی پوری ہوئی۔"

"کیا بکواس ہے۔" جویا کو اپنی مسکراہٹ دبانی پڑی۔ "مت بھولو کہ یہ اسپتال ہے۔ جہاں میرا علاج ہو رہا ہے اور ہم یہاں تک صرف واک کرنے آئے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے نا کہ ہم یہاں اس خوب صورت جگہ پر بالکل اکیلے بیٹھے ہیں۔ کسی کی بھی بری نگاہ سے دور۔ سماج کی کوئی ظالم دیوار بیچ میں نہیں۔"

"کل میں گھر چلی جاؤں گی۔" جویا نے ٹھیک سے اس کی بات کو سنا بھی نہیں۔

معاذ نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا۔

"تم سے کیا ذرا دیر کے لیے بھی خوش نہیں رہا جاتا ہے جویا؟"

وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"میں بہت دنوں سے بہت خوش ہوں معاذ۔ کوئی بھی شخص کم از کم اپنی بیماری پر اتنا خوش کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ جتنا کہ میں۔۔۔ کاش! میں کبھی بھی ٹھیک نہ ہوتی۔ دن بہ دن حالت بگڑتی چلی جاتی۔ یہاں تک کہ۔۔۔"

معاذ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔

"اپنے پر نہ سہی 'میرے حال پر رحم کرو۔" وہ ایک دم بے حد سنجیدہ ہوا۔ اس کی نگاہ جویا کے چہرے پر جمی تھی اور آنکھوں میں اتنے دنوں میں پہلی بار بڑی شدت کا گلہ تھا۔

جویا نے شرمندگی سے سر جھکایا تھا۔

"سب کا خیال 'سب کی ذمہ داریاں پوری کرتے کرتے 'وہ اس شخص کے لیے سب سے بڑے دکھ کا سبب بنی تھی 'جو اس کی محبت کا سب سے بڑا حق دار تھا۔ جس نے دنیا میں اس کے علاوہ کسی کو نہ چاہا تھا اور جو ساری زندگی امید کی ایک کرن بھی نہ ہونے کے باوجود اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ وہ اس انتہائی قیمتی شخص کو ٹھکرانے کا گناہ بار بار کرتی رہی۔ پھر اس کے بغیر زندگی گزارنے کا دعوا محض ریت کی دیوار کیوں ثابت ہوا؟"

"تم نے خود کو مٹا ڈالا۔ تم نے مجھ کو مٹا ڈالا۔ پھر بھی۔۔۔" اسے خود کو سنبھالے رکھنے میں ذرا دقت کا سامنا ہوا۔

"تم اتنی اذیت پسند تو نہیں تھیں جویا۔ مجھے تو خود سے زیادہ تمہارے جذبے پر یقین تھا۔ یاد ہے وہ وقت 'جب میں کھل کر تم سے 'اظہار چاچا' آپا گل 'سب سے بے زاری کا اظہار کرتا تھا 'لیکن تم کسی ایک بات کا بھی برا مانے بغیر نرمی سے مسکراتی رہتی تھیں۔ تمہاری نگاہوں میں وہ یقین ہوتا تھا کہ میرے سارے لفظ جھوٹے پڑتے تھے۔ تب مجھے لگتا تھا کہ تم میرے دل میں جھانکنے کی پوری طاقت رکھتی ہو۔ تم وہ جانتی ہو 'جو میرے دل میں ہے۔ مجھے کبھی بھی تم سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن یقین کی اس آخری حد کو پار کر لینے کے بعد تم نے تو میرے پیروں تلے کی زمین ہی ہلا دی۔"

جویا کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نہ تو سر اٹھا کر معاذ کی طرف دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی بات کاٹنی چاہی تھی۔

اب جبکہ وہ سب کچھ بہت پیچھے جا چکا تھا۔ جس نے ان کی زندگیوں پر اچھا 'برا جیسا بھی اثر چھوڑا تھا تو انہیں دہرانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

تب بھی یہ گلے 'یہ شکایتیں بے حد قیمتی تھیں۔

"کاش! وہ بولتا رہے 'غصہ کرے 'اسے برا بھلا کہے۔" حلق میں اٹکتے آنسوؤں کو بہادری سے پیتے ہوئے اس

نے پورے دل سے تمنا کی۔
وہ معاذ کی محبتوں کے بھاری قرض تلے دبی تھی۔
کچھ تو ہو' جو اس پر سے یہ بوجھ کم ہو۔ اپنے احساس جرم سے نجات پا کر وہ کھل کر سانس لے سکے۔
"مجھے نہیں پتا تم نے ایسا کیوں کیا' حالات کتنے بھی برے سہی' نفرتیں کتنی بھی شدید ہوں محبت ان سب سے بڑی دلیل ہے جویا! ہم مل کر سب ٹھیک کر سکتے تھے' مگر تم نے مجھ پر بھروسا ہی نہ کیا۔ جس وقت مجھے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت تھی تم میرا ہاتھ جھٹک کر دور بہت دور چلی گئیں' مگر میں آج بھی وہیں اسی مقام پر کھڑا ہوں۔ نہ تم سے پہلے کوئی اور نہ تمہارے بعد۔ میری زندگی اس ایک نام کا طواف کرتے گزر رہی ہے اور گزرے گی۔"
اس کا لہجہ' اس کے الفاظ' سب ہی درد میں ڈوبے تھے۔
جویا نے پتا نہیں کس لمحے میں اپنا ضبط کھویا تھا۔
معاذ کی نگاہ اس کے بھیگتے دامن پر پڑی تھی۔
"اوہ خدا! جویا پلیز... یہ کیا ہے یار...؟" وہ بری طرح گھبرایا تھا۔ بھلا وہ کیوں بھول تھا کہ جویا کی حالت اس جذباتی صورت حال کو سہنے کے قابل نہیں ہے۔
وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر روئے جا رہی تھی۔
"جویا... جویا ایسے نہیں' پلیز میری خاطر... پتا نہیں کیا ہوا تھا مجھے۔ اتنا بڑا اسٹوپڈ ہوں میں اب تک... سوری دیکھو' معافی مانگ رہا ہوں۔"
جویا نے اس کے دونوں جڑتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے تھے۔ خود پر قابو پانے میں اسے ابھی چند مزید لمحے درکار تھے۔
"مگر اس شخص کا کیا بھروسا۔ اگر وہ اس طرح روتی رہی تو پتا نہیں کیا کر ڈالے۔"
"میں ٹھیک ہوں۔"
معاذ نے ایک سکون بھری سانس لی۔
"ایک طرح سے تو تمہارے ابا مجھ سے ٹھیک ہی چڑتے تھے۔ غلطیاں تھیں بھی تو بہت میری۔ اب تک مزید ہو رہی ہیں۔ اب دیکھ لو! بے کار میں ہی تمہیں رلا دیا۔" وہ اب واپس اپنے موڈ میں آ رہا تھا' لیکن اس بار وہ مسکرائی تک نہیں۔
"کاش! ہم بہت پہلے یہ سب ایک دوسرے سے کہہ سن لیتے معاذ! تو شاید زندگی کی صورت کچھ اور ہوتی۔ حالانکہ تم تو کتنی بار آئے۔ مگر میں... میں نے تمہیں اس نفرت سے بچانا چاہا تھا معاذ' جو وہ سب تم سے کرتے تھے۔ میرا دل گوارا ہی نہیں کرتا تھا کہ تم ان میں سے ایک بات بھی سنو' جو وہ کہتے ہیں۔"
"میرے لیے کچھ بھی اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہو سکتا جویا... جو تم نے جھیلا... اکیلے... تنہا... اور میں..."
"میں اکیلی کب تھی معاذ؟" اس نے بے ساختگی سے معاذ کی بات کاٹی۔
وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔
"چلو! چلتے ہیں۔ کہیں زویا نہ آ گئی ہو۔ ورنہ ڈھونڈتی رہے گی۔" وہ بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
جواباً" معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔
اس کا ہر انداز معنی خیز ہوتا تھا اور وہ ان مطلب معنوں سے ہی نگاہ بچا کر چلتی رہی تھی۔
"اٹھ جاؤ معاذ! بس۔" اس بار وہ آگے بھی چل دی تھی۔ سو وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ابو بہت بدل گئے ہیں معاذ! وہ بالکل ٹوٹ چکے ہیں۔ مجھے ان سے بہت محبت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں ان

سے کہوں کہ وہ کوئی فکر نہ کریں۔ اس سب میں وہ اکیلے قصوروار نہیں ہیں۔ پورا گھر اس جرم میں برابر کا شریک ہے۔"
جویا کی اپنی نگاہ یہ سب کہتے ہوئے شرمندگی سے جھکی تھی۔ معاذ نے خود کو بہت بے چین محسوس کیا۔
"لیکن مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کئی سال سے وہ مجھ سے بات چیت نہیں کرتے۔ پہلے تو میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ خود پر سارا کنٹرول کھو دیتے تھے وہ۔ ان کی قہر بھری نگاہ..." اس کی آواز میں گہرا سہم طاری ہوا تھا۔
"آپا گل کہتی تھیں' میں ان کے سامنے بالکل نہ آؤں۔ میں اس لیے اسکول یا کوچنگ سینٹر میں سارا دن رہتی اور پھر اپنے کمرے میں بند..." اس کے ساتھ ساتھ چلتے وہ دھیمی آواز میں جو کچھ سنا رہی تھی' وہ سب سننا بھی معاذ کے لیے آسان نہیں تھا۔
"سخت گرمی' لوڈشیڈنگ' کچھ بھی تو اس حبس بھرے کمرے سے باہر آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ تمہیں پتا ہے کہ..." معلوم نہیں وہ آگے اور کیا سنانے والی تھی۔
"ایک منٹ!" معاذ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "تم یہاں رکو' میں ابھی آیا۔" اس کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے ایک سمت بڑھتا چلا گیا۔
جویا کی نگاہ اسی طرف جمی تھی۔
اسپتال کے احاطے میں بنی وہ ایک فلور شاپ تھی' نرم و نازک پھولوں سے بھری دکان جن کی تازگی اور خوب صورتی کو یہاں سے بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔
معاذ وہیں گیا تھا۔
"شاید کسی کے لیے پھول لینے۔"
یہاں اسپتال میں اس کے ایک جاننے والے گزشتہ رات داخل ہوئے تھے۔ سو وہ یوں ہی مڑ کر دوسری طرف سے آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ تب ہی اس نے عقب سے معاذ کی آواز سنی۔
"جویا!" وہ ٹھیک پیچھے ہاتھوں میں سرخ گلاب لیے اس کا منتظر تھا۔ جویا کی نگاہ ان پھولوں سے ہٹ کر معاذ کے چہرے پر جمی۔ سو وہ نرمی سے مسکرایا تھا۔
جویا نے بہت رشک سے اس کی طرف دیکھا۔
امید کی ایک بھی کرن نہ ہونے کے بعد بھی اس کی خوش گمانی کی کوئی حد نہ تھی۔
تو کیا ضروری تھا کہ وہ ہر بار اس سے چند لمحوں کی خوشی کو بھی چھینتی رہے...
جویا نے کانپتے ہاتھوں سے اس سرخ کھلتے گلاب کو تھاما۔
"نیک فال۔" معاذ نے دھیمے سے کہا اور ہنس پڑا۔

☼ ☼ ☼

دوپہر بادلوں بھری تھی۔
آپا گل' سلمان کے ساتھ سرگوشیوں میں جانے کیا باتیں کیے جا رہی تھیں۔ زویا جب بھی لاؤنج میں آتی' وہ فوراً" خاموشی اختیار کر کے نگاہیں ٹی وی پر جما لیتی تھیں۔
زویا کو عجیب سا تو لگا تھا۔ لیکن براہ راست کچھ پوچھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔
آپا گل اور سلمان دونوں کی طرف سے کوئی اچھی امید ختم ہوئے بھی ایک عرصہ گزر چکا تھا۔

"اس زویا کو بالکل بھنک نہ ہونے پائے۔ ورنہ ضرور کوئی گڑبڑ کردے گی۔ کل جویا گھر آرہی ہے۔ اس وقت تک کوئی بھی بات نہ نکلے تو ہی اچھا ہے۔ سن رہے ہو نا تم سلمان!"

آپا گل نے ایک بار پھر ذرا سخت لہجے میں تنبیہ کی۔

شاکرہ امی کے بعد انہیں کسی بھی خبر کے لیک کرنے کا خطرہ سلمان کی طرف سے ہی رہتا تھا۔

اتنی دیر میں اتنی بار اسے خبردار کیا تھا کہ اب وہ صاف صاف چڑ رہا تھا۔

"تم مجھے کیا بار بار جتا رہی ہو آپا گل۔ مجھے نہ جویا کی شادی میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی تمہارے اس فریدالدین میں۔ مجھے تو کچھ پیسہ دلا دو جو میں تم سے جان چھڑوا کر کسی دوسرے ملک جاسکوں اور پھر کبھی پلٹ کر اس نحوست بھرے گھر اور تم لوگوں کی طرف دیکھوں بھی نہیں۔"

"تف ہے تم پر۔ کوئی شرم حیا مروت کچھ بھی تو باقی نہیں رہا تم میں سلمان۔ بڑے بڑے خودغرض دیکھے۔ مگر تم سے بڑا کوئی بھی نہیں ہے۔"

"کیوں؟ روزانہ آئینہ نہیں دیکھتی ہو کیا؟" وہ جواباً بڑی کمینگی سے مسکرایا تھا۔

زویا تب ہی دوبارہ لاؤنج میں آئی تھی۔

آپا گل پر سلمان کا جواب ابھی ادھار تھا۔

اور یہ تو طے ہے کہ وہ اس بدلحاظ اور گھٹیا سلمان کو ایک پائی بھی نہیں لینے دیں گی۔ ساری عمر یں جوتیاں چٹخاتا پھرے گا۔

اپنی عادت کے مطابق انہوں نے فوری بدلہ چکانے کی ٹھانی تھی۔

"میں جب سے آئی ہوں امی سو رہی ہیں۔ کب اٹھیں گی آخر؟" زویا ان دونوں میں سے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر پوچھ رہی تھی۔

"ساری رات جاگتی ہیں۔ اب دن میں نیند آتی ہے تو سونے دو انہیں۔ اور تم کیوں بے کار میں دیر کر رہی ہو؟ جویا وہاں اکیلی ہے۔ یہاں میں ہوں سب کچھ دیکھنے کے لیے۔"

زویا نے کچھ چونک کر آپا گل کی طرف دیکھا۔ ان کا لہجہ خلاف عادت بے حد نرم تھا۔

"وجہ؟"

اس نے آپا گل اور سلمان دونوں کی طرف دیکھا مگر دونوں ہی نگاہ چرا گئے۔ ان سے پوچھنا محض وقت ضائع کرنا تھا۔

اسپتال جانے سے پہلے اسے کچھ ضروری چیزیں لینی تھیں۔ سو وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"میرا بس چلتا تو جویا کو اسپتال سے سیدھا اپنے گھر لے جاتی اور پھر وہیں سے نکاح کرکے رخصت کر دیتی۔ بڑے ہی سکون سے سارا کام ہو جاتا۔" آپا گل نے اس کے جانے کے بعد کہا تھا۔

"تو لے جاؤ جویا کو۔ تمہیں کس نے منع کیا ہے۔ اچھا ہے وہیں سارا کام ہو جائے گا۔ یہاں تو بڑی گرمی ہے۔ اوپر سے فریدالدین نے ایک بھی اے سی نہیں لگوا کر دیا۔ میرا تو برا حال ہو رہا ہے۔"

سلمان دوسروں سے بھی بے زار تھا اور خود اپنے آپ سے شاید اور بھی زیادہ۔

"کیا مزے کی گرمیاں کٹتی تھیں زوسیہ کے ساتھ۔ پورا دن اے سی بند نہیں ہوتے تھے۔ میں تو قدم نہیں نکالتا تھا گھر سے۔"

"ہا آ!" آپا گل کے ماتھے پر پڑتے بل کی ذرا بھی پروا کیے بغیر اس نے عہد رفتہ کو یاد کیا۔

"ہوش کے ناخن لو سلمان، تم!" آپا گل کا دل چاہا کہ وہ کہیں سر پھوڑ لیں۔ کسی کو بھی سر پر آئی مصیبت کی پروا نہیں تھی۔ ایک وہی تھیں جو ہلکان ہوئے جا رہی تھیں۔

"کتنی بار بتاؤں کہ یہ آخری موقع ہے۔ فریدالدین جیسے احمق روز روز نہیں ملا کرتے اور یہ کہ..." سلمان نے بے زاری سے ہاتھ ہلا دیا۔

"مجھے سب یاد ہو چکا ہے کہ فریدالدین کے علاوہ کوئی بھی ہماری ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے والا نہیں ہے۔ تم دہرانے کی زحمت مت کرو۔ ویسے یہ جویا کا نکاح تمہارے گھر سے ہونے کا آئیڈیا اچھا ہے۔ بات کرو اکبر بھائی سے۔"

"وہ... وہ کہاں دکھائی دیتے ہیں۔ بہت مصروف ہیں۔ کاروبار بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر دوسرے مہینے تو چائنا جاتے ہیں اور ہم..."

"میں جویا کے نکاح کی بات کر رہا ہوں۔ اگر وہ تقریب تمہارے گھر پر ہو جائے تو بہت اچھا رہے گا۔ یہاں اس گرمی میں لوگوں کو جمع کرنا تو مصیبت کو دعوت دینا ہی ہے۔" اس کے الفاظ میں کسی دور پرے کے جاننے والے جیسی لاتعلقی تھی۔

"اوں ہوں!" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں نیچے کی منزل میں میری سسرال ہے اور میری ساس تو ویسے ہی جویا کے غم میں مری جاتی ہیں۔ شروع سے اس کی اور معاذ کی بات طے ہونے کے بارے میں جانتی ہیں۔ سوان کی سوئی وہیں اٹکی ہے۔ فریدالدین کو دیکھ کر سو باتیں بنائیں گی۔ یہیں ٹھیک ہے۔ گنتی کے چار لوگوں کو تو آنا ہے۔"

سلمان کچھ کہنے جا رہا تھا لیکن آپا گل کے اشارے پر اسے خاموش رہنا پڑا۔

زویا اسپتال واپس جا رہی تھی۔ یہی اطلاع دے کر اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

وہاں کسی کو اس کے آنے جانے میں دلچسپی نہیں تھی۔ سو خاموش رہے۔

وہ چپ چاپ سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی۔

تب ہی نیچے کی جانب سیڑھیوں کا دروازہ دھاڑ سے کھول کر آپا گل کی دونوں بیٹیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی آئیں۔ تیز تیز بولتی ہوئی وہ دونوں اس کے قریب سے گزرتی ہوئی سیدھی اوپر چلی گئیں۔

ان میں سے کسی کو سلام کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔

یہ آپا گل کی بیٹیاں تھیں۔ ان ہی کی تربیت یافتہ... ان ہی کی کاپی۔

زویا نے بڑے تاسف سے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

جس ہنگامہ خیز انداز میں وہ دونوں آئی تھیں۔ شاید کوئی ضروری بات تھی۔

مگر اس کے لیے قطعی غیر ضروری۔ زویا تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

اوپر آپا گل کے ہاتھ ایک نئی مصروفیت آئی تھی۔

"دادی تو کل سے بڑی پھپھو کے گھر ہیں۔ اب صبح چاچو اور چھوٹی پھپھو بھی وہیں جا رہے تھے۔ ہمیں یہاں چھوڑتے ہوئے گئے ہیں۔"

بیٹیوں کی زبانی نے اس مختصر سے بیان میں آپا گل کے لیے بڑی سنسنی خیزی تھی۔

"جب سب وہاں جا رہے تھے تو تمہیں یہاں چھوڑ کر جانے کا مطلب... ضرور کوئی خاص بات ہے۔ تم لوگوں نے پتا تو کیا ہوتا کم از کم کیا چکر ہے۔ آگئیں منہ اٹھائے یہاں..."

انہیں بیٹیوں پر غصہ آرہا تھا اور وہ ترکی بہ ترکی جواب دیے جا رہی تھیں۔

"ہم پر کیوں غصہ کر رہی ہیں؟ دو دن سے آپ خود یہاں بیٹھی ہیں۔ آپ کو خود کون سی گھر کی فکر ہے؟ ابو

بے چاروں کے سارے کام تو دادی اور پھپھو کرتی ہیں آج تک۔"
"تو تم کس لیے ہو؟ اتنا ہی دکھ ہے باپ کا تو ناشتا کھانا تو دیکھ ہی سکتی ہو نا۔"
"ہمیں آپ نے کچھ سکھایا ہی نہیں۔ ہمیں آتا ہی کیا ہے؟ اور آپ کو خود کیا آتا ہے؟" بنا کسی شرم لحاظ کے جواب در جواب۔
بات کہاں سے کہاں جا رہی تھی۔
"واہ آپا گل!" سلمان منہ پر ہاتھ رکھے بس ہنسے ہی چلا جا رہا تھا۔
آپا گل نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور موبائل پر نمبر ملانے لگیں۔ ایک کے بعد ایک۔
"کم بخت کوئی تو اٹھا لے۔" انہیں بہت زور کا غصہ آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

ربیعہ یوں ہی بے دھیانی میں چلتی ہوئی پچھلے احاطے میں آئی تھی۔
ابھی شام کی چائے میں تھوڑا وقت باقی تھا اور فی الحال کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ یا پھر کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔
امی کے بتائے ڈھیروں کاموں کو یاد کر کے اس نے ایمان داری بھرا تجزیہ کیا۔
ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر جویا کی خیریت معلوم کی تھی۔ کل وہ بھی ڈسچارج ہو کر جانے والی تھی۔
سو یہ بھی مقام شکر تھا۔
ان دنوں جتنی دعائیں جویا کے لیے مانگی تھیں۔ شاید اپنے لیے بھی نہیں۔
"خدا کرے کہ سب کچھ بہت اچھا ہو جائے۔" ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ احاطے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔
معاذ کی غیر موجودگی میں گھر اتنا خالی خالی لگتا تھا کہ حد نہیں۔ پورے گھر پر غضب کا سناٹا۔
اطراف پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اس کا دل بری طرح گھبرایا۔ اس گھر میں پھیلی اداسی، معاذ کی خوشیوں کے ساتھ مشروط تھی۔
"پیارے اللہ میاں جی! معاذ کو اکیلا مت چھوڑیے گا۔ وہ ڈیزرو کرتا ہے۔ پلیز۔ اسے تنہائی کی نظر مت ہونے دیں۔ بہت ساری خوشیاں عطا کریں۔ وہ پورے دل کے ساتھ اپنی زندگی گزارے۔"
محبت بھری یہ دعائیں کب سے معمول کا حصہ تھیں۔ آج بھی پورے خشوع و خضوع کے ساتھ وہ سر جھکائے کیا کیا مانگے گئی اور جب آمین کہہ کر سر اٹھایا تو چہرہ آنسوؤں سے گیلا تھا۔
ربیعہ نے دوپٹے سے گیلے ہوتے چہرے کو خشک کیا۔
احاطے میں بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور چنبیلی کے پھولوں کے جھنڈ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔
اس جگہ وہ ہمیشہ بخوشی گھنٹوں بیٹھتی آئی تھی۔ بچپن میں ہوم ورک لے کر بیٹھتے ہوئے، دادی کے ساتھ اخبار کی خبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے، معاذ کے ساتھ فضول بحث مباحثہ کرتے ہوئے اور خوشی اور الجھنوں کے کتنے ہی موقعوں پر۔
اس جگہ کے ساتھ اس کی ایک خاص انسیت رہی تھی۔ مگر اب بہت دنوں سے یہ جگہ اسے اداس کرنے لگی تھی۔
یہاں آکر بیٹھتے ہی وہ سب بے ساختہ یاد آتا تھا۔ جس سے نگاہ چرا کر وہ اس گھر میں اپنے قیام کے یہ بالکل آخری دن بھی گزار دینا چاہتی تھی۔

"بعض انکشافات کتنے بے وقت اور فضول ہی ہوتے ہیں، اچھی بھلی سیدھی سادی زندگی کو تہہ و بالا کر دینے والے۔" وہ جیسے ٹھیک سامنے آکر کھڑا ہوا تھا۔
اور اس کی بے حد خوب صورت آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ایک بالکل جدا دوسرا بھی رنگ تھا۔
کچھ لوگوں کی آنکھیں واقعی باتیں کرتی ہیں۔ بنا لاگ لپٹ کے۔ صاف واضح مدعا بیان کرنے والی۔
ربیعہ نے بے چین سا ہو کر پہلو بدلا۔
"اور وہ شخص جو آپ کی زندگی میں آ رہا ہے۔ یقیناً" بہت امیر ہوگا۔"
دن رات میں کتنی ہی بار یہ سرگوشی اس نے سنی اور ہر بار۔ آنکھ کے کونے کونے پر ٹکے آنسو کو اس نے انگلی کی نوک سے گرایا۔
"خدایا!" گھٹنوں پر سر ٹکاتے ہوئے اس نے چند لمحوں کے لیے ارد گرد کے پورے ماحول سے ناتا توڑا۔
"کاش وہ بھی خیام کو بتا سکتی کہ اسے کھو دینے کے بعد وہ دنیا کی غریب ترین لڑکی قرار پائے گی۔" قدرے فاصلے پر بائیں ہاتھ پر کمرے کی کھلی کھڑکی میں کھڑے اسلام صاحب نے بہت فکر مندی سے ربیعہ کو دیکھا۔
وہ افسردہ تھی، بلکہ بے حد افسردہ، اس بات میں انہیں اب ذرا بھی شک نہیں تھا۔ بہت دنوں سے نہیں تھا اور باوجود کوشش کے وہ اس افسردگی کا سرا نہیں پکڑ پا رہے تھے۔
زندگی کے سب سے سنہری دور میں قدم رکھتے ہوئے ان کی بے حد سادہ دل، بے غرض اور خدمت گزار بیٹی ناخوش تھی۔
"کیا اسے یہ بے حد اچھا رشتہ ناپسند تھا؟"
خاموش، ساکت کھڑے اسلام صاحب کی آنکھوں میں الجھن کا تاثر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
کیسی عجیب بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے دونوں بچوں کو خوش اور مطمئن دیکھنے میں مستقل ناکام تھے۔
انہوں نے مڑ کر میز پر سے اپنا موبائل اٹھا کر ربیعہ کے سسر کا نمبر ملایا۔
پچھلے دو دن سے یہ نمبر آف تھا۔
ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

نانی ستارہ کے کمرے سے کچن تک کے چکر کرتے کرتے شاما ہلکان ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ آج خیام نے اس کی بنائی ہوئی چائے بھی پی تھی، کھانا بھی کھایا اور پھر تعریف بھی کی۔
گھر کے سوتے اداس ماحول میں خوشی کی لہر بے حد دوڑی تھی۔
خیام کا واپس مڑ کر آنا، خاندان بھر کے لیے اتنی بڑی خوشی تھی۔ جس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔
نانی ستارہ کے چہرے پر اس کھوئی ہوئی چمک کا پتا مل رہا تھا۔
استاد فراغت بیگ اپنی ساری بیماریوں کو یکسر بھولے تھے۔
اور نگینہ جیسی سخت دل بھی خیام کو گلے لگا کر جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اس سے خیام خود خاصا شرمندہ تھا۔
یہی خالہ تھی، جس کی محنت کے بل بوتے پر گھر چل رہا تھا اور جس سے اس نے کبھی سیدھے منہ بات تک نہیں کی تھی۔
آج صندل بھی سب کے ساتھ بیٹھی تھی اور آہستہ آہستہ خیام کے ساتھ نہ جانے کیا بات کر رہی تھی۔

کمالی صاحب کی نگاہ بار بار ان دونوں پر پڑ رہی تھی۔
صندل کے حسن میں فیروزہ کی نمایاں جھلک تھی اور ان کا بیٹا بھی تو کسی سے کم نہیں۔
وہ کچھ سوچ کر مسکرائے۔
اس گھرانے کی شرافت اور اپنائیت کے وہ برسوں پہلے قائل ہو چکے تھے۔ جب فیروزہ نے ان کی خاطر ٹھیک عروج پر سب کچھ چھوڑا تھا۔
فیروزہ کی یاد بھری محفل انہیں آج بھی تنہا کرتی تھی۔ کسی نے بھی ان کی چند لمحوں کی اداسی کو محسوس نہیں کیا۔ آج صرف اور صرف خوش رہنے کی بات چلی تھی۔
نانی ستارہ اور نگینہ دونوں ہی کمال صاحب کے اصرار کے باوجود کراچی مستقل شفٹ ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں۔
"آتے جاتے رہیں گے بیٹا! لیکن مستقل طور پر نہیں رہا جائے گا وہاں۔۔۔ ساری عمر یہاں لاہور میں گئی ہے۔ اب ہمیں یہیں رہنے دو۔"
کمال صاحب لاہور والی کوٹھی کی چابی ساتھ لائے تھے۔
"اماں! آپ دو بیٹوں کی ماں ہیں، ایک میری اور دوسری خیام کی۔"
انہوں نے کہا تو نانی ستارہ کو تو تھا۔ لیکن نگینہ مارے ممنونیت کے بڑی دیر تک روتی رہی۔
اس کے اعصاب اب بالکل کمزور پڑ رہے تھے۔
خیام اس کے کندھے پر بازو پھیلائے بڑی دیر تک تسلی دیے گیا۔
آج پہلی بار اسے ایسی سچائی کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ نگینہ خالہ کی زندگی اس سے کہیں زیادہ مشکل اور تلخ گزری ہو گی۔ خیام کی نگاہ بار بار نانی ستارہ کے بھاری سنگھار دان پر پڑ رہی تھی۔ اس کے قدیمی عطردان، منقش کٹوری، جیولری باکس، سب کچھ ویسا ہی تھا۔
یہیں سے اس نے نانی ستارہ کا وہ زیور اٹھایا تھا۔ جس پر وہ آج تک خود کو معاف نہیں کر سکا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا سوچتی ہوں گی اس کی اس حرکت کے بارے میں۔" اس نے چور نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ شاما کو کچھ ہدایت دے رہی تھیں۔
خیام نے ماتھے پر آتا پسینہ صاف کیا۔
"ماں صدقے کیا گرمی لگ رہی ہے؟" نگینہ نے پاس پڑا ہوا اخبار اٹھا کر اسے جھلنا شروع کیا۔ "ایک تو اماں نے آج تک اپنے کمرے میں اے سی بھی نہیں لگوایا۔ کہہ کہہ کر تھک گئی۔ مگر ان کے آگے کس کی چلی ہے۔"
خیام نے آنکھوں میں آتے پانی کو خاموشی سے رگڑ ڈالا۔ اے سی آج تک خالہ نگینہ کے کمرے میں بھی نہیں لگا تھا۔ جب تک وہ یہاں تھا۔ سوائے اس کے کمرے کے اے سی کی ضرورت کہیں اور محسوس نہیں کی گئی تھی۔
سخت گرمی میں جب وہ پورے چین اور سکون کے ساتھ اپنے کمرے میں اکیلا سوتا تھا۔
جان توڑ محنت کرنے والی خالہ نگینہ، تھکن سے چور، کہیں بھی بے سدھ ہو کر سوتی تھیں۔
وہ کس درجے خود غرض تھا۔
ان سب سے ساری آسائشیں حق کی طرح وصول کرتا رہا اور اپنا ایک چھوٹا سا فرض بھی ادا نہ کر سکا۔
اس نے خالہ نگینہ کے ہاتھ سے نرمی سے وہ اخبار لیا تھا۔
"مجھے بالکل گرمی نہیں لگ رہی ہے خالہ۔۔۔! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
"اچھا! تھوڑی دیر جا کر اپنے کمرے میں آرام کر لو۔" وہ پھر بھی اصرار کیے گئی۔

نانی ستارہ نے بڑی طمانیت سے نگینہ کی طرف دیکھا۔
ساری عمر خیام اور فیروزہ کی محبت کا طعنہ دینے والی نگینہ کا اپنا دل خیام کی محبت سے لبریز تھا۔
شاید وہ ان سب سے زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ بس اس کے حالات نے ہی اجازت نہیں دی تھی۔
خیام نے بیٹھے بیٹھے دل میں بہت سارے فیصلے کیے تھے۔ جن میں سرفہرست نگینہ اور صندل کے لیے بہت کچھ کیا جانا تھا اور ساتھ میں استاد فراغت بیگ، شاما۔
کمال صاحب استاد جی کو کراچی ساتھ چلنے کی دعوت دے رہے تھے اور وہ مسکرا مسکرا کر منع کیے جا رہے تھے۔
"سب کے ساتھ ہی آؤں گا کمال میاں۔۔۔ اکیلے آنے جانے کی بالکل بھی عادت نہیں ہے اور اب اس عمر میں تو ہمت بھی باقی نہیں رہی۔"
"لڑی میں پروئے گئے موتیوں کی طرح ہے یہ گھرانہ بیٹا! سب ایک سے ایک بندھے ہوئے۔"
کمال صاحب آرام کرنے کے خیال سے کمرے میں چلے گئے تھے۔ مگر یہاں کمرے میں ابھی بھی عید کا سماں تھا۔
"شاما! مٹھائی کی ایک پلیٹ بھر کر گلناز کی طرف بھی دے آ۔۔۔ جل مریں گے سب کے سب۔ اتنی توفیق نہ ہوئی کہ آ کر مبارک باد ہی دے جاتے اماں کو۔ خبر تو مل گئی ہو گی خیام کے آنے کی۔" باہر برآمدے سے ہی نگینہ شاما سے کہہ رہی تھی۔
خیام بے ساختہ ہی مسکرا دیا۔
"خالہ نگینہ اگر ایسی باتیں نہ کریں تو کتنی ادھوری ادھوری سی لگیں۔"
رات گہری ہو رہی تھی۔
خیام کو آرام کی ہدایت دیتے ہوئے ایک ایک کر کے سب ہی اٹھ گئے۔
اسے حیرت ہو رہی تھی کہ کسی نے بھی اس سے۔ یہاں سے جانے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔
وہ کیوں گیا، کہاں رہا، کیا بیتی۔
کوئی سوال نہیں
یہ ان کا ظرف تھا
شاما نے نانی کے کمرے کی ہلکی روشنی آن کی اور دروازہ برابر کر کے باہر نکل گئی۔
کمرے میں بڑی پرسکون سی ٹھنڈک پھیل رہی تھی۔
"تم بھی سو جاتے۔ سفر کر کے آئے اور پھر سارا دن بیٹھے بیٹھے ہو گیا ہے۔" نانی ستارہ نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسہری پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔
"میں تھوڑی دیر آپ کے پاس بیٹھوں گا نانی!" وہ اٹھ کر ان کے قدموں کے پاس آ بیٹھا۔
"یہاں نہیں، ادھر یہاں۔"
وہ چپ چاپ ان کے اور قریب ہوا۔
نانی کی نگاہ خیام کے چہرے پر جمی۔
اس کی نظر جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر کشمکش کا سا تاثر تھا۔
"میرا پیارا بچہ! نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا چکا ہے۔ اکیلا دنیا کو آزمانے نکلا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں۔"
خیام کی ان دیکھی مصیبتوں کے بارے میں سوچ کر ہی ان کا دل بھر آ رہا تھا۔
بنا کچھ کہے انہوں نے خیام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے تھپکا۔

"کیا ہوا؟ کچھ کہنا ہے؟"
خیام کا سر تھوڑا سا اور جھکا' جو کچھ وہ کہنا چاہ رہا تھا' اس کے لیے الفاظ کو ترتیب دینا محال ہو رہا تھا۔
"وہ... میں وہ۔" الفاظ بے ربط انداز میں ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے۔
"خیام بیٹا!" نانی کا شفقت بھرا ہاتھ اس کے گھنے بالوں پر آکر پڑا۔
وہ دوسرے لمحے ہی ان کے گلے لگا رو رہا تھا۔
"کیا ہوا بیٹا! خیر تو ہے نا... کوئی بات ہوگئی ہے کیا؟" وہ ششدر سی ہوئی پوچھ رہی تھیں۔
"آپ کا زیور... مجھ سے بڑی غلطی ہوئی نانی۔ پلیز! مجھے معاف کر دیجیے۔ پلیز! مجھے پتا نہیں کیا ہوا تھا۔"
ایک سکوت بھری سانس نانی ستارہ کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ وہ اس زیور کو اس دن بھلا چکی تھیں' جس روز وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔
"میری سب سے قیمتی شے تم ہو بیٹا۔ سونے چاندی کے ان ٹکڑوں کی اوقات ہی کیا ہے۔ تم نے ان کا بے کار کا غم کیا۔ تم میری زندگی میں واپس آگئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ خبردار جو اب یہ بات دہرائی۔"
وہ آنسو صاف کرتا ہوا کونے میں رکھے اس چھوٹے سے بیگ تک گیا جو اس کے سامان کے ساتھ تھا۔
"یہ کیا ہے؟"
نانی ستارہ نے اس کے دیے ہوئے چھوٹے سے پیکٹ کو کھولتے ہوئے' حیرت سے اس سے پوچھ بھی لیا۔ مگر جواب ان کے سامنے ہی تھا۔
گیتی کی چوڑیاں۔
"یہ آپ اسے دے دیجیے گا۔ شکر ہے کہ یہ بچ گئی تھیں۔ میں نے تب سے سنبھال کر رکھی تھیں۔" خیام کی آواز دھیمی تھی۔
"وہاں کراچی میں' میری ہمت نہیں ہوئی اسے دینے کی۔" اس کے کندھوں سے بوجھ سا اترا تھا۔
نانی ستارہ نے غور سے خیام کا چہرہ دیکھا۔ اچانک ہی ایک بڑے برے وہم نے دل کو گھیرا تھا۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟" اب وہ مسکرا رہا تھا۔
"تمہیں گیتی آرا کی شادی کا دکھ ہوا ہے خیام... جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔"
"بالکل نہیں۔" اس نے بہت پرسکون انداز میں سر نفی میں ہلایا۔
"وہ سالار جیسے بہترین شخص کی بیوی بنی ہے نانی! اور وہ دونوں ہی اتنے اچھے ہیں کہ ایک دوسرے کو ڈیزرو کرتے ہیں۔ میں انہیں ایک ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوں۔"
اس کے لہجے میں اتنا اطمینان تھا کہ انہیں دوسرا سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔
"شکر ہے خدا کا۔" نانی ستارہ کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ کتنی ہی بار یہ خیال آیا تھا کہ کبھی اگر خیام نے واپس آکر گیتی کے بارے میں سوال کیا تو وہ اسے کیا جواب دے سکیں گی۔
"جاؤ! اب جاکر سو جاؤ بیٹا۔ رات بہت ہو رہی ہے۔"
"جی!" اس نے جھک کر نانی کی پیشانی پر پیار کیا۔ "شب بخیر!" نانی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو پھر سے پھیلے تھے۔
خیام بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے تک آیا تھا۔ یہ کمرہ آج بھی ویسا تھا' جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ بیڈ خالی تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ واش روم کی لائٹ جل رہی تھی۔ کمرے کا دوسرا دروازہ' سہ دری کی طرف کھلتا تھا۔

وہ چپ چاپ اس طرف نکل آیا۔
محلے کی رونقیں شاید پہلے سے بھی زیادہ تھیں۔
میوزک' تھاپ' آتم نمبر' رنگ برنگی روشنیاں۔
نیم اندھیرے میں ڈوبی سہ دری میں کھڑا وہ چپ چاپ ان سب کو دیکھے گیا۔ محسوس کیے گیا۔
یہاں گزری ساری زندگی' وہ اس سب سے وحشت کھاتا رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ سہ دری کی طرف کھلنے والے اس دروازے کو شام ڈھلے سے سختی سے بند رکھتا تھا۔ مگر آج وہ یہاں آکھڑا تھا۔
ایک کنفیوژڈ کمپلکس کے مارے' بدمزاج لڑکے کے بجائے ایک سلجھے ہوئے ذہن اور منصف مزاج شخصیت میں ڈھل کر۔ اس نے جان لیا تھا کہ نفرت کے مستحق لوگ نہیں۔ یہ سسٹم ہے اور اس سسٹم کو برقرار رکھنے والے۔ یہاں کرآ کوئی اور پھر آ کوئی اور ہے... پتا نہیں کون کون' کس کا کفارہ ادا کرتے ہوئے زندگی جیسی قیمتی شے کو مٹی کرتا ہے اور یہ محرومی یہ بے بسی' محض اس بازار کا ہی رونا کب ہے؟
"خیام! یہاں کیوں کھڑے ہو بیٹا؟" یوسف کمال کمرے کا کھلا دروازہ دیکھ کر یہاں آئے تھے۔
"کچھ نہیں بابا... آئیں! اندر چلیں۔" وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا اندر آگیا۔
"آپ کو ابھی تک نیند نہیں آئی؟"
"ہاں! شاید جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے۔ ویسے مجھے تم سے ایک ضروری بات بھی کرنی تھی۔ سوچا تمہاری رائے پہلے لے لوں۔ بہتر ہوگا۔"
"کیسی بات بابا؟" خیام نے الجھن سی محسوس کی۔
"میں صندل کے بارے میں تمہاری مرضی جاننا چاہتا تھا خیام! مجھے وہ اچھی لگی اور میرا خیال ہے کہ..." خیام کے لیے ان کا آئیڈیا سننا بھی محال ہوا تھا۔
"ایسا سوچیے گا بھی نہیں آپ..."
انہوں نے کچھ چونک کر خیام کی طرف دیکھا۔
"کیا برائی ہے؟ مجھے تو لگا کہ تم لوگ ایک دوسرے کو سوٹ کرتے ہو۔ ساتھ پلے ہو۔ آپس میں انڈر اسٹینڈنگ بھی آسان ہوگی۔ میں بات کرنے والا تھا ان لوگوں سے۔"
اپنے باپ کی جلد بازی اور جذباتیت کا وہ بجا طور پر قائل ہوا تھا۔
شاید اس کی ماں سے شادی بھی ان کا کوئی ایسا ہی فیصلہ کروا گیا ہوگا۔
"شکر ہے جو آپ نے کسی سے بات نہیں کی۔ یہ میرے لیے بالکل ہی ناقابل قبول ہے اور صندل کے لیے بھی۔" اس نے پورے یقین سے ان کی طرف دیکھا تھا۔
"ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو بہن بھائی کی نگاہ سے دیکھا ہے ہمیشہ بابا! صندل کو تو سن کر ہی بہت برا لگے گا۔" اس کے واضح اور دو ٹوک جواب سے بات اصولاً "ختم" ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن...
"تو پھر وہ کون ہے؟ مجھے اس کا نام بتا دو۔"
خیام نے خالی خالی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بنا پلک جھپکائے اس کی طرف متوجہ تھے۔ جیسے اس کے اندر تک جھانک رہے ہوں۔
"میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں بیٹا۔ جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی ہے جس کی محبت میں تم گم ہو۔"
"آپ... آپ کیسے جانتے ہیں۔" خیام نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

جواباً وہ صرف مسکرائے تھے۔
خیام کے لیے راہ فرار اور بھی مشکل ہوئی۔
"اب اس بات کا کوئی فائدہ نہیں ہے بابا! ہمارے راستے بالکل علیحدہ ہیں۔ آپ رہنے دیں پلیز!"
"تم مجھے صرف اس کا نام بتاؤ خیام! آگے میں جانوں اور میرا کام۔" اس بار ان کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔
خیام پر اپنے باپ کی شخصیت اب پرت در پرت کھلتی جارہی تھی۔
وہ ضدی بھی تھے اور اپنی بات منوانے کی عادت اب پختہ ہوچکی تھی۔
"مگر کیا ضروری تھا کہ وہ اس بے حد ذاتی معاملے کے پیچھے پڑیں۔" وہ اندر ہی اندر جھنجلایا۔
"میں کچھ پوچھ رہا ہوں؟" باپ کے لہجے کا بڑا فطری سا تحکم تھا۔
"اس کی اب شادی ہورہی ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا ہمارے بیچ۔ بس میں یوں ہی۔۔۔"
گڑبڑاتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ ان کی تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنا کام پورا کرچکے تھے۔
"میں سمجھ گیا۔۔۔ اسلام بھائی کی بیٹی نا۔۔۔؟" وہ پورے یقین کے ساتھ مسکرائے۔
خیام نے انہیں بے بسی سے دیکھا تھا۔
"ہم کل پہلی فلائٹ سے واپس جارہے ہیں۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔" بہت سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ بیڈ پر لیٹ چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

دادی کے کمرے میں بڑی پررونق سی افراتفری تھی۔
نیچے کارپٹ پر ربیعہ کے پیک ہوئے جوڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اب یہ غالباً "آخری سوٹ تھا۔ جو شائستہ بیگم کے سامنے رکھا تھا۔
خوب صورت جگمگاتا ہوا۔
انہوں نے بڑے سلیقے اور توجہ سے آخری ٹانکا لگایا اور پھر اسے بھی بڑے سے شاپر میں پیک کرنے لگیں۔
"لیجیے اماں! یہ کام بھی نمٹ گیا۔" انہوں نے ہاتھ میں تھاما ہوا سوٹ دادی کے سامنے رکھا۔
"ماشاء اللہ بہت خوب صورت' اللہ پہننا نصیب کرے۔" دادی بہت اشتیاق سے ایک ایک چیز دیکھتیں اور سنبھالتیں۔ ربیعہ کا سارا جہیز ان ہی کے کمرے میں جمع ہورہا تھا۔
ربیعہ کے چلے جانے کا ہول دل میں بار بار اٹھتا تھا' لیکن وہ دل کی دل میں دبائے' دعاؤں پر دعائیں کیے جاتیں' آج کل نمازیں پہلے سے زیادہ طویل ہورہی تھیں۔
ربیعہ اور معاذ دونوں ہی سے انہیں انتہا درجے کی محبت تھی۔
"خدا کرے کہ جلد میرے معاذ کی دلہن کے لیے بھی ایسی ہی تیاری ہورہی ہو اس کمرے میں۔"
ایک کے اوپر ایک جوڑے رکھتی شائستہ بیگم کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا۔
"ان شاء اللہ بہت جلد ایسا ہوگا اماں ایک دو لڑکیاں ہیں میری نظر میں ربیعہ کی شادی پر بلاؤں گی تو آپ ضرور دیکھ لیجیے گا اب اس کام میں بھی دیر نہیں کرنی ہے۔"
دادی خاموش سی ہوگئیں۔
یہ سب آسان نہیں تھا وہ جانتی تھیں۔
انہیں معاذ کا دکھ مایوس کیے دیتا تھا۔ بس میں ہوتا تو شاکرہ اور اظہار کے آگے ہاتھ جوڑ کر جویا کا رشتہ لے لیتیں۔

لیکن مسئلہ صرف ان ہی کا کب تھا؟
ان کی نگاہ پھر سے شائستہ بیگم پر جا کر رکی۔
چیزوں کو سمیٹتے ہوئے' ان کے چہرے پر بڑی فخریہ سی چمک تھی۔
"میرے دونوں بچے مقدر والے ہیں۔ لوگوں نے انہیں حقیر سمجھ کر ٹھکرایا اب بھگت رہے ہیں۔ دکھا دیا اللہ نے سر پکڑ کر رونے کی باری اب ان کی ہے۔ کیا ہوا آگے آرہا ہے نا۔" ایک کے بعد ایک درازیں کھولتے ہوئے وہ مستقل ہی بول رہی تھیں' دادی نے دل ہی دل میں خدا سے پناہ مانگی۔
وہ جو چیز ڈھونڈ رہی تھیں' انہیں مل گئی تھی۔
سنہرے کارڈوں کا خوب صورت بنڈل لیے وہ پھر سے دادی کے پاس آکر بیٹھیں۔
"بس آج یہ کارڈ بانٹنے کا کام بھی ختم کرنا ہے۔ معاذ کو اگر فرصت نہیں ہے تو میں خود جا کر دے آؤں گی خاندان بھر میں میں نے سوچ لیا ہے۔" وہ کارڈ پر لکھے نام چیک کررہی تھیں۔
دادی نے کچھ مضطرب سا ہو کر ان کی طرف دیکھا۔
"دے آتے معاذ' اور پھر خیام بھی تو آجائے گا ایک آدھ دن میں تمہارے پاس ویسے ہی بہت کام ہیں۔"
"معاذ پر شاکرہ کے کیے تعویز گنڈوں کا کنٹرول ہے اماں۔ میرے بیٹے کو چھین لیا ہے انہوں نے غلام بنا بیٹھا ہے وہاں بڑا ہی بے شرم بے غیرت خاندان ہے۔ جب تک حرام کی کمائی آرہی تھی ساتویں آسمان پر تھے دماغ اب بیٹی کو آگے کردیا ہے لڑکے پھنسانے کے لیے۔"
کارڈ چھانٹتے ہوئے وہ اس روانی سے تبصرہ کررہی تھیں کہ دادی ان کی بات بھی نہیں کاٹ سکیں۔
"کیا ہوگیا ہے شائستہ۔۔۔ جویا غریب نے کیا بگاڑا ہے تمہارا یا اپنے ماں باپ کا۔۔۔ وہ تو بری طرح پس کر رہ گئی۔ کیا حال ہوا ہے کہ دیکھ کر دل کانپتا ہے۔"
"میرا اب دل نہیں کانپتا ایسی باتوں پر۔" بے زاری سے سر جھٹک کر وہ باہر سیڑھیوں پر بیٹھی ربیعہ کو پکارنے لگیں۔
"اندر آؤ' اتنی گرمی میں کیوں بیٹھی ہو۔"
وہ ان کی ایک پکار پر ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔
"ایک تو اس لڑکی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ زمانے بھر کی لڑکیاں شادی کے نام پر خوش ہوتی ہیں۔ اور اس کا حال دیکھیں' رو رو کر آنکھیں سجا رکھی ہیں۔ آسٹریلیا جارہی ہے۔ کتنے اچھے لوگ ملے ہیں عیش کرے گی ساری عمر اور دعائیں دے گی ہمیں۔"
دادی نے ان کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شائستہ بیگم سے اب کوئی اچھی امید باندھنا فضول ہی تھا۔
"کوئی نام رہ گیا ہو تو بتا دیجیے۔" وہ ان سے پوچھ رہی تھیں۔
دادی نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔
"ویسے میں نے قریبی خاص خاص گھروں میں تو فون کر کے دعوت دے دی ہے۔ بظاہر تو سب نے خوشی کا اظہار کیا' لیکن دل سے کوئی خوش تھا۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے' مجھے پروا نہیں ہے اب۔ میرا معاذ بہت اچھی جاب میں ہے۔ اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے اسے۔ اس بیمار۔۔۔ روگی جویا کو۔۔۔"
سخت پریشانی کے عالم میں' دادی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسلام صاحب نے غرور اور تحقیر بھرے چند الفاظ ہی سنے تھے۔
"کیا ہوا بیٹا! خیر تو ہے نا!" دادی نے محض ان کی شکل دیکھ کر ہی کسی برے امکان کی خبر پالی تھی۔

"اختر کا فون آیا معذرت کا۔ اس کے بیٹے نے پچھلے ماہ شادی کرلی ہے۔ وہاں سڈنی میں ہی۔"
ان کی کاٹ دار حتاتی ہوئی نظریں شائستہ بیگم کے چہرے پر جمی تھیں۔
دادی نے بے اختیار ہی سینے پر ہاتھ رکھا۔
شائستہ امی کے ہونٹ نیم وا تھے اور آنکھوں میں انتہا درجے کی بے یقینی۔
"اب تو تمہاری تسلی ہوگئی شائستہ! ایسی ہی کسی بات کے ہونے سے ڈر رہا تھا میں' پناہ مانگ رہا تھا اللہ سے مگر تمہیں خوف خدا نہیں رہا ہے۔ ذرا بھی نہیں۔"
آج سے پہلے وہ کبھی اتنے غصے میں نہیں آئے تھے۔
"نفرت ہو رہی ہے مجھے تم سے۔۔۔ تمہارے غرور اور سنگ دلی نے تمہارے اپنے بچوں کی خوشیوں کو کھالیا' وہی غرور اور حقارت جو اظہار اور شاکرہ کے گھرانے کو خاک کرچکا ہے اور اب شاید ہماری باری ہے۔"
بات ختم کرکے ایک جھٹکے سے مڑکر وہ واپس باہر جاچکے تھے۔
شائستہ بیگم کے ہاتھوں سے سنہرے کارڈز کا بنڈل چھٹ کر زمین پر جاگرا تھا۔
انہوں نے لڑکھڑا کر بیڈ سے سہارا لینا چاہا۔
"ربیعہ' ربیعہ!" دادی بدحواس ہوکر چلائیں۔
ربیعہ بھاگتے ہوئے اندر کمرے میں آئی تھی۔
شائستہ بیگم بے سدھ ہوچکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زویا کے سہارے ٹیکسی سے اترتے ہوئے جویا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بالکونی خالی پڑی تھی۔ یہاں کس کو اس کا منتظر ہونا تھا بھلا؟
معاذ گاڑی تھوڑے فاصلے پر روک کر تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔
"اپنا بہت خیال رکھنا جویا! اور بالکل بھی مت گھبرانا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا اور دوائیں بہت پابندی سے لینا۔"
اس کا ہر انداز اس کی گہری محبت کی گواہی دیتا تھا۔
جویا نے آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو بمشکل روکا اور مسکرادی۔
"یہ ہوئی نا بات!" وہ یکدم خوش ہوگیا تھا۔ "زویا! بہت خیال رکھنا جویا کا اور خدانہ کرے کوئی پریشانی کی بات ہو تو مجھے فوراً فون کردینا۔"
"کیا کروگے تم؟" جویا نے جاتے جاتے مڑکر پوچھا۔
"میں!" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "میں وہی سلیمانی ٹوپی پہن کر تمہیں لینے آجاؤں گا' جو اب تک ہاسپٹل میں کام آرہی تھی۔ آیا سمجھ میں؟"
اس بار وہ دونوں ہنس پڑی تھیں۔
مشکل سے مشکل گھڑیوں کو آسان بنالینا۔ اس کا مخصوص انداز بھلا وہ ایسے پیارے انسان کی محبت میں گرفتار ہونے سے خود کو کیسے روک سکتی تھی۔ معاذ سے نگاہ بچاتے ہوئے جویا نے خود سے اعتراف کیا۔
"اور زویا! کسی بھی طرح اظہار چچا کو کنوینس کرلینا کہ وہ یہ گھر کل ہی چھوڑدیں۔ تم میرا نام مت لینا۔ اپنی کسی دوست کا ظاہر کردینا۔۔۔ اور یہ فرید الدین کے اس گھر کا کرایہ۔ اس کی توقع سے زیادہ ہی ہے۔"
اس نے ہزار کے کئی نوٹ زویا کے ہاتھ میں دیے۔

"میں کیا کہوں معاذ بھائی۔۔۔ جو کچھ بھی آپ نے کیا!" زویا کے لیے کچھ بھی کہنا مشکل ہوا تھا۔
ایک اعصاب شکن دور میں وہ جویا اور معاذ کے ساتھ ساتھ تھی۔
"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اب جاؤ تم دونوں۔۔۔"
وہ لوگ سیڑھیوں کے قریب کھڑے تھے۔ تب ہی اوپر سے آپا گل کے رونے کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی تھی۔
معاذ کی بے ساختہ سوالیہ نگاہ اوپر کی طرف اٹھی۔
"کچھ نہیں ہے۔" زویا نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔ "بس آپا کی سسرال والوں نے پچھلے ہفتے اکبر بھائی کا نکاح دوسری جگہ کردیا ہے انہیں کل خبر ہوئی ہے اس بات کی۔"
جویا اور معاذ دونوں نے چونک کر زویا کی طرف دیکھا تھا۔
اوپر سے آنے والی آواز میں اب شدت آرہی تھی۔
آپا گل' اکبر بھائی' اپنی سسرال' اپنی بیٹیوں اور خود کو کوس رہی تھیں۔
"کیسی ہنگامہ وہاں مچایا ہوگا۔ جب ہی وہ یہاں چھوڑ گئے۔ شکر نہیں کرتیں کہ انہوں نے طلاق نہیں دی اپنی بیٹیوں کی وجہ سے ورنہ ان جیسے لوگوں کا تو بدترین انجام بھی افسردہ نہیں کرتا ہے۔"
زویا نے بڑی لاتعلقی سے تبصرہ کیا اور جویا کا ہاتھ تھام کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
جویا نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ معاذ وہیں کھڑا تھا۔
دونوں کے چہروں پر ایک سی مسکراہٹ ابھری اور ایک سا یقین دلاتی چلی گئی۔
ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ گاڑی میں آبیٹھا تھا۔
صد شکر کہ وہ ٹھیک ہوکر گھر واپس آئی تھی اور اس مشکل ترین دور کو جھیل کر بھی وہ دونوں آج تک زندہ ہیں تو یقیناً "ایک دوسرے کے لیے ہی ہیں۔"
جذبے کی سچائی پر اس کا یقین اور بھی گہرا ہوا تھا۔ بہت پرسکون دل کے ساتھ گھر تک کا سفر کٹا تھا۔
آج شاید امی روز سے زیادہ ناراض ہوں گی۔ مگر وہ ان کی کسی بھی بات کا برا نہیں مانے گا۔
گھر پر معمول کی خاموشی چھائی تھی۔
لیکن حالات میں یقیناً "غیر معمولی پن تھا۔
اس نے برآمدے میں سے ہی دادی کے کمرے کا پورا کھلا دروازہ دیکھ کر کچھ عجیب سا محسوس کیا تھا۔
سامنے بیڈ پر شائستہ امی بیٹھی تھیں۔ ابا' دادی' ربیعہ سب ہی تھے۔ مگر ماحول پر جمی ٹینشن سمجھ میں آئی تھی۔
"کیا ہوا' خیریت تو ہے؟" اس نے ان سب کی طرف دیکھا تھا۔
ابا اور ربیعہ کا چہرہ بے تاثر تھا۔ لیکن دادی اور امی شاید خاصا رو چکی تھیں۔
ان میں سے کسی نے بھی فوری جواب نہیں دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر بھر پر بڑی دم گھوٹتی سی کیفیت طاری تھی۔
آپا گل رو رو کر بے دم ہوئی جارہی تھیں۔ پھر بھی وقفہ وقفہ سے ان کی آہیں ماحول کو اور بوجھل کررہی تھیں۔
تھوڑی دیر پہلے اکبر بھائی بھی ہوکر گئے تھے اور ان کی آمد پر جس بڑے معرکے کی توقع تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر رونما نہ ہوسکا تھا۔
"تماشا کھڑا کیا" تو ایک منٹ نہیں لگاؤں گا طلاق دینے میں۔ بھول جاؤں گا کہ یہ بچے صرف تمہارے نہیں'

میرے بھی ہیں۔ تم جیسی بدفطرت عورت کے ساتھ یہ نام کا رشتہ بھی رکھنا صرف میری مجبوری ہے' کچھ اور نہیں۔"

ان کے لہجے اور آنکھوں میں آپا گل کے لیے جو نفرت تھی۔ وہ ان جیسی دبنگ عورت کو پانی کے بلبلے کی طرح بٹھا چکی تھی۔

"اٹھارہ سال ایک جہنم میں گزارے ہیں میں نے۔ صرف اپنی شرافت کی وجہ سے۔ ورنہ تم جیسی عورت کو تو بہت پہلے نکال باہر کرنا چاہیے تھا میرے ماں باپ' میرا خاندان ایک مستقل عذاب سے گزرا ہے تمہاری وجہ سے' اپنی عزت کی خاطر سب نے اپنی زبانیں بند کرکے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑے رکھا۔ لعنت بھیج چکے ہیں۔ وہ سب تم پر بہت پہلے اور تم جیسی بیج' جاہل یہ سمجھتی رہی کہ تم نے سب کو دبا کر رکھا ہے۔ اسی لیے کوئی تمہارے آگے نہیں بولتا۔ تف ہے تم پر گل اور تم جیسی عورتوں پر جو شریف خاندانوں میں عذاب بن کر اترتی ہیں۔"

لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر انہوں نے اتنی اونچی آواز میں یہ سب کہا کہ پورے گھر نے باآسانی سنا تھا۔ آپا گل نے امداد طلب نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ شاکرہ امی۔ سلمان۔ ابو۔

وہ سب جنہیں ان کے حق میں بولنا تھا۔ اتنے لاتعلق تھے۔ جیسے۔ آج وہ بالکل تنہا تھیں۔

اکبر بھائی نے جیب سے ایک چیک نکال کر اظہار صاحب کے آگے رکھا تھا۔

"یہ اس سامان کی قیمت ہے' جو کبھی جویا کے جہیز کے لیے لیا گیا تھا اور گل نے ہتھیا لیا تھا۔ میرے ہزار بار منع کرنے کے باوجود بھی۔ یہ مجھ پر آپ کا قرض تھا۔ جویا اور زویا کا قرض تھا۔ جو آج بھی میرے لیے بیٹیوں کی طرح ہیں۔"

لاؤنج کے سرے پر کھڑی زویا نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو خشک کیا۔

آپا گل کی بدقسمتی کی کوئی انتہا بھی تھی یا نہیں؟ اکبر بھائی جیسا نیک اور صاحب کردار شخص جو کسی رحمت بھرے پل میں انہیں عطا ہوا تھا۔ آخرکار چلا گیا۔

"میں اپنی بیٹیوں کو اس عورت کے حوالے زیادہ عرصے نہیں کر سکتا۔ اسی لیے دونوں کے رشتے طے کر دیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو دو چار سال میں اس قرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں گا۔ آپ بھی کوشش کریں کہ جویا اور زویا کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ ورنہ اللہ کے آگے جواب دہی سے نہ بچ سکیں گے۔"

وہ زیادہ دیر نہیں رکے تھے۔

آپا گل دکھ' ذلت اور بے بسی کی ملی جلی سی کیفیت میں مبتلا تھیں۔

"دیکھ لیا سب کو۔ کوئی بھی تو میری حمایت میں نہیں بولا۔ کیا نہیں کیا میں نے تم سب کے ساتھ۔ اپنا گھر تک تو برباد کر لیا۔ یہاں کے مسئلے سلجھاتی رہی اور وہاں وہ سب مل کر میرے خلاف چال چل گئے کمینے۔"

وہ اونچی آواز میں روتے ہوئے دفعتاً اظہار صاحب کی طرف بڑھیں۔

"مجھے دیں یہ چیک۔ یہ میرے پیسے ہیں۔" جھپٹا مار کر انہوں نے وہ چیک اظہار صاحب کے ہاتھ سے لینا چاہا' مگر وہ صفائی سے بچا گئے۔

"یہ تمہارے پیسے نہیں ہیں گل۔" بہت سختی سے انہوں نے کہا تھا۔

سلمان نے تعریفی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"بہت اچھے ابو۔ اور آپا گل بہتر ہو گا اب تم خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ یہاں اس گھر میں بھی تماشے کھڑے کرو گی تو کہاں جاؤ گی' سوچ لو۔"

"میرے ولائے ہوئے گھر میں سر چھپائے ہوئے ہو سب لوگ' یہ میں تھی جس نے فریدالدین کو تمہیں یہ گھر دینے پر راضی کیا۔ میرے ایک اشارے پر وہ سب کو باہر نکال سکتا ہے۔ پھر کہاں جاؤ گے ضرور پتا چلا۔"

وہ بولتے بولتے یک دم خاموش ہو گئیں۔ آج ان کی دھمکیوں نے وہ سہم طاری نہیں کیا تھا جو پچھلے کئی سال سے اس خاندان کا مقدر رہا ہوا تھا۔

سلمان لاپروائی سے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا اور اظہار صاحب بڑے مطمئن انداز میں اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا چیک دیکھ رہے تھے اور ان کی اپنی بیٹیاں بالکونی میں کھڑی کسی بات پر مستقل ہی ہنسے جا رہی تھیں۔

کسی نے شاید ان کی بات ڈھنگ سے سنی بھی نہیں تھی۔

کسی کو ان پر پڑنے والی افتاد کی رتی بھر بھی پروا نہیں تھی۔ وہ اچانک ہی بالکل خاموش ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھیں۔

"مکافات عمل!" زویا نے کمرے میں آتے ہوئے جویا کو دیکھ کر کہا۔ "جو سبق آپا گل نے اپنے اچھے وقت سے حاصل نہیں کیا۔ اللہ کرے کہ برے وقت سے ہی سیکھ جائیں۔" جویا اس کی شکل دیکھتی رہی۔

"اور وہ..."

"کیا؟" زویا نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"وہ فریدالدین..." نام لینے میں بھی قدرے دقت کا سامنا تھا۔

"کچھ نہیں کر سکتا اب' بے فکر رہو۔" زویا کھلکھلا کر ہنسی۔

"کیا مطلب؟" جویا کا دل زور سے دھڑکا۔

"تھوڑی دیر پہلے آیا تھا اکبر بھائی کے معرکے کے وقت' میں نے بتا دیا اسے کہ ہم صرف اس کے کرایے دار ہیں۔ پابندی سے کرایہ دیں گے اور وہ جب چاہے گا' ہم اس کا گھر خالی کر دیں گے' بات ختم۔" جویا کی آنکھیں حیرت سے کھلیں۔

"تم نے یہ سب کہا؟"

"کرایہ بھی دے دیا' جو پیسے معاذ بھائی نے دیے تھے۔ فریدالدین کاروباری آدمی ہے۔ اس کا نقصان پورا ہو رہا تھا۔ خوش ہو گیا۔ آپا گل سے اپنا حساب وہ خود لے گا۔ اس میں ہمارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔" اپنی بات کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑی۔

"اور تم نے کیا قسم کھائی ہے کہ معاذ بھائی کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے نہیں مسکراؤ گی۔" اس نے جویا کو ذرا ناراضی سے دیکھا تھا۔

اس بار وہ ہلکے سے بے ساختہ ہنسی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کا آخری پہر آہستگی کے ساتھ گزر رہا تھا۔

خاموش' پرسکون' بھید بھرا۔

اس وقت کی قبولیت مستند تھی۔ وہ ہمیشہ کی سحر خیز تھیں۔ مگر آج کی رات تو پلک تک نہیں جھپکی تھی۔

طویل سجدے سے سر اٹھا کر وہ بڑی دیر تک دعا مانگتی رہیں۔

ربیعہ کے حوالے سے دل پر پڑنے والی چوٹ کی اذیت کسی طرح بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اللہ کی مرضی۔ مصلحت' تقدیر کا لکھا۔

کتنے ہی جواز دہرائے گئے تھے۔

ساری عمر صبر و شکر سے گزر کرنے کے بعد، زندگی میں آئی آسانیوں اور کامیابیوں پر فخر کرنا اتنا بڑا گناہ بھی نہیں تھا کہ یوں پیروں تلے سے زمین کھسکی تھی۔ مہان، اعلا اوصاف رکھنے والے شوہر نے اس طرح برملا نفرت کا اظہار کیا ان کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے۔

سارے خاندان اور ملنے والوں میں ربیعہ کی شادی کی خبر نشر تھی۔ بات طے ہونے کی مٹھائی انہوں نے خود گھر گھر جا کر تقسیم کی تھی۔ وہ سب جنہوں نے کبھی جویا اور معاذ کا رشتہ ختم ہونے کے ساتھ، ربیعہ اور سلمان کے رشتے کے خاتمے پر بھی دکھ کا اظہار کیا تھا۔ ان سب کو جتانا ضروری تھا کہ وہ اور ان کے بچے اب خسارے میں نہیں ہیں۔

ربیعہ کے مقدر کا ستارہ جگمگا رہا تھا۔۔۔ اور بد قسمتی نے اظہار شاکر کا گھر دیکھ لیا ہے۔ اپنی تمام باتوں میں وہ یہ تکرار لگانا قطعی نہیں بھول رہی تھیں۔۔۔ اور خود کو سو فیصد حق بجانب سمجھتی آرہی تھیں۔

ایک طویل عرصے کی صبر آزما مشقت اٹھاتے ہوئے، شاکرہ اور اظہار کی بخشی ہوئی اذیت انہوں نے ہی سہی تھی۔ سو اب اس کے واپس کرنے کا وقت تھا۔

انہیں اپنی کوئی بات، کوئی ادا غلط نہیں لگی تھی۔ اللہ نے آج انہیں ترجیح دی تھی۔ وہ مقام جو پہلے دوسروں کا تھا۔ اب ان کا تھا۔

یہ ان کا یقین تھا۔ جو گزشتہ شام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکا تھا۔

اللہ کو کیا برا لگا تھا آخر؟

اور اگر ان کی غلطی تھی بھی تو، ان گنت لوگ یہ غلطیاں کرتے ہی ہیں۔ فخر غرور کینہ۔۔۔ کون عاری ہے اس سے۔ لیکن اس طرح پکڑ۔۔۔

"اسی طرح ہوتی ہے شائستہ!" اندر سے آتی آواز نے انہیں بری طرح جھنجوڑا۔ "اس سے بھی سخت اور بری پکڑ جو نہ زندوں میں چھوڑتی ہے اور نہ مردوں میں۔"

اس آواز میں بڑا دبدبہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے تو سُن سی ہو کر رہ گئیں۔

"حیرت ہے۔ اپنی آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھ کر بھی سبق حاصل نہیں کیا شائستہ بیگم۔ اب کس انتظار میں ہو۔"

انہوں نے ماتھے پر آتا پسینہ خشک کیا تھا۔

"تو کیا ان ہی کا بڑا بول ربیعہ کے آگے آیا ہے۔ ان ہی کے غرور اور سنگ دلی نے ربیعہ کی خوشیوں کو عین وقت پر گرہن لگا دیا ہے۔"

شام سے اسلام صاحب کے الفاظ کی بازگشت کم نہ ہوئی تھی۔ ان کا دل ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔

وہ ایسی تو نہیں تھیں ہمیشہ سے۔

یہ کون سا جذبہ تھا، جو انہیں ارد گرد دیکھنے ہی نہیں دیتا تھا۔ کسی پر رحم کھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

نہ تقدیر کی مار کھائے شاکرہ کے گھرانے پر۔۔۔ نہ اس صابر، مظلوم جویا پر۔ جس نے کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی سب سے زیادہ اذیت سہی تھی۔

ربیعہ کا اگر کوئی قصور نہیں تھا تو جویا کا کب تھا۔ کس کا غصہ کس پر اتارتے ہوئے وہ کتنی حق تلفی کی مرتکب ہو رہی تھیں۔ اپنے ماں ہونے کے حق کا اتنا سنگ دلی بھرا استعمال۔

انہیں پہلی بار معاذ کی سعادت مندی پر فخر نہیں، رونا آیا تھا۔ وہ جو بڑے خلوص سے، زمانے کے ہاتھوں کم، کمینوں کے ہاتھوں زیادہ پسا جا رہا تھا۔

اور وہ ماں ہو کر پوری بے حسی سے اس کی تنہائی اور دکھ کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ کانٹوں کی فصل بو کر گلاب کھلنے کی منتظر ہیں اب تک۔

ربیعہ اس بے دردی سے نہیں ٹھکرائی گئی تھی۔ جس طرح کہ جویا آسٹریلیا میں بیٹھے اختر بھائی کے بیٹے سے بڑی گناہ گار وہ خود تھیں سو پھر کیا غم۔۔۔ کیا فکر۔

اپنی ساری ہمت جمع کر کے وہ کمرے سے نکل کر چلتی ہوئی سیدھی اسٹڈی میں آئی تھیں۔

اسلام صاحب نماز فجر کے لیے وضو کر کے ابھی کمرے میں آئے تھے۔

"میں اظہار بھائی کے ہاں جویا کا رشتہ لینے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ اگر وہ ناراض بھی ہیں تو میں ہاتھ جوڑ کر انہیں مناؤں گی۔ جیسے بھی سہی۔۔۔ بس آپ اور اماں میرے ساتھ چلیے گا۔"

بات کرتے ہوئے ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگتا جا رہا تھا۔

اسلام صاحب کے دل پر سے سارا بوجھ ایک ساتھ ہی ہٹا تھا۔

مسکراتے ہوئے بہت محبت سے انہوں نے شائستہ بیگم کے کندھے پر تسلی بھرا ہاتھ رکھا۔

"اللہ کا شکر ہے، جو تم نے ایک صحیح فیصلہ کیا۔ اب اس گھر میں ان شاء اللہ خوشیوں کو اترنے سے کوئی بھی نہیں روک سکے گا شائستہ۔۔۔! نہ معاذ کے لیے اور نہ ہی ربیعہ کے لیے۔۔۔"

"میری ربیعہ۔۔۔" شائستہ بیگم کا دل ایک بار پھر بے قابو ہوا۔

"اللہ بہت بہتر کرنے والا ہے۔ اس سے کبھی بھی مایوس مت ہونا۔۔۔ وہ قادر مطلق۔ ہم ناچیز اس کی مصلحتوں کو سمجھے بغیر واویلا مچانے والے ہیں۔"

ان کے لہجے میں وہی عاجزی اور سکون تھا، جو ہمیشہ سامنے والے کی تسلی کا سبب بنتا تھا۔

☼ ☼ ☼

معاذ نے بڑی فکر مندی سے سامنے بیٹھی ربیعہ کو دیکھا۔

"تو کیا تمہیں واقعی بہت افسوس ہوا ہے؟"

"نہیں تو!" اس نے جھینپ کر فوراً آنسو صاف کیے۔ "مجھے تو امی اور دادی کا خیال آرہا ہے۔ وہ لوگ بہت ٹینشن میں ہیں نا۔"

"اور تم۔۔۔ تمہیں نہیں ہے ٹینشن۔۔۔ سچ بتاؤ۔۔۔"

معاذ فجر کی نماز پڑھ کر سیدھا ربیعہ کے کمرے میں آکر بیٹھا تھا۔۔۔ اور بڑی دیر سے اپنے طور پر کچھ اندازے لگانا چاہ رہا تھا۔

"نہیں! بالکل بھی نہیں!" ربیعہ نے پوری سچائی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"تو پھر یہ رونا دھونا کیسا تھا۔۔۔؟" وہ کل رات سے ربیعہ کی روئی روئی سی آنکھوں کو دیکھ کر سخت پریشان تھا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں آسٹریلیا نہ جانے کا اتنا افسوس ہو رہا ہے کہ کس طرح بھی۔۔۔"

"معاذ کے بچے!" ربیعہ نے قریب پڑا تکیہ اٹھا کر اسے مارا تھا۔۔۔ "شرم تو نہیں آتی، اتنے فضول مذاق کرتے ہوئے۔"

وہ بہت دل سے مسکرا دیا۔

"شکر ہے اب تم کچھ عقل مند تو ہو ہی گئی ہو۔۔۔ اور ایک بات بتاؤں۔۔۔"
ربیعہ نے اس کی طرف دیکھا۔
"میں بھی بہت خوش ہوں۔۔۔ اس لیے کہ تم کہیں نہیں جا رہیں۔ یہیں میرے پاس رہو گی، ورنہ میرا تو سوچ کر ہی دل گھبراتا تھا کہ یہاں تمہارے بغیر میں کیسے رہ سکوں گا۔ مجھے خود پر غصہ آتا تھا کہ میں نے ابا کو اس فیصلے سے روکا کیوں نہیں۔۔۔" معاذ کی آواز دھیمی پڑ رہی تھی۔
ربیعہ بے ساختہ اس کے کندھے سے لگی۔
"اور اب میں ضرور کوئی اچھا سا لڑکا ڈھونڈ نکالوں گا، جو تمہیں اس شہر سے باہر صرف گھمانے پھرانے کے لیے ہی لے کر جائے ورنہ قطعی نہیں۔۔۔"
اسلام صاحب نے اندر آتے ہوئے ان دونوں کے مسکراتے چہروں کو بہت محبت سے دیکھا۔
"اچھی خبر یہ ہے کہ ایک اچھے سے لڑکے کے والد نے تو اتنی جلدی مچائی ہے کہ علی الصبح ہی مجھے فون کر کے آنے کی اجازت مانگ لی ہے پر زور انداز میں۔"
ربیعہ اور معاذ دونوں نے ایک ساتھ ہی چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔
"کون لڑکا ابا؟"
"بوجھو تو جانیں۔ ویسے اتنا پتا یہ ہے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ دوپہر تک لاہور سے واپس کراچی آ رہا ہے۔"
ربیعہ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔
کم از کم اسے نام جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔
"شاید دادی مجھے بلا رہی ہیں!" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ لیکن ان چند لمحوں میں ہی اسلام صاحب نے اس کے چہرے پر خوشی کی وہ چمک دیکھ لی تھی، جواب تک گم تھی۔
"اب تم کیا کہتی ہو شائستہ؟" انہوں نے ساتھ آتی شائستہ بیگم سے کیا جاننا چاہا تھا، معاذ کی توجہ اس طرف بالکل نہیں تھی۔
"خیام، آپ کا مطلب خیام۔۔۔ واقعی اس سے اچھی تو کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی ابا!"
وہ بے اندازہ خوش تھا۔
"کمالی صاحب کو ربیعہ کے رشتے کے ختم ہونے کے بارے میں کوئی علم بھی نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے بہت عاجزی اور محبت کے ساتھ ربیعہ کے لیے سوال کیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ لوگ کتنے زیادہ خواہش مند ہیں۔ اور خیام تو ہمارے لیے بالکل اپنا ہے۔ ایسے ہی جیسے ربیعہ اور معاذ۔۔۔"
معاذ نے چند لمحوں میں کچھ بالکل درست اندازے لگا لیے تھے۔
"یہ ان دونوں کی خوشی کا سوال ہے ابا۔ اللہ واقعی کتنا مہربان ہے۔"
شائستہ امی نے کچھ الجھن بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔
"سوچ لیں۔۔۔ خیام کی والدہ کا تعلق۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" اسلام صاحب نے خفگی سے ان کی طرف دیکھا۔
"خیام کی ماں ایک شریف عورت تھی۔۔۔ جس نے اپنے دور عروج میں سب کچھ چھوڑ کر کمالی صاحب سے شادی کی تھی۔۔۔ ہمیں لوگوں کو خانوں میں بانٹنے کا رویہ اب تو ترک کرنا ہی ہو گا شائستہ! کیونکہ یہ ابتدا کہیں سے تو ہونی ہی ہے۔ بلکہ ہو چکی ہے۔ سالار اور نیمی کی شادی کے ساتھ۔۔۔ زندگیوں کو سہل اور خوش آئند بنانے کا سادہ سا فارمولا، وسیع القلبی اور انسانیت کا احترام ہے۔ راہیں خود بخود ہی روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور میں اپنے بچوں کو پورے دل کے ساتھ زندگی گزارتا دیکھنا چاہتا ہوں۔"
اس بار شائستہ امی مسکرائی تھیں۔ ابھی انہیں زندگی کے سفر میں اسلام صاحب سے اور بھی بہت کچھ سیکھنا باقی تھا۔
انہوں نے پچھلے احاطے کی طرف کی کھڑکیوں کو کھولتے ہوئے سوچا۔
چمپا کے پھولوں کی خوشبو سے بوجھل ہوتے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں آ رہے تھے۔
"اب بس یہ ہے کہ ہمیں اپنے پروگرام میں تھوڑا سا رد و بدل کرنا پڑے گا۔ میں اظہار کو فون کر کے بتا دیتا ہوں۔"
وہ کہتے ہوئے مڑنے لگے تھے کہ معاذ تیزی سے ان کے سامنے آیا۔
"اظہار چچا کو کیوں فون کریں گے آپ۔۔۔ کوئی خاص بات؟" وہ بے حد حیرت زدہ تھا۔
ایک معنی خیز مسکراہٹ ابا اور شائستہ امی دونوں کے لبوں پر آئی۔
"نہیں! بات ایسی خاص بھی نہیں۔ بس ہم لوگوں کا پروگرام تھا۔ ابھی ناشتے کے بعد اظہار کے ہاں جا کر اس بات کو اپنے گھر لانے کا پروگرام فائنل کریں جو بہت دن سے ان کے ہاں ہے۔ اور اچھی بات یہ کہ اظہار بہت خوش ہوئے ہیں اس پروگرام پر۔" انہوں نے دانستہ لاپروائی برتی تھی۔
معاذ کے لب حیرت سے کھلے تھے اور چہرہ اتنا روشن کہ۔۔۔
شائستہ امی اور ابا دونوں کو ایک ساتھ ہی نظر لگ جانے کے اندیشے نے ستایا۔
معاذ بے ساختہ ان دونوں کے گلے لگا تھا۔
"اب جب کہ خیام کے والد پہنچ رہے ہیں تو ہم اظہار کے ہاں دوپہر کے بجائے شام کی چائے پی لیں گے۔ میں ذرا فون کر کے بتا دوں۔۔۔"
"چلیں اماں کے کمرے میں چل کر ہی فون کر لیجیے گا۔ تم بھی آ جاؤ معاذ۔۔۔ میں وہیں ناشتا لگا رہی ہوں۔"
شائستہ امی اس سے کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔
"بس آ رہا ہوں امی۔۔۔ دو منٹ میں۔" اس نے آواز لگا کر انہیں مطمئن کیا۔
اب جب کہ سب لوگ کچھ ضروری کام نمٹانے میں مصروف ہونے والے تھے تو ایک ضروری کام اسے بھی کرنا تھا۔
اپنے موبائل پر جویا کے نمبر پر کال کا بٹن دباتے ہوئے اس نے دل کی انتہائی گہرائی سے صرف اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔
پچھلے احاطے میں صبح اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ اتر رہی تھی۔
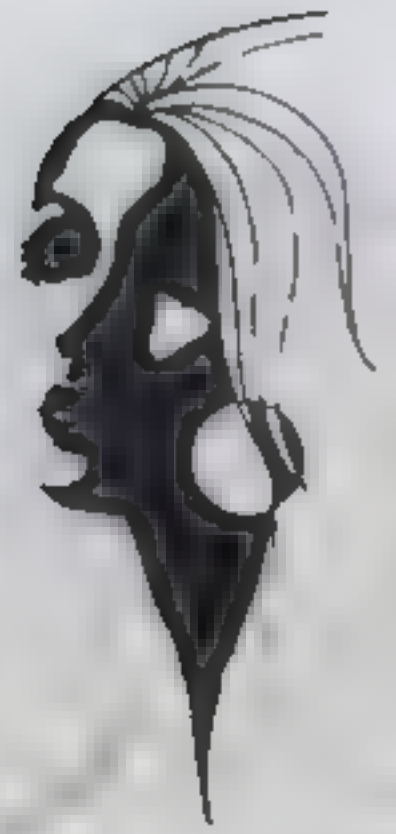
چلو یہ عشق نہیں چاہنے کی عادت ہے
پر کیا کریں ہمیں اک دوسرے کی عادت ہے

تو اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کر ضائع
میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے

میں کیا کہوں کہ مجھے صبر کیوں نہیں آتا
میں کیا کروں کہ تجھے دیکھنے کی عادت ہے

ترا نصیب ہے اے دل سدا کی محرومی
نہ وہ سخی نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے

یہ خود اذیتی کب تک فراز تو بھی اسے
نہ یاد کر کہ جسے بھولنے کی عادت ہے

احمد فراز

جب نہ رکھا خیال شیشے کا
کیوں کرو پھر ملال شیشے کا

دل ہی سنگِ انا کو توڑے گا
دیکھ یہ بھی کمال شیشے کا

تم غلط فہمیاں نہیں پالو
کس سے مٹتا ہے بال شیشے کا

آئنہ ہے تمہارا عکس لیے
بڑھ گیا ہے جمال شیشے کا

ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جاتا ہے
ہاں یہی ہے مآل شیشے کا

سنگ زادوں کے شہر میں عظمیٰ
اپنا پیکر سنبھال شیشے کا

عظمیٰ جون

اسے اُلفت کے سب اسباق ازبر تھے
وہ چاہت کے سب ہی رنگوں سے واقف تھی
محبت کے تقاضوں کو سمجھتی تھی
ملن کے سب لوازم پیش کرنے کا سلیقہ جانتی تھی
محبت کی ہر اک تتلی
وہ چاہت کے سب ہی جگنو
مری مٹھی میں دے دیتی
مری سانسوں میں خوشبو سی جگا دیتی
گھنیری شام جلتے دن کے سینے پر بکھر جاتی
سرے صحرا بدن پر وہ
سنہری دھوپ کی مانند بھی کھلتی
کبھی بدلی کی صورت بھی برستی تھی
مکمل یوں تو ہر اک زاویے سے تھی
گئے گزرے کے ذکر پر
وہ اکثر کانپ جاتی تھی

علی محمد قریشی

اپنا اپنا مسلک ہے وہ دیے بجھاتے ہیں
شہر یہ ہمارا ہے، ہم دیے جلاتے ہیں

سخت سخت چہروں کا ایک ہجوم ملتا ہے
جس طرف نکلتے ہیں جس گلی میں جاتے ہیں

جسم و جاں کی تختی پر خنجروں کی تحریریں
روز علم کے طالب مدرسوں سے لاتے ہیں

اپنے شہر والے بھی ہیں بڑے ہنر والے
رکھ کے سر ہتھیلی پر روز گھر سے جاتے ہیں

چند دن کی مسند ہے، چند دن کے طرّے ہیں
پھر بھی اس حقیقت کو لوگ بھول جاتے ہیں

اختر لکھنوی

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے بغیر عذر کے رمضان کا ایک بھی روزہ چھوڑ دیا، اس کے بدلے زمانے بھر کے روزے بھی کافی نہیں ہوں گے۔"

چغل خوری،

ایک دن ایک شخص امیر المومنین معتضد کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ ایک گزارش ہے مگر تنہائی میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔
معتضد نے تخلیہ کرا کے اس سے کہا۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ اگر تمہاری بات سچ ہوئی تو تم تعریف کے مستحق ہو گے اور جھوٹ ہوئی تو ملامت کے قابل سمجھے جاؤ گے۔"
اس شخص نے عرض کی۔ "فوج کا ایک شخص جو فلاں مقام پر متعین تھا، رخصت لیے بغیر اپنے گھر گیا ہوا ہے۔ مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ وہ میرے پڑوس میں رہتا ہے۔"
معتضد نے جواب دیا۔ "یہ چغلی کھا کر تم نے اپنے خلیفہ کی عزت اور وفاداری کا حق تو ادا کر دیا لیکن ہمسائگی کے حقوق کی گردن پر کند چھری پھیر دی ہے۔ اگر تمہاری بات سچ نکلی تو تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور غلط ثابت ہوئی تو تمہیں سزا ملے گی کیونکہ تم نے جھوٹ بولنے کی جرأت کی ہے۔ خیر میں اس مرتبہ تمہیں معاف کرتا ہوں لیکن اتنا یاد رکھو، چغل خور سے برا آدمی کوئی نہیں ہے کیونکہ اگر وہ سچ کہتا ہے تو بے مروت ثابت ہوتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے تو مصیبت میں پھنستا ہے۔"

دل سے مانگی دعا،

حجاج بن یوسف ایک مرتبہ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ اس نے طواف کے دوران ایک نابینا شخص کو دیکھا جو بلند آواز سے دعا کر رہا تھا۔ "یا اللہ! مجھے آنکھیں دے، یا اللہ! مجھے آنکھیں دے۔"

حجاج نے اس کی دعا سنی تو اس سے پوچھا۔ "تو کب سے دعا کر رہا ہے اور سن لے میں حجاج بن یوسف ہوں میرے چار چکر طواف کے رہتے ہیں۔ اگر چار چکروں سے پہلے تیری بینائی نہ لوٹی تو میں تیرا سر قلم کر دوں گا۔"
یہ شخص حجاج بن یوسف کے ظلم و ستم سے واقف تھا جانتا تھا کہ اس کے لیے کسی کا سر اتار دینا یا جان لے لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اب اس شخص کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ ابھی تک تو وہ آنکھوں ہی سے محروم تھا۔ اب تو زندگی داؤ پر لگ گئی۔ اس نے رو رو کر دل کی گہرائی سے دعا مانگی۔
"یا اللہ! میری بینائی لوٹا دے ورنہ یہ شخص میری جان لے لے گا۔"
دل سے نکلی دعا قبول ہوتی ہے۔ اللہ نے اس کی سن لی اور اس کی بینائی واپس کر دی۔
حجاج نے طواف سے واپس آ کر دیکھا اس کی بینائی لوٹ آئی ہے تو بولا۔
"جیسے تو پہلے غفلت سے دعا مانگ رہا تھا، اس طرح اگر سال بھر بھی دعا مانگتا رہتا تو قبول نہ ہوتی۔ موت کے ڈر سے دل سے دعا مانگی تو فوراً قبول ہو گئی۔"

علم،

علم و معلوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں ہے، سمجھنے کی ذمہ داری بھی ہے۔ جب تک کوئی معلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیے۔ آج کل دنیا میں جو بد دلی، افراتفری، بے دلی اور بے زاری پھیلی ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علوم اور علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں لیکن اچھے معلم تقریباً ناپید ہیں۔"
(رشید احمد صدیقی۔ ہم نفسان رفتہ)
کہکشاں رحمٰن۔ کراچی

سنہری کرنیں،

- جب تک توبہ کا دروازہ بند نہ ہو کسی آدمی کو برا نہ کہو۔
- ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے ... کہنے کا حق ہے۔ زندگی گزارنے کا حق ہے۔
- ہر عقیدے کے مخالف ایک عقیدہ ہے۔ ہر آرزو کے برعکس آرزو ہے۔ ہر مزاج کے رو برو ایک مزاج ہے۔ ہر جنس کے مقابل ایک جنس ہے۔ ہر انا کے سامنے ایک انا ہے۔ ہر خودی کی ضد ایک خودی ہے۔ ہر خوشی کے باطن میں ایک غم ہے۔ اور ہر ایک مایوسی کے عالم میں امید جلوہ گر ہے۔
- خوش نصیب انسان حق کے قریب رہتا ہے۔ وہ ہوس و حسرت سے آزاد ہے۔ وہ فنا کے دیس میں بقا کا مسافر ہے۔ اس کا دل جلوۂ پُرنور سے منور ہے۔ وہ اپنے آپ پر راضی ہے۔ اپنی قسمت، اپنے نصیب سے راضی ہے۔ اپنی زندگی پر راضی ہے۔ اپنے حال پر راضی، اپنے حالات پر راضی، اپنے خیالات پر راضی، اپنے خدا پر راضی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی سلام ہو خوش نصیبوں کی خدمت میں۔ (واصف علی واصف)

نوال فضل گھمن۔ گجرات

عبادت،

- اگر عبادت کی حالت زندگی میں رائج ہو جائے، تو عبادت کے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔
- اللہ کے لیے دعوت عمل صرف اللہ ہی کے لیے ہو تو عبادت اور اگر اس میں انا یا نفس شامل ہو جائے تو عبادت نہ رہے گی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب عبادت وہ ہی معبود بھی وہی ہے تو نتیجہ وہی نہیں۔ کیوں؟
- انسانیت کے تحفظ کے لیے جو اعمال ضروری ہیں، انہیں ادا کرنا عبادت ہے۔ اگر سانس لینا فرض ہے تو سانس کی حفاظت کرنا عبادت ہے۔

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

استاد کی عزت،

اشفاق احمد لکھتے ہیں ... میرا ٹریفک چالان ہو، مصروفیت کی وجہ سے ... کر سکا۔ کورٹ جانا پڑا۔ جج کے سامنے پیش ہوا تو اس نے وجہ پوچھی۔ میں نے کہا۔
"ٹیچر ہوں، کچھ مصروف رہا۔"
اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا، جج نے کہا۔
"اے ٹیچر از ان دا کورٹ (ایک استاد کورٹ میں ہے)، اور سب لوگ کھڑے ہو گئے جج سمیت اور میرا چالان بھی معاف کیا اور معافی بھی مانگی۔ اس روز میں نے اس قوم کی ترقی کا راز جان لیا۔"

قیامت اور معافی،

ایک مرتبہ امیر المومنین مامون نے احمد کو ولایت سے معزول کر کے دربار خلافت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو مامون نے سخت سست کہنا شروع کیا اور اس نے جو جو خطائیں کی تھیں، ایک ایک کر کے گنوانے لگا۔
جب تمام جرائم کی فہرست دہرا چکا تو احمد نے پوچھا۔ "کل قیامت کے دن امیر المومنین سے بھی اسی طرح حساب

لیا جائے گا اور ایک ایک جرم بتا کر جواب طلب کیا جائے گا۔ اس وقت امیر المومنین کس چیز کو پسند فرمائیں گے؟"

مامون نے جواب دیا۔ "مجھے معافی کا حکم پسند ہے۔"

احمد نے جواب دیا۔ "تو میرے حق میں بھی معافی ہی پسند فرمائیے۔"

اس پر مامون نے اس کے تمام جرم معاف کر دیے۔

مروت،

ایک دن ابو مسلم گھر سے نکل کر مسجد کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اس کا ایک دوست مل گیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی، زمین پر ٹکائی تو اس کی نوک ابو مسلم کے پاؤں پر جا لگی اور اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ دیر تک اسی طرح باتیں کرتا رہا اور تلوار کی نوک ابو مسلم کے پاؤں پر چبھتی رہی۔

باتیں کر کے رخصت ہوا تو ابو مسلم نے دیکھا کہ پاؤں لہو لہان ہو گیا تھا۔ کسی نے کہا کہ امیر آپ نے اسے تلوار ہٹا لینے کو کیوں نہ کہا۔

جواب دیا۔ "میں چاہتا تھا اسے معلوم نہ ہو کہ اس نے مجھے کسی تکلیف پہنچائی ہے، ورنہ وہ شرمندہ ہوتا اور شرمندگی کی وجہ سے اپنی ضرورت مجھ سے بیان نہ کر سکتا۔"

انمول موتی،

⁂ جس نے کسی کو اکیلے میں نصیحت کی اس نے اسے سنوار دیا اور جس نے کسی کو سب کے سامنے نصیحت کی اس نے اسے مزید بگاڑ دیا۔

⁂ جس کو تم سے سچی محبت ہو گی وہ تم کو فضول، در ناجائز کاموں سے روکے گا۔

⁂ رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں۔ اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ اگر احساس نہ ہو تو اپنے بھی اجنبی ہو جاتے ہیں۔

عکاشہ سلیم۔ گجرات

ضرورت مند،

کسی شخص کو اتنا پیار دو کہ کوئی گنجائش نہ چھوڑو۔ اگر وہ پھر بھی آپ کا نہ بن سکے تو اسے چھوڑ دو کیونکہ وہ محبت کا طلب گار ہی نہیں، وہ صرف ضرورت کا پجاری ہے، محبت کرنے والے کو کسی شے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ضرورت مند کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔

(شیخ سعدیؒ)

جو شخص،

جو شخص لوگوں کے ساتھ باتیں کرنا اور مشغول ہونا بہ نسبت اللہ پاک کی یاد اور عبادت کے زیادہ پسند کرتا ہے اس کا علم تھوڑا، دل اندھا اور عمر ضائع گیا ہے۔

(حضرت مالک بن دینارؒ)

مینی سحر۔ ہری پور ہزارہ

چھوٹی سی بات،

رشتے اور دل کانچ سے بنے ہوتے ہیں۔ یہ ٹوٹنے پر چبھتے ہیں۔ انہیں ہتھیلی پر سنبھال کر رکھنا کیونکہ ٹوٹنے میں ایک پل اور جوڑنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔

رنگ چرائے قوس قزح کے،

- مشورہ لینا بری بات نہیں ہے مگر اس مشورے پر بلا سوچے عمل کرنا برا ہے۔
- کسی چیز کے حصول کا متمنی ہونا اور اس کے لیے محنت اور سختی اٹھانے کے لیے تیار نہ ہونا کم ہمتی اور سستی کی نشانی ہے۔
- جس شخص کو اپنی جان کا خوف نہیں ہوتا، وہ دوسرے کی جان کا مالک ہوتا ہے۔
- جس کو قرض لینے اور خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں وہ سب سے بڑا مالدار ہوتا ہے۔
- کبھی کسی سے محبت دل سے چاہے بنا نہیں ہوتی جیسے نیکی کی توفیق طلب کیے بنا نہیں ملتی۔

حرمت ردا اکرم۔ ڈلوال

صبا سحر

اندازہ

پروفیسر صاحب نے لیکچر کے اختتام پر کلاس روم میں ایک طالب علم سے پوچھا۔

"فرید! کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہندوستان کی آزادی کی قرارداد پر کہاں دستخط کیے گئے تھے؟"

فرید نے ایک لمحے سوچا۔ سر کھجایا اور پھر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"سر! کاغذ پر جہاں قرارداد کا مضمون ختم ہوا ہو گا وہاں پر۔"

عطیہ علی۔ کراچی

بے چارگی

چرچ میں ایک جوڑا پادری کے سامنے پیش ہوا اور شادی کی رسوم ادا کرنے کی درخواست کی۔ پادری نے نوجوان کو نشے کی حالت میں دیکھا تو حکم دیا۔

"باہر نکل جاؤ۔ کل آنا۔" اگلے روز نوجوان کا پھر وہی حال تھا۔ جب تیسرے روز بھی وہ نشے کی حالت میں آیا تو پادری نے لڑکی سے کہا۔

"تم کیسی لڑکی ہو، کم از کم چرچ میں آتے وقت تو اسے پینے سے روک دیا کرو۔"

"مجبوری ہے فادر!" لڑکی نے بے بسی سے کہا۔

"کیونکہ جب بھی اس کے ہوش و حواس قائم ہوتے ہیں تو یہ شادی سے انکار کر دیتا ہے۔"

نرمین لودھی۔ سرگودھا

قابل ترجیح

نوجوان خوب صورت ٹائپسٹ لڑکی نے اپنے نوجوان باس کی حرکات و سکنات دیکھیں تو بالآخر ہمت کر ہی ڈالی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا آپ واقعی مجھے پسند کرتے ہیں اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

باس نے کہا۔ "آخری فیصلہ کرنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ تم میرے والد سے بھی مل لو تاکہ......"

لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے مل چکی ہوں اور ان کے مقابلے میں آپ کو قابل ترجیح سمجھتی ہوں۔"

فوزیہ سعید۔ کراچی

اندیشہ

ایک لڑکی نے اپنے منگیتر سے شکایتی انداز میں کہا۔

"تم نے کبھی بھی میری تعریف نہیں کی۔"

"میں مصنوعی چیزوں کی تعریف نہیں کرتا۔" لڑکے نے بے رخی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب ہے؟" لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تم نے میک اپ سے چہرے کو رنگین بنا رکھا ہے۔ اب مجھے کیا پتا کہ تمہاری اصلیت کیا ہے۔ تم کسی دن میک اپ کے بغیر میرے سامنے آؤ تو ہو سکتا ہے میں تمہاری تعریف کر دوں۔" لڑکے نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"اگر میں نے ایسا کیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم مجھ سے شادی سے انکار نہ کر دو۔" لڑکی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

نمرہ اقرا۔ کراچی

فرض شناسی

فائر چیف نے فائر بریگیڈ میں بھرتی کے لیے آنے والے ایک نوجوان کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا۔
"فرض کرو فائر اسٹیشن میں ایک ہی فائر انجن موجود ہے۔ کہیں آگ لگنے کی اطلاع آئے اور میں وہ انجن لے کر چلا جاؤں۔۔۔ تم اسٹیشن میں اکیلے موجود ہو۔ اسی دوران ایک اور جگہ آگ لگنے کی خبر آتی ہے۔ ایسے میں تم کیا کرو گے؟"
"سر! میں فوراً ٹیکسی لے کر وہاں پہنچوں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے آنے تک آگ بجھنے نہ پائے۔" نوجوان نے مستعدی سے جواب دیا۔

ماہا انعام۔ نارتھ کراچی

کارگر نسخہ

مری میں سیزن کے دوران اپنا مکان کرائے پر اٹھانے والے ایک صاحب سے ان کے پڑوسی نے پوچھا۔ "اور سناؤ بشیر علی! اس مرتبہ سیزن کیسا لگا؟"
"بہت اچھا۔" بشیر علی نے جواب دیا۔ "میں نے اس سیزن میں آنے والے کرائے داروں سے ڈبل کرایہ مانگا اور وہ انہوں نے خوشی خوشی دے دیا۔"
"اچھا!" پڑوسی نے خوش گوار حیرت سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ بہت فراخ دل لوگ تھے۔"
"یہ تو مجھے پتا نہیں کہ وہ فراخ دل تھے یا نہیں۔۔۔ بہر حال ان میں سے دو نئے شادی شدہ جوڑے تھے اور ایک تاک جھانک کرنے والا غیر شادی شدہ نوجوان۔" بشیر علی نے جواب دیا۔

نسیم سحر۔ گلشن اقبال

تعاون

بیٹے کی پچیسویں سالگرہ پر باپ نے اس سے کہا۔
"بیٹا! اب تم جوان ہو گئے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا کچھ بوجھ اٹھاؤ۔"
"ضرور ابا جان! آپ بتائیے میں کیا کروں؟" بیٹے نے سعادت مندی سے کہا۔
"بیٹا! تمہاری پیدائش کے وقت اسپتال کے اخراجات کے لیے ہم نے بینک سے کچھ قرضہ لیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی آخری تین قسطیں تم ادا کر دو۔" باپ نے کہا۔

رشیدہ بتول۔ اورنگی ٹاؤن

فرسٹ ایڈ

ایک خاتون نے سڑک پر ایک حادثہ دیکھا۔ دوسرے روز وہ اپنی دوستوں کو اس کے بارے میں بتا رہی تھیں۔
"حادثہ بے حد خوفناک تھا۔ زخمی سڑک پر پڑے کراہ رہے تھے۔ کسی کا سر پھٹ گیا تھا تو کسی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ سڑک پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ برسوں پہلے میں نے فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ لی تھی۔ وہ اس موقع پر میرے بڑے کام آئی۔"
"آخر تم نے کیا کیا؟" ایک دوست نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔
"میں نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ یوں میں بے ہوش ہونے سے بچ گئی۔" خاتون نے جواب دیا۔

شگرف اعجاز۔ گلستان جوہر

مجسمہ

ایک بار بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام کو اطلاع ملی کہ ڈھاکہ میونسپل کارپوریشن ان کی ادبی خدمات کے عوض ایک پارک میں ان کا مجسمہ نصب کرانا چاہتی ہے اور اس مجسمہ پر ایک لاکھ روپے خرچ کرے گی۔
قاضی نذر الاسلام نے اپنے دوستوں سے کہا۔
"اگر کارپوریشن یہ رقم مجھے دے دے تو میں خود اس پارک میں کھڑا ہو جاؤں گا۔"

(یاسمین ظفر۔ لاہور)

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

ثوبیہ سلطان ــــــ میر کراچی
نہ تکلف، نہ احتیاط، نہ زعم
دوستی کی زبان سادہ تھی

روزمین رحیم ــــــ میر کراچی
سانس تک بھی نہ لیتے ہیں تجھے سوچتے وقت
ہم نے اس کام کو بھی کل پہ اٹھا رکھا ہے

طوبیٰ دانش ــــــ گلستان جوہر
وفا کے نام پر تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں ہے، بات ہے زمانے کی

منزہ بتسم ــــــ سرگودھا
زندگی بیت رہی ہے دانش
بے جرم سزا ہو جیسے

عظمیٰ رزاق ــــــ کراچی
تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے، مگر جان حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں

نمرہ، اقرا ــــــ کراچی
آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

آسیہ جاوید ــــــ علی پور چٹھہ
اڑتا ہوا غبار سر راہ دیکھ کر
انجام ہم نے عشق کا سوچا تو رو دیے

دانشہ ــــــ گوجرہ
غموں کی دھوپ میں کچھ دیر سانس لینے کو
وہ اپنی ذات کا اک سائبان چھوڑ گیا

ثنا محمود ــــــ آدم ٹاؤن
بے حسی کی دنیا میں دو سوال میرے بھی
کس طرح جیا جائے، کس لیے جیا جائے

صائمہ عمران ــــــ لاہور
تجربہ ایک ہی کافی تھا عبرت کے لیے
میں نے دیکھا نہیں عشق دوبارہ کر کے

روبینہ شریف ــــــ کراچی
جن سے دل کو انسیت ہو عدم
ان سے جھگڑا ضرور ہوتا ہے

مبشرہ علوی ــــــ کراچی
گئی رتوں کی طرح وہ بھی لوٹ آئے گا
مزاج اس کا بدلتا ہے موسموں کی طرح

بشریٰ رضوان ــــــ نارتھ کراچی
کسی کا ساتھ ملے اور اس طرح امجد
کہ وقت چلتا رہے راستہ ٹھہر جائے

فرحانہ ــــــ کراچی
شب وصال ہے گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

افشاں فرقان ــــــ سخی حسن
تمام عمر کی بے تابیوں کا حاصل تھی
وہ ایک شب جو آغوش یار میں گزری

بینا صدیقی ــــــ کورنگی کراچی
صبح کے تخت نشیں شام کے مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا ہے

رشیدہ بتول ــــــ اورنگی ٹاؤن
ان کے چہرے کی بات کرتے ہیں
آج ذکر گلاب رہنے دو

زبیدہ شہباز ــــــ کراچی
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

پہلا خط نرووال سے شازیہ قیصر کا ہے، لکھتی ہیں

آج میں جس وجہ سے خط لکھ رہی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اکثر کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے گاؤں کے گنوار، اجڈ، جاہل، پینڈو لوگ۔ آپ یقین جانیے ہمیں یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اپنی آب و ہوا، فضا کی طرح ملاوٹ سے پاک، خالص اور سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ بہت محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں اور ان کی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ 12 اپریل کو 1 بیساکھ ہوتی ہے۔ پھر تو جیسے گھر ویران اور کھیت آباد ہو جاتے ہیں۔ کھیتوں میں ہر سو سونا اترا ہوا ہوتا ہے۔ پورے بیساکھ کے مہینے میں لوگ کھیتوں میں گندم کی کٹائی کرتے ہیں اور گھروں میں کوئی بھی نہیں ہوتا یہ بات سب جانتے ہیں کہ گھر خالی ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے آج تک چوری، ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی۔ ہم لوگ چائے اور کھانا کھیتوں میں لے کر جاتے ہیں اور سوجی کا حلوہ تو لازم و ملزوم ہے۔ کھیتوں میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا بھی اپنا مزا ہے۔

اب آتے ہیں رسالے کی طرف۔ مصروفیت کی وجہ سے "جنت کے پتے" کے بارے میں رائے نہیں دے سکی۔ بہت بہت خوب صورت ناول جس نے ہماری رہنمائی کی۔ رخسانہ نگار کا "ایک تھی مثال" یہ تو ہمارے اردگرد ماحول کی کہانی لگتی ہے پلیز ڈونٹ مائنڈ ہم لوگ رسالہ تفریح کے لیے لیتے ہیں کہ کوئی ہلکی پھلکی تحریر پڑھنے کو ملے گی۔ رائٹرز سے ریکویسٹ ہے کہ وہ ایسی پریشانیوں بھری کہانی لکھنے سے گریز کیا کریں۔ افسانے سب ہی بہت اچھے ہیں۔ شعاع کے سب سلسلوں کی تو کیا بات ہے۔ اب آتے ہیں۔ "دیمک زدہ محبت" ایک اچھا ناولٹ۔ لیکن ایک ریکویسٹ ہے۔ اسے پلیز طویل ترین ناولٹ نہ بنا دیجیے گا۔ فاخرہ جبین کا مکمل ناول اس گرمی میں خوش گوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ پلیز راحت کو بھی بلائیں ان سے بھی ناول لکھوائیں۔ تاکہ گرمی کا احساس کم ہو۔ دونوں ناول اچھے تھے۔ موسم کے پکوان میں مختلف قسم کے رائتوں کی ترکیب بھی دیجیے گا۔

ج ۔ پیاری شازیہ! ہمارے ہاں جو کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کہانیوں میں کسی بھی پہلو سے کسی کی تضحیک یا مذاق اڑانے کا پہلو نہ نکلے۔ اگر سہواً ایسے کچھ الفاظ شائع ہو گئے ہوں تو ان کے لیے معذرت۔ ایک بات جس پر ہم پوری طرح یقین رکھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ دنیا میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ کسی ایک مخصوص جگہ شہر یا گاؤں کے بارے میں کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ جنہوں نے کالج، یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی ہوتی، ان کے پاس علم اور دانش ہوتی ہے اور ایسے بھی لوگ ہیں جن کے پاس بڑی بڑی ڈگریاں ہیں۔ ادب تخلیق کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن بہت چھوٹے اور انسانیت سے کوسوں دور ہیں۔

فرح ناز نے کلیانہ گجرات سے لکھا ہے

ماڈل میں اس کا ڈریس اور انگوٹھی پسند آئی۔ اپنا موسٹ فیورٹ "دیمک زدہ محبت" پڑھا۔ اس کے بعد حرف زادوں کی تتلی" فاخرہ آپی رلا دیا آپ نے۔ افسانے بس ٹھیک ہی تھے۔

ج ۔ پیاری فرح! آپ نے شعاع کی محفل میں شرکت کی بہت شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ام دعا نے میرپور آزاد کشمیر سے لکھا ہے

خط لکھنے کی وجہ ایک نہیں، کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلے تو جناب "خط آپ کے" میں شائل طاہرہ جتول کا خط میرے لکھنے کی بنیادی وجہ ہے۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے کہ وہ لڑکیاں جو "شادی" کو ہی اصل خوشیوں کی جھلک سمجھتی ہیں اور ان کو لگتا ہے کہ جب وہ اپنے گھر جائیں گی تو اپنے دلی ارمان اور خواہشات پوری کریں گی۔ مگر افسوس! ہوتا اس کے برعکس ہے۔ ہم لڑکیوں کی خوش فہمیوں کے یہ محل اتنی جلدی زمین بوس ہوتے ہیں کہ ہمیں اندازا بھی نہیں ہو پاتا۔ میری اپنے شوہر سے بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے اور ماشاء اللہ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور میری اور ان کی لڑائیوں کی بنیادی وجہ یہی ہے جو ظاہر ہونے لگی۔ جی ہاں... رسالے پڑھنا! میرے ہزبینڈ کو بھی لگتا ہے کہ یہ رسالے نہیں بقول ان کے گند ہے جو میں لیے پھرتی ہوں۔ میرے کتنے رسالے ان کے غصے کی نذر ہو چکے ہیں۔ میرا ان سے اور ہر ایسے مرد سے ایک ہی سوال ہے۔ "کیا سارا دن آپ کی مرضی پہ چلتے ہوئے ہمارا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ ہم چند لمحے اپنی مرضی کے بھی گزار سکیں؟" بہرحال! یہ بحث بہت لمبی ہے اور شاید لاحاصل بھی۔

خط لکھنے کی دوسری وجہ فرزانہ حسین چوہدری کا "امیدوں کے مسافر" ہے۔ میں خود ایسی صورت حال کی گواہ ہوں کہ مارننگ شوز کے چکر میں عورتیں گھروں سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ گھر جائے بھاڑ میں! اور نتیجتاً سارا کام گڑبڑ اور گھر والوں نے گرم تو ہونا ہی ہے۔ بات صرف اپنی ترجیحات کو بدلنے کی ہے۔ جب پہلی ترجیح گھر ہو تو باقی چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ تفریحات ترجیحات میں کبھی پہلے نمبر پہ نہیں ہونی چاہئیں۔ اور تیسری وجہ ہے کسی نے ناول لکھنے کا طریقہ پوچھا اور آپ نے جواب بھی دیا؟ مجھے یہاں آپ سے ایک شکوہ ہے کہ آپ ان رولز میں یہ بھی واضح کر دیں کہ ہمیں اپنی سی وی بمعہ تصویر کے بھیجنی ہو گی۔ کیونکہ مجھے بھی ایسا ہی جواب ملا تھا جب میں نے اپنے دو افسانے بھیجے۔

ج ۔ ام دعا! آپ نے بہت عجیب بات لکھی ہے۔ یہ جواب آپ کو کہاں سے ملا ہے کہ سی وی اور تصویر ضروری ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ کسی کو بھی اپنی تصویر نہ بھجوائیں۔ کہانیاں ہمیں بھجوا دیں۔ اگر قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے لکھا ہے

جون کا شمارہ دل فریب رنگوں سے مزین تھا۔ سلسلے وار ناول "دیوارِ شب" زبردست جا رہا ہے۔ بکھرے رنگ یکجا ہو رہے ہیں۔ "دیمک زدہ محبت" میں مجھے مائی جمیلہ کا کردار بہت اپیل کرتا ہے۔ "ایک تھی مثال" کی اس دفعہ کی قسط پڑھ کر دل لرز کر رہ گیا۔ باقی تحریروں میں "من کے سچے" امیدوں کے مسافر اور امتحان شیشے کا۔ بہت متاثر کن اور اثر انگیز تحریریں تھیں۔ "ہم کیوں ملے" اس شمارے کی نمبرون تحریر تھی۔

ج ۔ پیاری ارم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

نجمہ انور چونڈہ ضلع سیالکوٹ سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے صائمہ اکرم کے ناولٹ کی طرف دوڑ لگائی۔ "ایک تھی مثال" بھی زبردست رہا۔ لیکن رخسانہ جی! عاصمہ کے ساتھ بہت برا ہوا، وہ تو پہلے ہی دکھوں کی ماری ہوئی تھی۔ مکمل ناول بھی دونوں بہت اچھے تھے۔ افسانے بھی ٹھیک تھے۔ بلکہ سارا شمارہ ہی زبردست تھا۔ آپ سے ایک ریکویسٹ ہے۔ ترکی کی ڈش بورک کی ریسیپی شائع کر دیں۔

ج ۔ پیاری نجمہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے تھوڑا انتظار کریں۔

لاہور سے زنیرہ خالد لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ دونوں مکمل ناول پڑھے اور دونوں ہی دکھی دکھی سے لگے۔ افسانے بھی

سنجیدہ تھے۔ کم از کم کوئی ایک مزاحیہ تحریر تو ہر ماہ شامل ہونی چاہیے نا۔ "از میرٹ" کہاں ہے۔ اس کو لے کر آئیں۔ پچھلے ماہ رضوانہ کرن نے عمر اور تاباں کی جس کہانی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی مصنفہ فرحت اشتیاق ہیں۔ ناول کا نام "چلو توڑو قسم اقرار کریں۔" ہے جو کہ اکتوبر 2000ء کے خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔

ج ۔ پیاری زوباریہ! ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ہر ماہ کوئی مزاحیہ تحریر شامل ہو، لیکن ہماری مصنفین بھی آج کے دور میں سانس لے رہی ہیں۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی تحریروں میں سنجیدگی آ ہی جاتی ہے۔ ہم اپنی مصنفین تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

سعدیہ ملک نے راولپنڈی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اس دفعہ شعاع کی کہانیاں اتنے مزے کی نہ تھیں۔ "برف زاروں کی تتلی" میں کئی کمزور پہلو تھے۔ "دیمک زدہ محبت" میں خوب صورتی کے اظہار کے لیے الفاظ بار بار آتے ہیں۔ ان کے کثرت استعمال سے کافی الجھن ہوتی ہے۔ ایک دفعہ جب بتا دیا گیا ہے کہ راس، علی اور ماہم خوب صورتی کے انتہا درجے کو پہنچے ہوئے ہیں تو پھر بار بار ان کے لیے توصیفی باتیں حقیقتاً "بری" لگتی ہیں۔ ویسے مجھے اس میں ماہم بہت پسند ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ماہم اپنا رویہ درست کرلے (چاہے معجزہ ہو) اور موحد بھی ٹھیک ہو جائے اور پھر یہ دونوں مل جائیں۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ ناول لکھتی اور اپنی پسند سے اس میں ردوبدل کرتی۔ بہرکیف! اس دفعہ کوئی کہانی اتنی خاص نہ تھی کہ اس کا خصوصیت سے ذکر کیا جائے۔ لیکن آپ کی محنت کا اندازا شعاع کے ہر شمارے کو پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔

ج ۔ پیاری سعدیہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دسویں جماعت کے امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے کامیابی عطا فرمائے۔ سعدیہ! ماہم جیسے لوگ اپنی افتاد طبیعت اور مزاج سے مجبور ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں بھی تو خود کو تبدیل نہیں کرسکتے۔ اگر مصنفہ نے ماہم کو تبدیل کیا تو یہ کردار غیر حقیقی اور بے جان ہو جائے گا۔ کہانی میں اور بھی کردار ہیں جو بہت خوب صورت ہیں۔ آپ آگے کہانی پڑھیں گی تو آپ کو اندازا ہوگا۔

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ اس ماہ کوئی بھی کہانی آپ کو متاثر نہ کرسکی۔ ہم شعاع کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

تسمیہ عارف نے لاہور سے لکھا ہے

میں خواتین اور شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ آج خط لکھنے کی خاص الخاص وجہ عنیزہ سید کی تحریر نانا بائی کی بیٹی ہے۔ یہ تحریر بہت سالوں تک لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ "جنت کے پتے" بھی بہت خوب صورت تحریر تھی۔ ناولٹ میں "دیمک زدہ محبت" بہت اچھے طریقے سے چل رہی ہے۔ "دیوار شب" بہت خوب صورت تحریر ہے۔

ج ۔ تسمیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

نادیہ رمضان تحصیل خان پور سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

جب سے شعاع پڑھ رہی ہوں۔ ہر بار شعاع پہلے سے پڑھ کر لگا۔ اس کے علاوہ صائمہ اکرم کا "دیمک زدہ محبت" پہلے اچھا لگتا تھا۔ لیکن اب نہیں۔ کیونکہ اس ناول میں میرا فیورٹ کردار ماہم تھی۔ لیکن اب ماہم کو ہی اتنا برا (مغرور اور بے حس) بنا کے پیش کیا ہے کہ میں نے اس ناول کو پڑھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ عالیہ بخاری کا ناول "دیوار شب" میں نے 40 ویں قسط سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ یہ بہت اچھا ناول ہے۔ اس کا اینڈ بھی اچھا کیجیے گا۔ شعاع کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ خصوصاً "تاریخ کے جھروکوں سے"

ج ۔ پیاری نادیہ! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ "دیمک زدہ محبت" میں ماہم مغرور اور بے حس نہیں، بس اس کا مزاج اس قسم کا ہے کہ حسن و خوب صورتی اس کی کمزوری ہے اور وہ مکمل خوب صورتی چاہتی ہے۔ ہلکا سا داغ، تھوڑی سی کمی سے اس کے دل سے کوئی شخص یا چیز اتر جاتی ہے۔ بہت سارے لوگوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی افتاد طبیعت کی بنیاد پر سمجھوتا نہیں کرپاتے اور اس کا نقصان بھی وہ خود اٹھاتے ہیں کہ آخر میں خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔

صفورہ حسین گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں

میں شعاع اور خواتین تب سے پڑھ رہی ہوں جب سے آنکھیں تو الفاظ کو جانتی پہچانتی تھیں۔ مگر ذہن ناپختہ ابھی الفاظ کے مفہوم سے کسی حد تک نا آشنا تھا۔ لیکن مطالعے کی لت ایسی تھی کہ آنکھ مچولی اور تعلیم و تربیت جب تمام ہوتے تو بے چین طبیعت اور پیاسی روح کو سیراب کرنے کے لیے باجیوں کے ڈائجسٹ چھپا کر اپنے صحن میں ایستادہ بہت بڑے "بوڑھ" کے درخت کے اوپر چڑھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اب بات ہو جائے ماہ جون کے شمارے کی تو شیریں ملک کی تحریر "بات عمر بھر کی" پڑھ کے دل بہت دیر تک رنجیدہ رہا۔ "ظرف" بہت عمدہ کاوش رہی۔ یکی بات اپنے کلاسیکل نہج کے ساتھ ایک منفرد تحریر تھی۔ باقی افسانے بھی اچھے رہے۔ ناولٹ میں "دیمک زدہ محبت" تو ہے ہی بہت شان دار۔ اس کی جمیلہ مائی کو پڑھ کے کچھ کچھ "سفال گر" کی یاد آتی ہے۔ مکمل ناولز میں دونوں ناولز ہی ایک سے بڑھ کر ایک رہے۔ "برف زاروں کی تتلی" نے اداس کردیا۔ سائرہ رضا کی بات ہی نرالی ہے۔ ہائے سائرہ جی! آپ کوئی ساحرہ ہیں کیا ہیں آپ؟ کسی عام سے موضوع کو بھی قلم کی زد میں لے آئیں تو خاص بنا نے ہی نکالتی ہیں۔ اس کے علاوہ فاخرہ جبین، راحت جبین، فرحت اشتیاق، نفیسہ رزاقی، نفیسہ نازدی کریٹ، عنیزہ سید، نگہت عبداللہ اور نگہت سیماجی تو جان ہیں ہماری اور ہاں انیقہ انا کی تحریریں اور خطوط بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ان کے نام کی طرح۔

ج ۔ پیاری صفورہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سارہ، مریم، طوبیٰ، کرن اور ایشاع نے سنجر پور ضلع رحیم یار خان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین ہمارے گھر میں 1996ء سے آرہے ہیں۔ لیکن ہم تین سال سے پڑھ رہی ہیں۔ شعاع میں تمام سلسلے اچھے جارہے ہیں۔ شعاع کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ "جنت کے پتے" کا بہت اچھا اینڈ کیا۔ ہم نے 9th کے پیپر دیے ہیں۔ اب 10th میں ہیں۔ رزلٹ کا انتظار ہے۔ خط لکھنے پر جس نے مجبور کیا وہ "خط آپ کے" میں طاہرہ بتول ہیں۔ آپ نے اپنی پوری کہانی سنا دی پڑھ کر بہت افسوس ہوا ہے۔ کیا آپ کے لیے شوہر اور بچوں سے زیادہ اہم ڈائجسٹ ہیں؟ اگر آپ کے شوہر کو ڈائجسٹ پڑھنا اچھا نہیں لگتا تو آپ ڈائجسٹ پڑھنا چھوڑ دیں۔ اپنے گھر میں امن و سکون دیکھنے کے لیے اتنی سی قربانی دے لیں۔ وہ جو کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ خود کو بدلیں۔ آپ کا شوہر آپ پر ظلم نہیں کرتا۔ آپ اپنے شوہر کی نافرمانی کرکے خود پر ظلم کررہی ہیں۔ دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت خراب نہ کریں۔

ج ۔ سارہ، مریم، طوبیٰ، کرن اور ایشاع! آپ کا خط پڑھ کر شدید افسوس، دکھ اور رنج کی کیفیت میں مبتلا ہوں۔ ابھی آپ کی عمر بہت کم ہے۔ اس لیے آپ کو بہت سی باتوں کا ادراک و احساس نہیں ہے۔ مذہب کے بارے میں بھی معلومات نہیں ہیں کسی پر تنقید کرنے سے پہلے ضرورت ہے کہ آپ کو اس کی سمجھ ہو۔ ہمارے مذہب میں اگر شوہر کی فرماں برداری کا حکم ہے تو شوہر کو بھی بیوی کی دل جوئی کی تاکید کی گئی ہے۔ بات ڈائجسٹ پڑھنے یا نافرمانی کی نہیں۔ باہمی تعلقات اور حسن سلوک کی ہے۔ ایک بیوی کے جذبات کے احترام کی ہے۔ بیوی کی خوشی کا خیال رکھنے کی ہے۔ وہ گھر جہاں اخبار، ریڈیو، ٹی وی بیرونی دنیا سے رابطے کا ہر سلسلہ منقطع ہو۔ بیوی کے اس بے ضرر سے شوق کو بھی گوارا نہیں کیا جاتا تو دیگر معاملات میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ اس کا اندازا لگانا مشکل نہیں ہے۔

ساحل دعا بخاری نے محبوب شاہ بھیر پور سے لکھا ہے

شعاع اس بار پانچ جون کی دوپہر کو ملا۔ "دیوار شب" اب آخری سانسوں پہ ہے۔ جویا کو ہوش میں آتا دیکھ کے خوشی ہوئی۔ پلیز عالیہ بخاری سے ایک طویل مکمل ناول لکھوائیں۔ سعدیٰ حمید چوہدری، تنزیلہ ریاض، ماہا ملک اور نمو بخاری کو لے کر آئیں۔ رخسانہ نگار عدنان سے بھی مکمل ناول لکھوائیں۔ اب بات ہو جائے اپنے صبر اور آپ کی سرد مہری کی تو جناب! ہم نے ایک اسٹوری بنام "ڈھلتی شام" بھیجی تھی۔ ساتھ میں خط، شاعری بچ بولتی ہے وغیرہ۔ مگر آپ نے تو ہمارا نام تک شعاع میں شامل کرنا گوارا نہیں کیا۔

تجھے تو گھیرے ہی رہتے ہیں رنگ رنگ کے لوگ

تیرے حضور میرا حرف سادہ کیا کرتا؟
ایک بار پھر آپ کے در پہ آئے ہیں۔ اب آگے کا معاملہ آپ کے ہاتھ ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ۔

تم بھی ستم کرو گے تو حاصل نہ ہوگا کچھ
اس دل کے آرپار تو خنجر ہزار ہیں

ج ۔ پیاری ساحل! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا خط اور انتخاب شائع نہ ہوسکا۔ آپ تو شاعری سچ بولتی ہے کے لیے اپنا انتخاب دوبارہ بھجوا دیں۔ اس خط کا حوالہ ضرور دیں۔ کہانی ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ اچھی تحریروں کے لیے ہمارے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں اور ہم اچھی تحریروں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

تعظیم نے گاؤں بھلر یاجوہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

گھر میں سب سے چھوٹی ہوں۔ شعاع پڑھنے کی لت مجھے اپنی بڑی بہنوں سے لگی ہے۔ ہم بڑے شوق سے شعاع پڑھتی ہیں۔ سب سے پہلے سلسلے وار ناول "دیوار شب" پڑھا تو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کو میں دو سال سے پڑھ رہی ہوں۔ بہت دفعہ دل کیا کہ خط لکھوں' لیکن نہیں لکھا' سب کہتے تھے خط شائع نہیں ہوگا۔

ج ۔ پیاری تعظیم آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ آپ ہمیں خط ضرور لکھیں۔ شائع نہیں ہوگا تب بھی ہم آپ کی رائے تو جان سکیں گے اور آپ کی رائے جاننا ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ عالیہ بخاری تک آپ کی تعریف پہنچائی جارہی ہے۔

کراچی سے عروج یوسف لکھتی ہیں

آپ کے لیے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بہت ساری دعائیں' بہت سا پیار' جو ہمارے لیے اتنی زبردست تحریریں ڈھونڈتے ہیں اور پھر جمع کرکے ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس مرتبہ کا شعاع بہترین رہا۔ سب سے پہلے تو آپ سے ایک بات شیئر کرنا تھی۔ اس مرتبہ جب میں نے تقدیر کے متعلق احادیث پڑھیں تو ایک عجیب سی کیفیت ہوئی۔ خاص طور پر "جنت اور جہنم" میں جانے کے بارے میں جو تقدیر لکھی جاچکی ہے' وہ پڑھی تو ایک عجیب خوف اور بے بسی کی سی کیفیت تھی۔ پھر وہی وسوسہ جو شیطان کی طرف سے ہوتا ہے کہ اگر سب کچھ طے ہے تو پھر؟ پھر اندھیرے میں روشنی کی طرح اللہ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث اللہ تعالیٰ کی طرف سے یاد آئی کہ "نہیں کوئی چیز بدلتی تقدیر کو مگر دعا" اور یہ کہ دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ کہ ہم سب کو عمل کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے اور عمل کی قبولیت کے لیے بھی کامل ایمان کے ساتھ دعا کرنی چاہیے۔ میرا رب ہی دعاؤں کا سننے والا ہے اور قبول کرنے والا بھی وہی ہے۔ اس مرتبہ واقعی شعاع بہت عرصے بعد اپنا اپنا سا اور بہت انوکھا لگا۔ چھوٹی چھوٹی اسٹوریز اور بڑے بڑے حقائق و نتائج والی کہانیاں' پلیز لمبی لمبی' الجھی ہوئی مشکل الفاظ والی کہانیوں کے بجائے ایسی ہی تحاریر کو اپنے شعاع میں جگہ دیا کریں۔ پڑھ کر اچھا بھی لگتا ہے۔ سبق بھی ملتا ہے اور دماغ بھی نہیں تھکتا۔ عالیہ بخاری تو خیر ہماری ہی ہیں۔ ان کی تحریر تو آل ٹائم بیسٹ ہوتی ہے۔ شیریں ملک کی سدرہ ہو یا صدف کی نجف ہو۔ فرزانہ حسین کی حرا ہو یا نعیمہ ناز کے اسلم بھائی۔ سلویٰ علی کی نائلہ' ماجد اور مہوش ملک کی افشین سب نے بہت سیدھے سادھے اور پیارے طریقے سے بہت زبردست چیزیں جو سامنے کی ہیں مگر ہم بھول جاتے ہیں۔ یاد دہانی کروائی۔ سب رائٹرز کے لیے شاباش ہنزہ ورک' صائمہ اکرم اور رخسانہ نگار کی کہانیاں بھی زبردست جارہی ہیں۔

ج ۔ پیاری عروج! ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کرنی ہے اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اچھے عمل کی توفیق بھی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھیں اور دعا کریں کہ وہ ہم پر رحم فرمائے۔ وہ بہترین رحم کرنے والا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رائنل سعید نے سیالکوٹ سے لکھا ہے

جس تحریر نے خط لکھنے پر اکسایا وہ نمرہ احمد کی تحریر "جنت کے پتے" ہے۔ اس تحریر نے شروع سے آخر تک پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں رکھا۔ اس ماہ کے افسانے' ناولٹ اور مکمل ناول سب ہی اچھے تھے۔ خاص طور پر

"امیدوں کے مسافر" "ظرف" "من کے سچے" سبق آموز تھے اور "ایک تھی مثال" میں تو رخسانہ نگار جی حد ہی کردی۔ اس کو پڑھ کر تو مجھے بے حد رونا آیا۔

ج ۔ پیاری رائنل! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خطوط شامل نہ ہوسکے۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

نگینہ شاہ رجانہ سے لکھتی ہیں

شعاع مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کے سارے سلسلے بہت اچھے لگتے ہیں۔ عالیہ بخاری کا ناول بہت اچھا تھا۔

ج ۔ پیاری نگینہ' شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے' آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

عرشیہ ورک نے گجرات سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

اس ماہ کا شعاع بہت اچھا تھا۔ عرصہ بعد فاخرہ جبیں نے لکھا۔ تحریر میں کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول بہت پسند آیا۔

ج ۔ پیاری عرشیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

آمنہ حلیم گجرات سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ "ایک تھی مثال" میں عاصمہ کا حال پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ایک عزت ہی تو بچی تھی اس کے پاس جسے زبیر جیسا درندہ صفت شخص اپنی ہوس کا شکار کر بیٹھا۔ "دیمک زدہ محبت" میں شائمہ کا تخلیق کردہ کردار' سکندر شاہ شاید نہیں یقیناً" موحد ہی ہے۔ ہے نا؟ "دیوار شب" بہت خوب صورتی کے ساتھ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ "ہم کیوں ملے" ہلکی پھلکی نوک جھونک اور اسلم کے درست فیصلے کے ساتھ مزا دے گیا۔ "برف زاروں کی تتلی" فاخرہ جبیں کی بہترین کاوش اور ڈائجسٹ کی جان لگا۔ "تیری دسترس میں" پر تبصرہ کہانی کے اختتام پر۔ افسانے سب اچھے تھے۔ لیکن "امتحان شیشے کا" سب پر بازی لے گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی شعاع کے باقی سب سلسلے اچھے تھے۔

ج ۔ پیاری آمنہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ "جنت کے پتے" کا دوسرا حصہ ان شاء اللہ بہت جلد پڑھ سکیں گی۔ شعاع آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

شائمہ نصیر عاجز گاؤں کی اسلام آباد سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ٹائٹل اچھا نہیں لگا گرچہ بعد از غور ٹائٹل گرل اچھی لگنے لگی۔ وہ کیا ہے نا کہ ہم نے ہر چیز' ہر چہرے میں ہمیشہ خوب صورتی تلاشی ہے۔ تقدیر کے بارے میں علم میں اضافہ ہوا' کبھی طلاق سے متعلق احکام و مسائل بھی بیان کیجیے گا۔ کہ اگر کسی کی یادداشت چلی گئی تب بھی بیوی کو اس سے طلاق ہوجائے گی۔ اگر وہ دے۔ ڈالے سرحدی اور مری فیورٹ عائزہ خان سے ملاقات نے مجھے خوش کردیا۔ "دیوار شب" میں خیام کا نوریہ کا بھائی ہونا اچھا ٹرن نکلا۔ مگر اب کہانی مجھے رکی ہوئی لگ رہی ہے۔ "ایک تھی مثال" اچھی ہے تو سہی مگر یہ دونوں ایک سی ہونے لگی ہیں۔ مختلف نہیں کچھ۔ میرے دو افسانے منگیتر اور کالے پہاڑ کا بھی بتادیجیے۔

ج ۔ پیاری شائمہ! آپ کی ناسازی طبع کے بارے میں جان کر بہت تشویش ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت مند اور خوش و خرم رکھے۔ (آمین) خوب صورتی ہمیشہ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتی ہے اور وہ لوگ کامیاب رہتے ہیں جو ہر چہرے میں خوب صورتی تلاش کرلیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں عیب تلاش کرنا' اسے ناپسند کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ طلاق کے بارے میں پہلے دیا جاچکا ہے۔ آپ کی فرمائش پر دوبارہ دے دیں گے۔ جو شخص فاتر العقل ہو۔ اس کے اعمال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں۔ اس کا حساب کتاب صرف زندگی کے اس حصے تک ہوگا جب اس کی یادداشت سلامت تھی اور ذہن صحیح تھا۔ اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں طلاق کیسے ہوسکتی ہے۔ افسانوں کے متعلق معلوم کرنے کے لیے آپ 32721666 پر فون کریں۔

ثمینہ کوثر عطاری اور منیر شازیہ اعجاز نے ڈوگر گجرات سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

سرورق نہایت خوب صورت تھا۔ بے شمار اخبارات' میگزینز اور ڈائجسٹ ہیں لیکن آپ کے پرچوں کا معیار سب سے اعلا اور منفرد ہے۔

سچ کہیں تو رائٹرز ہی شمارے کی جان ہوتی ہیں وہ کتنے خوب صورت انداز میں معاشرے میں پھیلے تلخ حقائق کو پیش کرتی ہیں کہ ہر لمحے ہر لحظے ذہن کے کینوس پر لاتعداد نقوش ابھرتے ہیں' تصویریں بنتی ہیں اور سنورتی ہیں۔ شعاع میں ایک ناول شائع ہوا تھا "تم سنگ مہکنے لگے راستے" ہیرو کا نام داؤد اور ہیروئن کا نام تہذیب تھا پلیز دوبارہ شائع کریں۔

ج ۔ ثمینہ اور شازمہ! محدود صفحات کی بنا پر آپ کا طویل خط شائع نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہت خوب صورت انداز اور الفاظ میں شعاع کی تعریف کی لیکن کہانیوں پر تبصرہ نہیں کیا۔ آئندہ شعاع کی تحریروں کے بارے میں بھی اپنی رائے لکھیے گا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ فرمائش نوٹ کرلی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

صائمہ گل نے گاؤں چندھیری ضلع مردان سے لکھا ہے

شعاع ہماری باطنی خوب صورتی (حمد و نعت و احادیث) سے شروع ہو کر ہماری ظاہری خوبصورتی پر ختم ہوتا ہے۔

دیوار شب۔ چار سالہ ساتھ ہے اس ناول کا۔ مجھے عالیہ بخاری کا انداز تحریر بے حد انسپائر کرتا ہے۔ ان کے لفظوں میں کرداروں میں عجیب سی متانت' ٹھہراؤ ہوتا ہے' عالیہ نے ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ سالار اور گیتی' معاذ اور جویا' خیام اور ربیعہ۔ حتیٰ کہ راجو اور زری سب اپنی منزل پر جا ٹھہرے۔ صائمہ اکرم کا "دیمک زدہ محبت" رفتہ رفتہ جان پکڑ رہا ہے۔

"برف زاروں کی تتلی" کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں' محبتوں سے گندھی ہوئی تحریر۔ بہت شکریہ فاخرہ جی! اسال میں ایک دوایسے تحفے اپنے قارئین کو دیا کریں۔ نعیمہ ناز نے اچھا موضوع چنا۔ مجھے ایسی ہی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ جہاں بھلے ضروریات زندگی کی کمی ہو مگر محبت' ایثار اور قربانی کوٹ کوٹ کر بھری ہو جہاں مدر ڈے پر آئس کریم اور چوڑیاں لا کر اپنی ماں سے محبت اور عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

مہوش افتخار کا "تیری دسترس میں" حقیقت سے دور افسانوی رنگ لیے ہوئے تھا اگرچہ اجیہ ابھی غصے اور نفرت کے تمام ریکارڈ توڑ رہی ہیں' لیکن آخر میں نذار علی کے سامنے دل ہار جائے گی۔

"امتحان شیشے کا" نے باور کرادیا کہ عورت کا گھر کوئی نہیں۔ عورت نے ہر قدم پر انا' خودداری اور محبت کی قربانی دے کر اپنا آشیانہ سمیٹا ہے۔

"ظرف" اور "من کے سچے" اچھا تاثر چھوڑ گئے۔

ج ۔ صائمہ! آپ نے تحریروں پر تبصرے کے ساتھ تجزیہ بھی کیا جو بہت اچھا لگا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے' آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

صبا طارق نے تربیلہ غازی سے لکھا ہے۔

مجھے جب میری دوست نے بتایا کہ تمہارا خط شائع ہو گیا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مگر جب میں نے اپنا خط پڑھا تو غم و غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ میرا اتنا لمبا خط آپ نے ایڈٹ کر کے ... [illegible] بنا دیں۔ اس دفعہ میں کسی کہانی پر تبصرہ نہیں کروں گی۔

ج ۔ پیاری صبا! آپ کی ناراضی سر آنکھوں پر لیکن یہ ہماری مجبوری ہے محدود صفحات میں ہم خطوط ایڈٹ نہ کریں تو چند خط ہی شامل ہو پائیں گے۔ اس لیے جن کہانیوں پر ایک ہی طرح کا تبصرہ یا پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے' ہم کوئی ایک خط شامل کر لیتے ہیں اور باقی خطوط ایڈٹ کر دیتے ہیں' ایک ہی بات بار بار پڑھ کر قارئین اکتا بھی سکتی ہیں' اب آپ فیصلہ کریں آپ کی ناراضی کس حد تک درست ہے۔

انعم' عنبرین' عائشہ۔ فیصل آباد سے تشریف لائی ہیں۔

ٹائٹل بہت اچھا تھا' فہرست میں فاخرہ جبین کا نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ "برف زاروں کی تتلی" کہانی بہت اچھی تھی اور منظر کشی بہت خوب صورت تھی' پھر دوڑ کر ہم مہوش افتخار کی کہانی "دسترس میں" شروع میں بہت اچھی لگی تھی اور یہ کیا آئندہ ماہ آخری قسط (پھر انتظار' ماہ) "دیمک زدہ محبت" کچھ خاص متاثر نہ کر سکی (سوری صائمہ جی) رخسانہ نگار کی کاوش "ایک تھی مثال" اچھی تحریر ہے۔ تبصرہ محفوظ ہے' افسانوں میں سلویٰ جی بازی لے گئیں۔ "ظرف" واقعی ایک مچھلی سارا تالاب گندہ کرتی ہے۔ ماہ وش طلعت کا افسانہ ہمارا عافیت کدہ صرف ہمارا اپنا گھر ہی ہوتا ہے۔ "میسر دو جہاں میں" آمنہ زریں کا تبصرہ اچھا لگا۔ آپی شعاع میں کنیز نبوی کا ناول "نگیاں پریم نگر دیاں" کس مہینے اور کس سال شائع ہوا ہے پلیز بتا دیں' ثمرہ بخاری اپنے جوادی تجلی کے ساتھ حاضر ہو جائیں۔ مائرہ خان کا انٹرویو دیں پلیز۔

ج ۔ انعم' عنبرین اور عائشہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے جون کے شمارے میں جوادی اور تجلی موجود تھے۔ شاید آپ خواتین ڈائجسٹ نہیں پڑھتی ہیں۔ یہ ناول مارچ 2010 میں شائع ہوا تھا۔

رضیہ کوثر نے شاہدرہ ٹاؤن لاہور سے لکھا ہے۔

جیسے ہی کچھ پڑھنے کے ارادے سے میں نے اپنی کتابوں کی الماری کا دروازہ کھولا تو میرے ہاتھ میں جو چیز آئی اسے دیکھ کر مجھے کرنٹ سا لگا میرے دل کی دھڑکنیں اچانک بے ترتیب ہونے لگیں۔ ارے کوئی ایسی ویسی چیز نہیں یہ تو میری جان شعاع تھا جسے میں نے کچھ عرصہ پہلے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ گھروں میں سو مسئلے مسائل ہو جاتے ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ شعاع کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں' اچھی یادیں ہی انسان کی زندگی کا اصل سرمایہ ہوتی ہیں۔ آپی کیا میں افسانہ لکھنے کی جسارت کر سکتی ہوں۔

ج ۔ رضیہ جی! زندگی کے مسائل انسان کو اس طرح گھیرتے ہیں کہ وہ ہر چیز سے بیگانہ ہو جاتا ہے' آپ کچھ عرصہ شعاع سے دور رہیں' لیکن خوشی کی بات ہے کہ اب آپ شعاع میں دلچسپی لے رہی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ان مسائل کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے اور زندگی میں کامیابی کا راز یہی ہے کہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ افسانہ ضرور لکھیں' پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

ثوبیہ رفیقی نے جہلیاں سے لکھا ہے۔

بوجہ سلسلہ تعلیم ڈھائی سال تک خط نہ لکھ سکی اب فارغ ہوں۔

نئی لکھنے والی رائٹرز میں مقدس مشعل اور نایاب جیلانی منفرد لکھ رہی ہیں آپ شعاع کے لیے زیادہ سے زیادہ لکھا کریں۔ رابعہ کے افسانے بہت اصلاحی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ غائب کہاں ہیں۔ پلیز ہمارے لیے کوئی اچھا سا افسانہ لکھ دیں۔ سلمٰی یاسمین بھی آپ کے طنز و مزاح پر مبنی افسانے ہمارے لیے انمول خزانہ ہیں۔ "کیسے کیسے لوگ" پلیز شعاع کو اپنی تحریروں سے دوبارہ سے آراستہ و پیراستہ کرا دیجیے نا۔ !ام طیفور کی "قصائی ہرجائی" بھی بہت دلچسپ تحریر تھی۔

ج ۔ ثوبیہ! طویل وقفے کے بعد خط لکھا بہت خوشی ہوئی تقریباً" دو ڈھائی سال پہلے آپ کے اور عالیہ تصور رفیقی کے خطوط ہر ماہ باقاعدگی سے موصول ہوتے تھے' تعلیم مکمل ہونے پر مبارک باد اور دعائیں۔

آپ کا پیغام مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

صالحہ' عدیل' اقصیٰ جاوید میرپور آزاد کشمیر سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

سب سے پہلے پڑھے ہم عالیہ بخاری کے "دیوار شب" کی طرف تو جناب ہمیشہ کی طرح ان کی یہ قسط بھی شاندار رہی' ایک ہی قسط میں خیام کا اپنے باپ سے ملنا اور نانی کے پاس جانا بہت اچھا لگا۔ لیکن عالیہ جی پانچ سالوں سے آپ گل اور سلمان کی وہی بے سروپا باتیں اب بھی جاری ہیں پلیز جویا کی حالت پر اب تو رحم کریں اور اسے معاذ سے ملوا دیجیے اور آپا گل کو تو کوئی نہ کوئی بڑی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ "ایک تھی مشعل" میں عاصمہ کے ساتھ بہت برا ہوا۔ مجبور اور بے سہارا عاصمہ کا دکھ ہم نے دل سے محسوس کیا۔ فوزیہ بے چاری کو ناحق سزا ملی۔ نعیمہ ناز کا ناول بھی اچھا تھا۔ اسلم نے رامین کے لیے اچھا سوچ کر اپنی محبت کو معتبر ثابت کر دیا اس کے گھر میں واقعی شبو جیسی لڑکی ہی گزارہ کر سکتی تھی۔ فاخرہ جبیں کا ناول بھی اچھا تھا۔ ماہین کا پراسرار سا کردار اچھا لگا۔ ہمیں تو شروع سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ ماہین نے بخت کو دیکھا ہے'

ج ۔ صالحہ اور اقصیٰ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ خواتین اور شعاع کے لیے آپ علیحدہ لفافے استعمال کریں۔ شعاع کے مختلف سلسلوں کے لیے آپ ایک لفافہ استعمال کر سکتی ہیں۔

فوزیہ ثمرین اور طیبہ عمران نے گجرات سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

جون کی تپتی سلگتی کرن نے ٹائٹل دیکھ کر اور تپا دیا۔ ذرا

اچھا نہ تھا اور پھر سوتنے پہ سہاگہ۔ بڑی بے تابی سے صائمہ اکرم کو پڑھا۔ اس بار کہانی سپرہٹ تھی۔ عائشہ کو علی مل گیا۔ اس کردار کی وضاحت نہیں کی اور یہ ماہم کس خوشی میں علی کے پیچھے پڑ گئی۔ پہلے موحد پھر رامس اور اب علی۔ سکینہ کو ڈاکٹر خاور کی ماما سے سوٹ دلا کر اور اک نئی خوش فہمی میں مبتلا کر دیا رائٹر صاحبہ نے۔ میری اور بھابھی طیبہ کی شرط لگی ہے۔ ثنائلہ کا سکندر شاہ موحد ہے۔ کیونکہ جب ثنائلہ گاڑی سے ٹکراتی ہے تو موحد گاڑی میں بیٹھا ہوتا ہے اور ڈرائیور ثنائلہ کو اس کی گری فائل پکڑاتا ہے۔

فاخرہ جبیں کی تحریر "برف زاروں کی تتلی" محبت کی مٹی سے گوندھے الفاظ' پہاڑوں کی خوب صورت منظر کشی جو مائیں اولاد سے غفلت برتتی ہیں خاص کر لڑکی ذات سے پھر ان کی شخصیت میں ایسے ہی خلا رہ جاتے ہیں۔ ایک سبق آموز تحریر تھی۔

ہم کیوں ملے۔ نعیمہ ناز کی اچھی کہانی تھی۔ اسلم نے ایک اچھا فیصلہ کیا۔ اینٹ جس عمارت کی ہو' وہاں ہی سوٹ کرتی ہے۔ محبت نہ ملے تو صبر آہی جاتا ہے' مگر مل کر مل جائے۔ محبت کی سراسر توہین ہے۔ اسلم کے بہن بھائیوں کی مزیدار نوک جھونک سے کہانی میں مزہ آگیا تھا۔ افسانے تقریباً" سب ہی بہت اچھے بلکہ سبق آموز تھے۔

انٹرویوز اس بار بھی پھیکے پھیکے لگے۔ پورے شعاع میں مزاح مفقود تھا۔ رائٹرز سے درخواست ہے کہ وہ اس تپتے سلگتے گرمی کے چند مہینوں میں خوش مزاج' مزاحیہ جملوں سے مزین تحریریں لکھیں۔

ج ۔ فوزیہ اور طیبہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے لکھا ہے۔

"ایک تھی مثال" کی یہ قسط کافی دھماکے دار تھی۔ عاصمہ کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ پڑھ کر میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز کے رہ گیا۔ زبیر کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔ "ہم کیوں ملے" اس ناول میں اسلم کا کردار کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ شروع میں تو اسلم کی ذات میں خود غرضی اور بے حسی ہی نظر آئی شبو اپنے بچپن کی منگیتر کے احساسات کی پرواہ کیے بغیر وقتی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر رامین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جب کہ شبو کا کردار بہت ہی دلچسپ تھا اس ناول کا اینڈ زبردست تھا۔ "برف زاروں کی تتلی" آوٹ اسٹینڈنگ ناول تھا۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ فاخرہ جبیں نے بہت سحر انگیز لفظوں میں یہ تحریر لکھی ہے ماہن وجدان کا زرد پتوں میں دفن مردہ تتلیوں کو کھوجنا' اس کی شہد رنگ آنکھیں' اس کا کھویا کھویا سا لہجہ اس کا ہر انداز مجھے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوا۔ اس ناول کے اینڈ نے مجھے بہت اداس کر دیا۔ "دیمک زدہ محبت" کی یہ قسط فنٹاسٹک تھی۔ اس ناول میں زندگی کے سارے رنگ ہیں۔

افسانوں میں سیریں ملک کا افسانہ "بات عمر بھر کی ہے" نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ نبیلہ عزیز سے پلیز صرف ایک مکمل ناول لکھوائیں نا..... پلیز۔

ج ۔ پیاری مسرت! سب سے پہلے معذرت کہ آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہو سکا۔ آپ ہماری نہ صرف بہت اچھی قاری ہیں بلکہ ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے بہت تفصیلی تبصرہ بھی کرتی ہیں۔ مسرت ہم آپ کے خطوط پوری توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں اگر شامل نہیں کر پاتے ہیں تو اسے ہماری مجبوری سمجھیں۔ شعاع کے ساتھ آپ کا تعارف جلد شامل کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

شعاع کے ساتھ

ادارہ

1 ۔ شعاع سے وابستگی کب ہوئی یہ یاد نہیں' بس اتنا پتا ہے باجی نازیہ پڑھا کرتی تھیں۔ بس ان ہی سے چسکا پڑا۔ ان کی شادی ہو گئی۔ سارے رسائل ساتھ لے گئیں تو ہم بور ہو گئے۔ پہلے صرف پرانے شعاع پڑھتے۔ اب دو' تین سال سے باقاعدہ لینا شروع کیا ہے۔ مجھے مطالعے کا اتنا شوق ہے۔ ابھی تک بچوں کی کہانیاں اور جو بھی اخبار کتاب ملے' پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ رسالہ پڑھنے پر تقریباً" سب کو اعتراض تھا کیسے پڑھتی۔ یہ نہ پوچھیں۔ بڑے لمبے لمبے قصے ہیں۔ بس اتنا بتا ہے جب دوپہر میں لائٹ جاتی تو سب باہر درخت کے نیچے ہوتے تھے اور میں پسینے میں بھیگی رسالہ پڑھنے میں مصروف اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ کمرے میں میری کونے میں ایک مخصوص چارپائی ہے۔ جس پر لیٹ کر رسالے پڑھتی ہوں جیسے ہی کوئی اندر آئے فٹ رسالہ گدے کے نیچے اور میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

2 ۔ میری صبح کا آغاز امی کی آواز سے ہوتا ہے' ٹائم پر آنکھ کھل جاتی ہے۔ مگر امی کی آواز کی منتظر رہتی ہوں۔ ایک آواز آئی اور میں نے بستر چھوڑ دیا۔ پہلے نماز پڑھتی ہوں۔ پھر ترجمے کے ساتھ قرآن پاک۔ امی کی طبیعت ٹھیک ہو تو ناشتا وہ بناتی ہیں' ورنہ میں خود بنا لیتی ہوں۔

جتنے میں وہ ناشتا بناتی ہیں' اتنے میں کمرے اور برآمدے میں جھاڑو لگا کر پوچا لگا دیتی ہوں۔ پھر ابو کو ناشتا دیتی ہوں۔ ساتھ ساتھ خود بھی کھا لیتی ہوں۔ پھر چھوٹے بھائی کو اسکول کے لیے تیار کر کے روانہ کرتی ہوں اور جلدی جلدی برتن دھو کر خالہ کے گھر کی طرف دوڑ لگاتی ہوں۔ پیچھے سے جو ایک آدھ کام رہ جاتا ہے' وہ امی کر لیتی ہیں۔

میں آپ کو یہ بتا دوں' میری خالہ نے تینوں بیٹیاں بیاہ دی ہیں اور ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی' بیٹے ابھی شادی کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے گھر کا کام بھی میں کرتی ہوں۔

ادھر جا کر صحن میں سے چارپائیاں اور کمروں میں سے پھیلاوا وغیرہ سمیٹ کر جھاڑو لگاتی ہوں۔ گھر بھی اتنا بڑا ہے۔ پھر سارے کمروں اور کچن میں پوچا لگاتی ہوں۔ برتن خالہ کبھی دھو دیتی ہیں اور کبھی میں' پھر واش روم وغیرہ دھو کر اپنے گھر کا رخ کرتی ہوں۔

اس سارے کام کو ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ گھر ساتھ ہی ہے۔ پھر اگر ان کی بھنڈی وغیرہ کی چنائی ہو رہی ہو تو کھیتوں میں جا کر بھنڈی توڑنی بوریاں بھرنا۔ عورتوں کو پیسے دینا۔ اس سارے کام میں گیارہ بارہ تو بج ہی جاتے ہیں۔ جس دن بھنڈی نہ ہو تو کوئی کپڑا سلائی کرنے والا ہو تو وہ سوٹ سلائی کرتی ہوں۔

اتنے میں بارہ بج جاتے ہیں اور لائٹ چلی جاتی ہے۔ پھر دو بجے آتی ہے۔ دوپہر کا کھانا بنانا' ظہر کی نماز اور قرآن پڑھنا۔ چھوٹا بھائی بھی اسکول سے آجاتا ہے۔ اس کا یونیفارم اتروانا۔ نہلانا اسے سلانا سب ان دو گھنٹوں میں ہوتا ہے۔ دو بجے لائٹ آتی ہے تو سب لیٹ جاتے ہیں اور میں کوئی رسالہ وغیرہ اٹھا لیتی ہوں۔

وہ پڑھ لیا ہو تو اپنا دستہ اٹھا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ قرآن پاک سے آیتیں اور رسالوں سے اچھی باتیں' واقعات وغیرہ اتارتی ہوں۔ پھر تقریباً" چار بجے دوپہر کے برتن وغیرہ دھو کر سبزی وغیرہ بنا کر رکھ جاتی ہوں۔ اور خالہ کے ساتھ سبزی بنواتی ہوں۔ واپس آکر اپنا سالن تیار کرتی ہوں اور آٹا گوندھ کر رکھ دیتی ہوں۔ پھر خالہ کا سالن اور آٹا گوندھتی ہوں۔

عشاء کی اذان ہو جاتی ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد رات کو سونے سے پہلے قرآن پاک روز پڑھتی ہوں۔ پھر نیا شعاع ہوا تو ٹھیک ورنہ سو جاتی ہوں۔ نیند آئے فورا" آجاتی ہے۔ نہ آئے تو ساری رات ایسے ہی گزر جاتی ہے۔ بس یہ ہی سادہ سی روٹین ہے۔ ان سب میں رسالوں کے لیے ٹائم میں خود نکال لیتی ہوں۔ بقول جہان کے (بھئی میں جنت کے پتے کے ہیرو کی بات کر رہی ہوں۔) وقت ہوتا نہیں' نکالا جاتا ہے۔

3 - خامیاں' خوبیاں سب میں ہوتی ہیں۔ مجھ میں بھی ہیں خوبیاں۔ مجھے غصہ کم آتا ہے۔ قوت برداشت بھی زیادہ ہے۔ سادہ سی ہوں۔ ہر کسی کا کام کر دیتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں۔ سب مجھ سے خوش رہیں' کوئی میری وجہ سے دکھی نہ ہو۔ بے حد رحم دل ہوں۔ مذہب سے خاصا لگاؤ ہے۔ قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے اور اللہ کی رضا میں خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہر کام میں ماہر ہوں۔ غرور' تکبر جیسی چیزیں مجھ میں ناپید ہیں خوش اخلاق ہوں۔

اور یہ سب باتیں میں نے اپنی طرف سے نہیں لکھیں۔ لوگوں نے کہی ہوئی ہیں اور میری سب سے اچھی عادت جو مجھے خود بے حد پسند ہے۔ ہر کسی کو سلام کرنا۔ اعتبار بہت جلد کر لیتی ہوں جس وجہ سے کافی دفعہ بے وقوف بھی بن جاتی ہوں۔

مجھے اپنی تعریف سنتے ہوئے بے حد شرم آتی ہے۔

حفصہ کہتی ہے "یا اللہ لوگوں کی اتنی اتنی بہنیں ہیں سب کی سب' اتنی چالاک ہیں اور مجھے ایک ہی دی ہے۔ وہ بھی اتنی بے وقوف اور احمق اور میں بس مسکرا کر رہ جاتی ہوں۔ کیونکہ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔ میری بہن بہت نیک اور اچھی ہے۔ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے۔

5 بارش سب کو پسند ہوتی ہے' مجھے بھی ہے۔ مگر نہ جانے کیوں بقول سائرہ رضا بارش جو خوشی اور رحمت کا نام ہے اندر سے انسان کو خالی اور اداس کر دیتی ہے۔ میری بارشیں گھر کے اندر سے پانی نکالتے بارش کے لیے رستا بناتے چھت پر چڑھ کر دیکھتے کہیں کوئی سوراخ تو نہیں گزرتی ہیں ایک دفعہ میں نے بالکل نئی اے لائن قمیص پہنی۔ ادھر سے بارش آگئی۔ امی نے فورا" کہا۔

"اوپر جا کر دیکھو' کہیں کوئی سوراخ تو نہیں۔" سیڑھی لگا کر اوپر چڑھی۔ اترتے ہوئے قمیص کا کونا اور ٹراؤزر کا پائنچا دونوں اڑ کر پھٹ گئے۔ بے حد غصہ آیا۔ میری اکثر بارشیں بھنڈیاں اور کھیرے، توڑتے کھیتوں میں گزری ہیں۔ اتنے خوب صورت لمحات اور واقعات ہیں۔ مگر وہی صفحات کی۔ بارش میں چاول اور میٹھے گلگلے اچھے لگتے ہیں۔

6 - پسندیدہ اقتباس بہت سارے ہیں۔ مگر نمرہ احمد کا جنت کے پتے کا یہ اقتباس بے حد پسند ہے۔

"چیزیں وقتی ہوتی ہیں۔ ٹوٹ جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔" پسندیدہ ناول جنت کے پتے" مصحف' رقص جنوں اور بھی بہت سارے ہیں۔ جنت کے پتے کی عائشے اور رقص جنوں کی عائشہ اپنا کردار محسوس ہوتا ہے۔ پسندیدہ شعر بھی بہت ہیں۔ مگر یہ بے حد پسند ہیں۔

خطا وار سمجھے گی دنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

میں اس دنیا کو دیکھ کر اکثر حیران ہوتا ہوں
نہ بن سکا چھوٹا سا گھر یا رب دن رات روتا ہوں
کیسے تو نے جہاں سارا بنا ڈالا

بنت الصبور
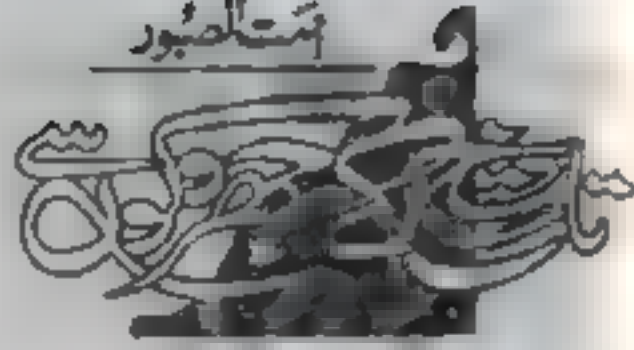
مامون اور امین

حکایت :

ایک دن زبیدہ نے امیر المومنین ہارون الرشید سے شکوہ کیا کہ "آپ مامون سے بہت پیار کرتے ہیں اور محمد امین سے بے توجہی برتتے ہیں' حالاں کہ وہ مامون سے بڑا ہے اس کا حق اسے ملنا چاہیے۔"

دراصل امین ملکہ زبیدہ کا بیٹا تھا۔ جبکہ مامون ایک ایرانی لونڈی مراجل کے بطن سے تھا۔ ملکہ زبیدہ نے ضد کر کے امین کو ولی عہد بنوایا تھا۔

ہارون نے جواب دیا۔ "تمہیں یوں ہی خیال ہو گیا ہے۔ ورنہ دونوں میرے لخت جگر اور نور نظر ہیں اس لیے میری نظر میں برابر ہیں' بلکہ میں تمہاری وجہ سے امین ہی کا کچھ زیادہ خیال کرتا ہوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مامون اس شفقت کا زیادہ حق دار ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو ابھی امتحان کیے لیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ہارون الرشید نے ایک خادم سے کہا کہ فورا" محمد امین کے پاس جاؤ اور بلا اجازت اندر چلے جاؤ۔ دیکھو کس حال میں ہے' کیا کر رہا ہے اور کون کون شخص اس کے پاس بیٹھا ہے؟ ساتھ ہی اس کو میرا یہ حکم بھی پہنچاؤ کہ وہ جس لباس میں بیٹھا ہے اسی لباس میں یہاں چلا آئے۔"

خادم دوڑا ہوا محمد امین کے پاس پہنچا۔ دیکھا کہ وہ عیش و عشرت کا لباس پہنے کنیزوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ خادم نے امیر المومنین کا حکم پہنچایا اور وہ اسی حالت میں باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

امیر المومنین نے بڑے پیار سے پاس بٹھایا اور بولا "کوئی ضرورت ہو تو بیان کرو۔"

محمد امین نے جواب دیا۔ "یا امیر المومنین! فلاں مقام پر ایک بہت حسین اور شاداب باغ ہے اور اس کے ساتھ ایک عالی شان محل بھی ہے۔ سیر و تفریح کے لیے نہایت دلچسپ جگہ ہے۔ اگر امیر المومنین یہ مقام مجھے عنایت فرما دیں تو میری تفریح کے لیے موزوں رہے گا۔ کمال بندہ نوازی ہو گی۔"

امیر المومنین نے فرمایا۔ "بہت اچھا' وہ باغ اور محل تمہیں دیا اور کچھ مانگو۔"

محمد امین نے عرض کی۔ "فلاں فلاں گھوڑا مجھے بہت پسند ہے۔ میری سواری کے لیے بہت اچھا رہے گا۔ اگر امیر المومنین مہربانی فرمائیں تو بہت خوب ہو۔"

امیر المومنین نے یہ عرض بھی قبول کی اور کہا "اچھا اب تم جاؤ۔" جب وہ چلا گیا تو زبیدہ کو مخاطب کر کے بولا۔ "محمد امین کا لباس تم نے دیکھ لیا؟ اس کی درخواستیں سن لیں؟ اس کی مجلس کا حال معلوم کر لیا؟ اب مامون کی باری ہے۔"

خادم کو حکم دیا۔ "اب مامون کے پاس جاؤ اور جس حالت میں بیٹھا ہو اسی حالت میں یہاں لے آؤ۔"

خادم مامون کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس نے جنگی لباس پہن رکھا ہے اور ہتھیار باندھ رکھے ہیں۔ بہت سے غلام فرش پر بیٹھے ہیں اور خود ایک چوکی پر رحل پر کتاب رکھے' شمع کی روشنی میں اس کا مطالعہ کر رہا ہے۔ خادم نے خلیفہ کا حکم پہنچایا تو اٹھ کھڑا ہوا اور فورا" باپ کی خدمت میں پہنچا۔

ہارون نے پوچھا۔ "یہ ہتھیار کیوں باندھ رکھے ہیں؟ کہاں کا ارادہ ہے؟ آج کل تو کوئی جنگی مہم درپیش نہیں ہے۔"

مامون نے ادب سے زمین کو بوسہ دے کر جواب دیا۔ "دنیا میں امیر المومنین کے دشمن بہت ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اگر اچانک حملہ کر دیں اور ہم تیار نہ ہوں تو خدانخواستہ بہت برے نتیجے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے میں اور میرے غلام ہر

وقت کیل کانٹے سے لیس رہتے ہیں کہ اگر ایسا وقت آجائے تو ہمیں مقابلے کے لیے تیار پائے۔"

یہ سن کر ہارون الرشید اس کی احتیاط پسندی اور پیش بینی پر بہت خوش ہوا۔ خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پیار سے بولا "بے شک احتیاط اور دانائی کا یہی تقاضا ہے جو تم نے اختیار کیا!"

پھر پوچھا "اس وقت کون سی کتاب کا مطالعہ ہو رہا تھا؟"

مامون نے جواب دیا۔ "عام طور پر بادشاہوں کے حالات و واقعات کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ اس وقت بھی ایک ایسی ہی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میری خواہش ہے کہ اگلے بادشاہوں کے اخلاق و عادات سے واقفیت حاصل کر لوں تاکہ ان کی پیروی کی جا سکے۔"

امیر المومنین نے کہا۔ "اگر کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ پوری کی جائے گی۔"

مامون نے جواب دیا "امیر المومنین کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رہے۔ ایران اور عرب کے بہت سے عالم اور امیر قید خانوں میں بے کار بند ہیں انہیں قید رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ سرکاری خرچ بڑھے اور دوسرے اخلاقی قیدیوں کو تکلیف ہو۔ اگر امیر المومنین حکم دیں تو ان کو شرعی احکام کے مطابق وقتی سزا دے کر یا جرمانہ کر کے چھوڑ دیا جائے۔ سب لوگ دعائیں دیں گے اور امیر المومنین کے اقبال و عمر و دولت کی ترقی کا سبب ہو گا۔"

امیر المومنین نے فرمایا۔ "جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہو گا اور کوئی درخواست؟"

مامون نے جواب دیا۔ "امیر المومنین ہمیشہ سلامت رہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ فوج کے سپاہی اور دوسرے اہل کار خرچ سے تنگ ہیں۔ تنخواہ ملنے کا زمانہ بھی ہے۔ اگر ان کی تنخواہیں دے دی جائیں تو مناسب ہو گا۔ کیوں کہ سلطنت اور حکومت کے تمام امور کا انحصار ان ہی لوگوں کی ذات پر ہے۔"

امیر المومنین نے کہا۔ "بہتر ہے۔ کل خود ہی ہمارا فرمان پہنچا دینا کہ سب کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں اور کوئی حاجت ہو تو کہو۔"

مامون نے جواب دیا۔ "بغداد اور اس کے آس پاس کے دیہاتیوں کی مالی حالت بہت خراب ہے۔ حکومت کو زیادہ مال کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ کے فضل سے خزانہ مالا مال ہے۔ اس لیے اگر ان علاقوں کے مظلوم دیہاتیوں کو محصول معاف کر دیا جائے تو وہ اپنی حالت سنبھال سکیں گے اور امیر المومنین کے حق میں دعا کریں گے۔"

امیر المومنین نے کہا۔ "میں نے بغداد اور اس کے ضلعوں کا ایک سالہ لگان معاف کیا۔"

یہ سن کر مامون نے ادب سے سلام کیا اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد امیر المومنین نے زبیدہ مخاطب کر کے کہا۔

"تم نے امین کا لباس بھی دیکھا اور مامون کا بھی؟ امین کی درخواستیں بھی سنیں اور مامون کی بھی۔ امین کے حالات بھی معلوم کیے اور مامون کے بھی؟ مامون نے ایک درخواست سے عرب و عجم کے کتنے مشہور عالموں اور امیروں کو قید سے چھڑوا دیا۔ دوسری درخواست سے تمام لشکر کی چڑھی ہوئی تنخواہیں دلوا دیں۔ تیسری درخواست سے بغداد اور اس کے علاقے کا لگان معاف کرا دیا۔ اب دیکھو! یہ ہزاروں لوگ جن کو اس نے قید سے چھڑوایا' تنخواہیں دلوائیں اور محصول معاف کرایا ہے اور ساتھ ہی مجھے کتنی دعائیں دیں گے اور ان کے دل پر اس کی نیکیوں کا کتنا اثر ہو گا۔ پھر میں ایسے بیٹے کو کیوں نہ پیار کروں؟"

یہ سن کر زبیدہ نے جواب دیا۔

"امیر المومنین کی رائے ہمیشہ صائب ہوتی ہے۔ اخلاق اور حرص دونوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ جو اللہ چاہے وہی ہو گا۔ میرا چاہنا کیا چیز ہے؟"

محبت اور مصلحت کی کشمکش

عضد الدولہ کے لیے چین سے ایک کنیز لائی گئی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ عضد الدولہ ایک لمحے کے لیے اس سے جدا ہونا پسند نہ کرتا۔ یا تو یہ حالت تھی کہ سلطنت کے مختلف حصوں سے صدہا عرضیاں اور مراسلے روزانہ موصول ہوتے تھے اور وہ اسی روز ان سب کا جواب لکھواتا تھا اور ہر ایک پر اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا تھا یا یہ عالم ہوا کہ دفتر کے دفتر جمع ہونے لگے مگر بادشاہ کو کنیز کے سوا کسی چیز کی سدھ بدھ نہ رہی' نہ کسی عرضی کا جواب' نہ دستخط' نہ دربار' نہ امور سلطنت تمام کاروبار کی طرف سے آنکھ بند کر لی۔

جب بادشاہ کی غفلت حد سے گزر گئی تو لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ بادشاہ کو بھی احساس ہوا کہ یہ ساری خرابیاں اس کنیز کے سبب سے پیدا ہوئی ہیں۔ ایک دن غصہ آیا تو حرم سرا کے محافظ خاص شکر کو حکم دیا کہ۔

"اس کو لے جاؤ اور دجلہ میں پھینک آؤ!"

شکر نے سوچا کہ بادشاہ نے غصے میں ایسا حکم دیا ہے۔ کل ضرور پچھتائے گا اور جب کنیز کو زندہ نہ پائے گا تو میری جان کی خیر نہیں۔

یہ سوچ کر اس نے کنیز کو ایک علیحدہ مکان میں لے جا کر چھپا دیا اور دوسرے دن امیر کی خدمت میں عرض کر دی۔

"حضور کے حکم کے مطابق اسے دریا میں پھینک آیا ہوں۔"

چند روز گزرنے پر عضد الدولہ کو کنیز کی یاد ستانے لگی۔ اپنے کیے پر پچھتاتا اور بے چین ہو کر چلاتا۔

"یہ میں نے کیا کیا؟ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔"

ایک دن اپنے مصاحبوں کے ساتھ مجلس عیش میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں شکر ادھر آ نکلا۔ اس پر نظر پڑی تھی کہ دل کے زخم ہرے ہو گئے۔ چینی کنیز کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ غم و غصے سے بے قابو ہو کر بولا۔

"کیوں او بدبخت! سنگ دل! تو نے کس دل سے اس نازنین کو پانی کی راہ مٹی میں ملا دیا۔"

یہ کہہ کر غلاموں کو حکم دیا کہ "اسے بھی لے جا کر دجلہ میں پھینک دو تاکہ آئندہ مجھے اس کی منحوس صورت نظر نہ آئے۔ کیوں کہ جب بھی اس پر نظر پڑتی ہے مجھے میری محبوبہ یاد آجاتی ہے اور دل کے گھاؤ ہرے ہو جاتے ہیں۔"

حکم ملتے ہی غلاموں نے شکر کو آ گھیرا۔

جب شکر نے دیکھا کہ اب جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ دو قدم باہر کی طرف اور بڑھے تو کوئی غلام اس کی بات نہ سنے گا۔ چلا کر بولا۔

"حضور! جان کی امان پاؤں تو مردہ کنیز کو زندگی کی حالت میں سامنے لے آؤں۔ بات یہ ہے کہ مجھے آج کے دن کا پہلے سے اندیشہ تھا۔ اس لیے میں نے اسے دجلہ میں نہیں پھینکا۔"

عضد الدولہ نے اسی وقت کنیز کی حاضری کا حکم دیا اور وہ سامنے کیا آئی کہ بادشاہ کو عید نظر آئی۔ خوشی سے بے خود ہو کر شکر کو خلعت اور دولت سے مالا مال کر دیا اور اب پھر نئے سرے سے اس کی زندگی رنگ رلیوں میں گزرنے لگی۔

کچھ عرصے تک یہی رنگ رہا اور پہلے کی طرح پھر حکومت کے کاموں میں ہرج ہونے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عضد الدولہ نے دوبارہ چینی کنیز کو شکر کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ "اسے غرق کر آؤ۔"

شکر نے اس مرتبہ بھی پہلی سی احتیاط برتی اور کنیز کو غرق کرنے کے بجائے کہیں چھپا دیا۔ ایسا کرنا اس کے حق میں اچھا ہوا۔ کیوں کہ چند ہی روز بعد پھر بادشاہ کو کنیز یاد آئی اور شکر کو حاضر کرنی پڑی اور کچھ عرصے کے لیے پھر عضد الدولہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا اور پہلے کی طرح پھر سلطنت کے کاموں میں خلل واقع ہونے لگا۔

"ادھر آ! اس کشتی کو دیکھ!"

کنیز آگے بڑھ کر دروازے کے قریب آئی اور دریا کی طرف دیکھنے لگی۔ یکایک عضد الدولہ نے اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا اور جب دیکھا کہ وہ مردہ ہو چکی ہے تو غلاموں کو حکم دیا۔

"اسے نکال لاؤ۔" اور لوگوں پر ایسا ظاہر کیا جیسے کنیز خود دریا میں گر پڑی ہو چناں چہ کئی دن تک اس نے کنیز کا سوگ منایا اور اس کی یاد میں بے تاب رہا۔ ✡

تبصیر نشاط
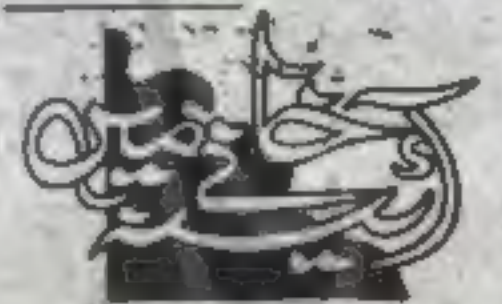
مہمان نوازی

ماضی کے معروف عام کردار لیلیٰ کا معروف حوالہ تو بس ایک مجنوں ہی تھا۔ مگر مختلف کردار ادا کرنے والی ہماری معروف اداکارہ لیلیٰ کے حوالے بھی مختلف ہیں۔ اداکاری تو ان کا معروف حوالہ ہے ہی۔ تاہم اس کے علاوہ آف دی کیمرہ بھی ان کے حوالے سے کوئی نہ کوئی واقعہ منظر عام پر آتا رہتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجیے۔

گزشتہ دنوں لیلیٰ غالباً" کوئی اسٹیج ڈراما کرنے ملتان گئیں۔ مگر وہاں کوئی اور ہی ڈراما ان کا منتظر تھا۔ وہ ہوٹل میں مقیم تھیں کہ پولیس وہاں پہنچی اور انہیں گرفتار کرکے اپنے مہمان خانے میں ٹھہرا دیا۔ معاملہ یہ تھا اداکارہ لیلیٰ نے پروڈیوسر شیخ نعیم سے کبھی تقریباً" ڈھائی لاکھ روپے ادھار لیے تھے۔ اب لیلیٰ نے وہ قرضہ لوٹانے کے لیے شیخ نعیم کو ایک چیک دیا تھا۔ شیخ نعیم نے وہ چیک قبول کرلیا۔ تاہم شیخ نعیم کو بعد میں پتا چلا کہ وہ چیک تو بوگس ہے۔ (چیک دیتے وقت لیلیٰ کو اندازہ نہیں ہوگا تاکہ شیخ نعیم وہ چیک کیش بھی کرالیں گے) لیلیٰ اپنی اس مہمان نوازی پر حیران تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا شیخ نعیم سے تصفیہ ہوچکا ہے۔ تاہم پولیس اپنے اس خوب صورت مہمان کی خدمت کا موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ (حالانکہ اس وقت لیلیٰ بغیر میک اپ کے تھیں) سو لیلیٰ کو سرکاری مہمان خانے ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ بعد میں جب شیخ نعیم تھانے میں پہنچے اور تحریری بیان جمع کرایا کہ ان کا لیلیٰ سے "ٹک مکا" ہوگیا ہے۔ تب کہیں جاکے لیلیٰ کو سرکاری مہمان خانے سے نجات ملی۔

(ویسے مخالف پارٹی سے "ٹک مکا" ہونے کے بعد بھی لیلیٰ کیوں گرفتار ہوئیں، اس میں اتنا حیران ہونے والی بات چنداں نہیں ہے کہ یہ تو ہمارے ہاں کی روایت ہے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی ہمیشہ آگ بجھنے کے بعد اور پولیس جائے واردات پر مجرم کے فرار ہونے کے بعد ہی پہنچتی ہے۔ تو اگر کسی ملزم کو مخالف پارٹی سے "ٹک مکا" کے بعد بھی گرفتار کرلیا تو اس میں ایسا کیا۔ ممکن ہے، وہ لیلیٰ کو تھانے کی سیر کرانا چاہتے ہوں۔ مگر یار لوگوں نے تو فسانہ ہی بنا ڈالا۔)

پُرکشش ترین

معروف اداکار فواد خان کی "داستان" کو "ہم سفر" تک رسائی کیا ملی، اس کے بعد تو ان کی شہرت کو ایسے چار چاند لگے کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھے "زندگی گلزار ہے۔" ان کی زندگی گلزار ہونے کے بعد ہی فواد خان کو پاکستان کا پُرکشش ترین مرد قرار دیا گیا ہے۔ خوب صورتی اور کشش کا ذکر ہو تو اس حوالے سے اکثر خواتین ہی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ بیشتر خواتین ایک دوسرے سے زیادہ خوب صورت نظر آنے کے سو سو جتن کرتی ہیں۔ تاہم پھر بھی اپنی تیاری سے کبھی مطمئن نہیں ہوتیں۔ یوں ان میں ایک مقابلے بازی کی فضا قائم رہتی ہے۔ مگر جناب! ایک مقامی میگزین کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے مردوں کے پُرکشش

ہونے کے حوالے سے ایک سروے کرا ڈالا۔ اس سروے میں فواد خان پاکستان کے سب سے پُرکشش مرد قرار پائے۔ کھیل کے ساتھ ساتھ اپنی پُرکشش شخصیت کے باعث شہرت پانے والے ٹینس اسٹار اعصام الحق دوسرے نمبر پر ہے۔

ماضی کے معروف کرکٹر اور حال کے سیاست دان عمران خان نے تیسرے نمبر پر قبضہ جمالیا۔ (ہائیں! سروے میں "بابیوں" سے بھی ووٹ لیے گئے تھے کیا؟ یا پھر اس مقابلے میں "پُرکشش جیب" کو بھی مد نظر رکھا گیا تھا؟) آج کے مقبول عام کرکٹر شاہد آفریدی کا نام اس فہرست میں چوتھے نمبر پر آیا ہے۔ ان کے بعد فہرست میں ایسے لوگوں کے نام شامل ہیں جنہیں یا تو ان کا حلقہ احباب ہی جانتا ہے، یا پھر شاید وہ لوگ جو یہ فہرست مرتب کررہے تھے۔

(کہتے ہیں کہ بڈھا شیر زیادہ شیر ہوتا ہے۔ اسی طرح شاید پرانا کرکٹر بھی زیادہ کرکٹر ہوتا ہے۔ شاہد آفریدی پر عمران خان کا سبقت لے جانا تو کم از کم یہی ظاہر کرتا ہے۔)

چٹورپن

علیشبا یوسف نے بہت کم عرصے میں خاصا نام بنا لیا ہے۔ اداکاری تو خوب جم کے کرتی ہی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ اپنی اسمارٹنس کی وجہ سے بھی کافی مقبول ہیں۔ اسمارٹ رہنے کے لیے اداکارائیں خاصے جتن کرتی ہیں۔ ورزش کرتی ہیں اور کھانے پینے میں بے حد احتیاط کرتی ہیں۔ تب کہیں جاکر گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔ مگر علیشبا کے بارے میں سنا گیا ہے کہ یہ پروڈیوسر سے اکثر شوٹنگ کے دوران وقت بے وقت کچھ نہ کچھ کھانے کی فرمائش کر بیٹھتی ہیں۔ اس طرح یہ پروڈیوسر کو کافی بھاری پڑجاتی ہیں۔ علیشبا یوسف ایک ڈرامے کی شوٹنگ میں مصروف تھیں۔ کام کے دوران کچھ دیر آرام کا وقفہ دیا گیا۔ علیشبا کو حسب عادت فوراً" کچھ کھانے کی طلب ہوئی۔ تاہم لنچ ٹائم میں ابھی کافی وقت تھا۔ چنانچہ علیشبا نے پروڈیوسر سے کچھ ہلکا پھلکا کھانے کی فرمائش کردی۔ تاکہ لنچ تک کچھ سہارا ہوجائے۔ پروڈیوسر نے اسپاٹ بوائے کو بلا

کرپانچ سو روپے دیے اور ہدایت کی کہ "علیشبا بی بی سے پوچھ لو۔ یہ جو کھانے کے لیے کہیں انہیں لاکر دے دو۔" اسپاٹ بوائے علیشبا کے پاس گیا تو علیشبا نے اسے ایک برگر اور جوس لانے کے لیے کہا۔

اسپاٹ بوائے نے پوچھا کہ "کون سا برگر؟"

اس پر علیشبا نے ایک چٹ پر اسے برگر اور جوس کا نام لکھ کر دے دیا اور ایک جگہ کا پتا بتا کر تاکید کی کہ "برگر یہیں سے لانا۔ ورنہ میں کسی اور جگہ کا برگر نہیں کھاؤں گی۔"

اسپاٹ بوائے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پروڈیوسر کو اس کا فون موصول ہوا۔ اس نے پوچھا کہ۔

"برگر اور جوس آٹھ سو روپے میں آرہا ہے۔ کیا کروں؟"

پروڈیوسر حیران رہ گیا کہ ایسا کون سا برگر اور جوس ہے جو اتنے پیسوں میں آرہا ہے۔

تاہم "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق اس نے اسپاٹ بوائے کو مطلوبہ برگر اور جوس لانے کی ہدایت کی۔ صرف یہ ہی نہیں۔ سنا ہے کہ جس سیٹ پر علیشبا یوسف موجود ہوں' وہاں کھانے بھی فرمائشی ہی آتے ہیں۔

(زیادہ تر سننے میں یہ ہی آتا ہے کہ بیشتر فنکارائیں بلکہ فنکار حضرات بھی اکثر ڈائٹنگ کے خبط میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے میں علیشبا کا یہ چٹورپن اس وجہ سے تو نہیں کہ وہ شادی شدہ ہیں اور سسرال میں رہتی ہیں اور ان کا سسرال کہیں ایک "روایتی سسرال" تو نہیں۔ جہاں بہو کو کھانے کے نام پر بس رل ہی دیے جاتے ہوں۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ جیل میں نواز شریف کے گھر والوں نے نواز شریف کو جو پرچے دیے ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ نواز شریف کو ورد کے لیے قرآنی آیات دی گئیں۔

مشرف کے تیور ابتدائی چند دنوں میں ہی آشکار ہو چکے تھے ان کی سرگرمیوں میں چلتے جاموں کے قصے سرگوشیوں میں آچکے تھے اور ان کی صبحیں رات کے فسانے سنانے لگی تھیں۔ ایک اہم سرکاری ادارے کے ذہین افسر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ایک کے پاس قرآنی آیات کے پرچے ہیں اور دوسرے کے پاس مینا و جام کے نخرے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

(محمد طاہر۔ ساجرا)

☆ کراچی کے وہ کھیت جاگنے لگے ہیں جن میں نئی فصل کا وہ موسم لہرائے گا' جو موسم رنگیلا تھا۔ سہانا تھا۔ آزادی کا موسم۔

کراچی کو قفس کی طرح بنانے والوں کو اپنا منطقی انجام نظر آرہا ہے۔ کسی شاعر نے کہا تھا۔

اب ٹوٹ کر گریں گی زنجیریں
اب زندانوں کی خیر نہیں

رات کے دامن سے لپٹ کر رونے والوں کو بتاؤ کہ سورج ابھرتا بھی ہے۔

(اعجاز منگی۔ آواز حق)

کراچی میں قتل عام میں ملوث بے چہرہ قاتلوں کو ہر کوئی جانتا ہے۔ حکمرانوں اور ہماری مشترکہ کوتاہیوں سے شہر اس حال کو پہنچا ہے۔ امن کے لیے سیاسی مصلحتیں چھوڑنا ہوں گی۔

(چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ مشیر عالم)

نائن الیون کے بعد امریکی مسلمان خوف و ہراس کی فضا میں دین کی جانب زیادہ مائل ہوتے دیکھے جاسکتے ہیں' لیکن ایک دوسرا ردعمل یہ بھی سامنے آیا ہے کہ یہاں امریکا میں اسلام کے پھیلاؤ میں حوصلہ افزا اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہر سال 20 ہزار غیر مسلم امریکی اسلام قبول کرلیتے ہیں جن میں زیادہ تعداد پڑھے لکھے نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن اسپگیٹھی کٹلٹس

اجزا:

چکن	ایک پاؤ
اسپگیٹھی	ایک کپ
آلو	دو عدد
انڈا	ایک عدد
ڈبل روٹی کا چورا	آدھا کپ
پسی ہوئی سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

چکن کو ہلکا سا ابال لیں اور ہڈیاں الگ کر کے گوشت کے ریشے کر لیں۔ اسپگیٹھی اور آلو بھی الگ الگ ابال لیں۔ ایک بڑے برتن میں چکن اور اسپگیٹھی میں (انڈے اور چورے کے علاوہ) تمام اجزا اچھی طرح مکس کر کے کسی بھی شکل میں کٹلٹس بنا کر فریج میں رکھ دیں۔ دس منٹ بعد انڈے میں ڈبو کر ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹ کر ڈیپ فرائی کر لیں اور کیچپ کے ساتھ افطاری میں پیش کریں۔

دہی بڑے چنا چاٹ

اجزا:

دہی	دو کپ

اُبلے کابلی چنے — ایک کپ
ماش، مونگ کی دال — آدھا آدھا کپ
آلو — دو عدد
ٹماٹر — دو عدد
پیاز — ایک عدد
ہری مرچ — تین عدد
ہرا دھنیا — تھوڑا سا
میٹھا سوڈا — آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ — ایک چائے کا چمچہ
کُٹی سُرخ مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا — آدھا چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا — حسب ذائقہ
ہینگ — ایک چٹکی
پاپڑی — چار عدد
نمک — حسب ذائقہ
تیل — حسب ضرورت

ترکیب:

مونگ اور ماش کی دال چار گھنٹے تک بھگونے کے بعد پیس لیں اور اس میں نمک، میٹھا سوڈا، کُٹی سُرخ مرچ اور آدھا چمچہ زیرہ (بھون کر پیس لیں) ملا کر رکھ دیں۔ آمیزہ پتلا نہیں ہونا چاہیے۔ فرائنگ پان میں ایک کھانے کا چمچہ تیل گرم کر کے اس میں ہینگ ڈالیں پھر ثابت دھنیا اور ثابت زیرہ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں ٹھنڈا ہو جائے تو کوٹ کر دال میں ملا لیں۔ الگ کڑاہی میں دال کے بڑے بنا کر سنہرا ہونے تک تلیں پھر نمک ملے پانی میں ڈال دیں۔ آلو ابال کر چوکور کاٹ لیں اور ابلے چنوں کے ساتھ دہی میں ڈال دیں۔ ٹماٹر، مرچ، پیاز اور ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں اور ہلکے ہاتھ سے سب کو مکس کر لیں۔ چاٹ مسالا، پاپڑی اور املی کی چٹنی کے ساتھ مزے دار دہی بڑے چنا چاٹ کھائیں۔

اسپیشل مایو پکوڑے

اجزا:

بیسن — ایک کپ
میدہ — آدھا کپ
انڈا — ایک عدد
دہی — آدھا کپ
مایونیز — دو کھانے کے چمچے
لیموں کا رس — ایک کھانے کا چمچہ
سفید مرچ پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
سُرخ پسی مرچ — ایک چائے کا چمچہ
زیرہ — آدھا چائے کا چمچہ
پیاز — ایک عدد
ہری مرچ — چار عدد
چینی — ایک چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
تیل — حسب ضرورت

ترکیب:

بیسن میں میدہ، انڈا، لمبائی میں کٹی ہوئی پیاز، سُرخ مرچ، زیرہ، ہرا دھنیا، ہری مرچ اور نمک ڈال کر گھول لیں اور تھوڑی دیر رکھنے کے بعد گرم تیل میں ہلکی آنچ پر پکوڑے تل لیں۔ الگ پیالے میں دہی میں مایونیز، نمک، چینی، سفید مرچ پاؤڈر اور لیموں کا رس اچھی طرح پھینٹ لیں۔ بڑی پلیٹ میں پکوڑے نکال کر اوپر سے دہی مایو ڈال دیں۔ تھوڑا سا چاٹ مسالا چھڑک کر افطاری میں مزے سے کھائیں۔

وونگ ٹونگ

اجزا:

سموسے کی رول پٹی — دس عدد
چکن — ایک پاؤ
شملہ مرچ — ایک عدد

پیاز چھوٹی — ایک عدد
انڈا — ایک عدد
لہسن پیسٹ — ایک کھانے کا چمچہ
پسی سُرخ مرچ — ایک چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
تیل — حسب ضرورت

ترکیب:

چکن ابال کر ریشے کر لیں۔ پیاز اور شملہ مرچ کو باریک کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں یہ تینوں چیزیں ڈالیں۔ ساتھ ہی نمک، مرچ اور لہسن پیسٹ بھی شامل کر دیں۔ رول پٹی پہ انڈا پھینٹ کر برش کی مدد سے ہلکا سا لگائیں۔ اس پہ چکن کا آمیزہ رکھ کر پوٹلی کے انداز میں سمیٹیں اور تھوڑا سا گھما دیں۔ ایک چھلنی کی تہہ میں تھوڑا سا تیل لگا کر ڈھکن بند کر کے دس منٹ تک چولہے پہ گرم کریں پھر اس پہ ساری پوٹلیاں رکھ کر بھاپ پر بیس منٹ تک پکائیں اور کیچپ کے ساتھ افطاری میں پیش کریں۔

چکن پکوڑے

اجزا:

چکن — تین پاؤ
بیسن — آدھا پاؤ
میٹھا سوڈا — دو چٹکی
سرخ مرچ — ایک چائے کا چمچہ
پیاز — ایک عدد
لہسن پیسٹ — ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا — آدھی گٹھی
ہری مرچ — چار عدد
نمک — حسب ذائقہ
تیل — حسب ضرورت

ترکیب:

پیاز، لہسن، ہری مرچ اور ہرا دھنیا کو آدھا کپ پانی میں بلینڈ کر کے پیسٹ بنا لیں۔ الگ برتن میں بیسن میں زیرہ، سُرخ مرچ، نمک اور میٹھا سوڈا ڈال کر گھول لیں۔ پھر پیاز والا آمیزہ بھی بیسن میں شامل کر لیں۔ چکن کی ہڈیاں نکال کر بس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بیسن میں ملا لیں (ریشے نہ کریں) دس منٹ بعد گرم اور گہرے تیل میں تل لیں۔

قیمہ اسپگیٹھی

اجزا:

قیمہ — ڈیڑھ پاؤ
اسپگیٹھی — ایک پیکٹ
پیاز — ایک عدد
لہسن پیسٹ — ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹو پیسٹ — چار کھانے کے چمچے
چکن یخنی — ایک کپ
سیاہ پسی مرچ — ایک چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
تیل — حسب ضرورت

ترکیب:

گرم تیل میں چوپ کی ہوئی پیاز کے ساتھ لہسن پیسٹ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں پھر قیمہ ڈال کر براؤن ہونے تک بھونیں۔ یخنی میں ٹماٹو پیسٹ، نمک، مرچ ملا کر قیمہ میں شامل کر کے پندرہ منٹ تک بھون کر آنچ ہلکی کر دیں۔ اسپگیٹھی کو نمک ملے پانی میں ابال لیں۔ پانی نتھار کر قیمہ والے آمیزے میں ڈال کر ہلکے ہاتھ سے دو تین منٹ تک مکس کریں پھر چولہا بند کر دیں۔

رمضان المبارک کی پرنور ساعتیں ہیں۔ یہ مہینہ روحانی و بدنی عبادت کے اعتبار سے فیوض و برکات کا مہینہ ہے۔ روزہ تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ ہمارے جسمانی افعال اور روحانی اعمال کی اصلاح کرتا ہے۔

طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ بھوک چھوڑ کر کھانا ہمارے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی درس دیتا ہے۔ روزہ ہمارے لیے ان فوائد کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مگر ہوتا اس کے برعکس ہی ہے۔ ہم سحر و افطار میں اپنے دستر خوان کو دنیا بھر کی نعمتوں سے سجا لیتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ایسی چیزوں کی ہوتی ہے جو ہمارے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ کھجلہ، پھینی، رول، سموسے، پکوڑے اور پراٹھے وغیرہ۔ غرض تلی ہوئی اور ثقیل چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں روزے کے دوران بھی ہمارے پیٹ کو بھاری رکھتی ہیں۔ جس سے روزے کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور ہم عام دنوں کی نسبت زیادہ موٹاپے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کر کے آپ نہ صرف یہ کہ موٹاپے سے محفوظ رہیں گی۔ بلکہ روزے کے صحیح روحانی و جسمانی فوائد بھی حاصل کر سکیں گی۔

☆ سحری میں ہلکی چپاتی کے ساتھ کم روغن کا سالن اور دہی استعمال کریں۔ موسمی پھل بھی ضرور کھائیں۔

☆ سحری میں گندم یا جو کا دلیہ اور دودھ بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس سے جسم کو سارا دن طاقت محسوس ہو گی اور بدہضمی بھی نہیں ہو گی۔

☆ کھجور یا سادہ پانی سے روزہ کھولنا چاہیے۔ کیونکہ کھجور میں وافر مقدار میں زنک اور نشاستہ پایا جاتا ہے۔ جو ہمیں فوری طور پر توانائی فراہم کرتا ہے۔ پھر نہار منہ پانی پینے کے بھی بے حد فائدے ہیں۔ یہ جسم کو اندرونی طور پر تمام کثافتوں سے پاک کرتا ہے۔

☆ افطار میں فروٹ چاٹ بنانے کے بجائے پھلوں کو کاٹ کر ایسے ہی استعمال کریں۔ اگر چاہیں تو تھوڑا سا نمک اور پسی سیاہ مرچ چھڑک دیں۔

☆ تلی ہوئی بادی اشیا کھانے سے پرہیز کریں۔ کھجور سے روزہ کھولنے کے بعد کھانا کھا لیں تو زیادہ بہتر ہے۔

☆ یہ رمضان گرمیوں میں آئے ہیں۔ چنانچہ روزے کی حالت میں سارا دن پانی نہ پینے کی وجہ سے جسم پانی کی کمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس لیے افطاری کے بعد سحری تک بے تحاشا پانی پئیں۔ دیگر مشروبات بھی استعمال کریں۔ موسم گرما کی وجہ سے ستو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ جسم کو طاقت دینے کے ساتھ ساتھ غذائی کمی سے بھی محفوظ رکھے گا اور جسم کے درجہ حرارت کو بھی کنٹرول میں رکھے گا۔

☆ پانی کی کمی پوری کرنے کے لیے پانی اور دیگر مائع اشیا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ تمام موسمی پھل بہت زیادہ استعمال کریں۔ خاص طور پر تربوز۔ کیونکہ تربوز میں قدرتی طور پر پانی کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔

☆